تلامذۂ غالِب

مالک رام

دیباچہ

کلام دو چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ خیال اور اس کا لباس یعنی وہ الفاظ جن میں اُسے ادا کیا گیا ہے۔ جب تک یہ الفاظ صرف بامعنی ہیں اور اُن کی ترتیب میں سُر تال کا لحاظ نہیں رکھا گیا، یہ نثر کہلاتے ہیں۔ لیکن اگر وہ موسیقی کے اصول پر یعنی کسی خاص وزن کے مطابق ہوں، تو ایسے کلام کو شعر کہتے ہیں۔

جب کسی نے کہا تھا کہ "الشعراء تلامیذ الرحمٰن" تو اس کا مقصود صرف اتنا تھا کہ شاعرانہ صلاحیت اور شعری ذوق انسان پیدائش سے ساتھ لاتا ہے یا یوں کہیے کہ جہاں تک نفسِ شاعری کا تعلق ہے، یہ بھی نبوت کی طرح ایک وہبی چیز ہے اور اِسے اکتساب سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ رہا اس کا خارجی لباس یعنی الفاظ، تو ظاہر ہے کہ یہ چیز علم و فن سے تعلق رکھتی ہے اور دوسرے علوم و فنون کی طرح اِسے بھی باقاعدہ حاصل کرنا پڑے گا۔

کلامِ موزوں، عروض کے بغیر ناممکن ہے۔ عروض ایک وسیع اور پیچ دار فن ہے، ایسا وسیع اور پیچ دار کہ بعض اوقات بڑے بڑے پختہ کار اور مشاق شاعروں سے بھی عروض کی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح معانی و بیان، محاورہ و روزمرّہ، فصاحت و بلاغت کے ایسے بیسیوں باریک نکتے ہیں، کہ محض کتابیں پڑھ لینے سے وہ ذہن نشین نہیں ہو سکتے۔ اِن تمام علوم میں مہارت پیدا کرنے کے لیے کسی استاد کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرنا صرف مناسب

نہیں، بلکہ اشد ضروری ہے۔

شاعری میں باقاعدہ استادی شاگردی کا سلسلہ فارسی زبان کے علاوہ اور کہیں نہیں ملتا۔ اُردو نے جہاں اور کئی چیزیں فارسی سے مستعار لیں، وہیں یہ رسم بھی لے لی۔ اس میں شک نہیں کہ اگر اسے مناسب حدود کے اندر رکھا جائے تو یہ بہت مفید ہو سکتی ہے۔ اگر اُستاد، شاگرد کے کلام پر فنی پہلو سے اصلاح دے، اُسے عروض کے نکات بتائے، زبان کی الوٹوں اور نزاکتوں سے آگاہ کرے، فصاحت کے مدارج کی تعلیم دے، دوسرے لفظوں میں اگر وہ اپنے خیالات اور رجحانات شاگرد پر نہ ٹھونسے، بلکہ صرف اُس کی ذاتی قابلیتوں کی تربیت کرے اور اس کی مخفی شاعرانہ قوتوں کے اُبھارنے میں اس کی مدد کرے، تو وہ شاگرد استاد سے استفادہ کرنے کے بعد ماہرِ فن ہو جائے گا۔ اور اگر واقعی فطرت نے اس میں صحیح شاعرانہ ذوق ودیعت کیا ہے تو اُس کی شاعری غیر معمولی طور پر کامل عیار ہو جائے گی۔

آپ دیکھیں گے کہ غالب کے شاگردوں میں بہت کم اپنے اُستاد کے رنگ میں کہنے والے ہیں۔ اس کا سبب یہی ہے کہ غالب اس نکتے کو خوب سمجھتے تھے کہ چہرے مہرے کی طرح ہر شخص اپنا خاص مزاج اور مذاق بھی قدرت کی طرف سے لے کر آتا ہے۔ ان میں سے کسی کو بھی بدلنے کی کوشش کرنا، اُسے مسخ کرنے کے مرادف ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ شاگرد کے کلام کے ظاہری دروبست اور فنی و لغوی اسقام کی اصلاح کی جائے اور اس کے طرزِ سخن کو جوں کا توں قائم رہنے دیا جائے، تاکہ اس کی انفرادیت پختہ ہو جائے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہمیں غالب کے شاگردوں میں اتنے زیادہ صاحبِ طرز شاعر ملتے ہیں۔ انور، تفتہ، ثاقب، حالی، رشکی، زکی، سالک، سخن، شاداں، شیفتہ، عارف، عرشی، مجروح، ناظم، ان میں سے ہر ایک کا رنگ الگ ہے۔ اور اپنی اپنی جگہ ہر ایک پختہ کار اور صاحبِ فن استاد ہے۔

بعض تذکرہ نویسوں نے غالب کے شاگردوں میں کچھ ایسے اصحاب کا ذکر کیا ہے، جو میرے نزدیک درست نہیں۔ اس لیے میں نے انھیں اس تذکرے میں شامل نہیں کیا۔ مثلاً نساخ نے مرزا باقر علی خاں کامل کو غالب کا شاگرد لکھا ہے، حالانکہ وہ قربان علی خاں سالک کے شاگرد تھے۔ خواجہ عبدالرؤف عشرت نے نظام رامپوری کو غالب کا شاگرد بیان کیا ہے

وہ شیخ علی بخش بیمار کے تلامذہ میں سے تھے۔ ضیغم حیدرآبادی اور حسرت موہانی نے منشی بنواری لال شعلہ کو تلامذۂ غالب میں شامل کرلیا ہے۔ وہ تفتہ اور بے جبر کے شاگرد تھے۔ ایک جدید تذکرہ (مشرقی بنگال میں اُردو) کے مصنف نے سید محمود آزاد (سید محمد آزاد نوابی دربار والے کے بڑے بھائی) کو غالب کا شاگرد لکھا ہے (ص ۷۴-۷۳) یہ بھی ٹھیک نہیں۔ قطع نظر اس سے کہ کسی تذکرہ نویس نے آج تک اس کا ذکر نہیں کیا منجملہ اور باتوں کے صرف ایک ہی بات اس کی تغلیط کے لیے کافی ہے۔ قاطع برہان کے معرکے میں آغا احمد علی احمد نے جو کتاب مؤید برہان کے نام سے لکھی تھی۔ اس کے آخر میں "برادر عزیزم سید محمود المتخلص بشیدا سلمہٗ تعالیٰ" کی منظوم تقریظ اور تاریخ موجود ہے۔ (اُن دنوں یہ شیدا تخلص کرتے تھے) بھلا یہ کیسے ممکن ہے، کہ آزاد اپنے استاد کے خلاف ایک کتاب اور اُس کے مصنف کے ساتھ اس طرح علانیہ اپنی عقیدت اور دوستی کا اظہار کرتے۔ پھر مزید ستم یہ کیا ہے، کہ غالب کے سفر کلکتہ کے دوران میں سید محمود کی اُن سے ملاقات بیان کی ہے۔ سید محمود ۱۸۴۲ء یا ۱۸۴۳ء میں پیدا ہوئے اور غالب ۱۸۲۹ء میں کلکتہ سے واپس بھی آچکے تھے۔ اسی طرح بعض اور اصحاب کو بھی غلط فہمیاں ہوئی ہیں۔

نواب کلب علی خاں خلد آشیاں نے ابتدا میں ایک فارسی نثر غالب کی خدمت میں اصلاح کے لیے بھیجی تھی۔ بدقسمتی سے اس پہلی اصلاح ہی پر ایک ناخوشگوار بحث چھڑ گئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا، کہ اس کے بعد انھوں نے کوئی اور چیز میرزا کے پاس نہیں بھیجی۔ اسی طرح دربار رام پور کے میر منشی، سیل چند نے بھی ایک خاص موقع پر چند شعر کہے اور غالباً اُن پر غالب سے اصلاح بھی لی لیکن نہ وہ شاعر تھے، نہ یہ اصلاح کا تعلق ہی کوئی چیز تھی۔ انھوں نے تفنن طبع سے چند شعر کہے اور غالب نے بھی اسی طرح اصلاح دے دی۔ اس لیے میں نے یہ دونوں نام بھی اس تذکرے میں شامل نہیں کیے۔

اب بھی میں اس تذکرے کو مکمل نہیں کہہ سکتا۔ ایسے بھی شاعر تھے کہ ان کا صرف تخلص ہی معلوم ہو سکا، نام اور کلام تک رسائی نہ ہوئی۔ مثلاً آزردہ وغیرہ۔ میں نے دانستہ سلسلہ میں ان کا ذکر نہیں کیا کیونکہ محض فہرست کو لمبا کرنا مقصود نہیں تھا۔ بعض اصحاب ایسے تھے کہ اُن کا نام اور تخلص دونوں معلوم ہو گئے۔ اگرچہ نہ مفصل حالات ملے نہ زیادہ کلام ہی

ہاتھ لگا۔ مثلاً حسام۔ درد۔ ذکی۔ رابطہ۔ سالم وغیرہ۔ انھیں البتہ میں نے سلسلہ میں درج کر لیا ہے۔ میری موجودہ مشغولیتوں کے پیشِ نظر غیر معمولی تاخیر کے بغیر اس کام کی کماحقہٗ تکمیل ناممکن تھی۔ اس لیے میں نے فی الحال اسی پر قناعت کی۔ اگر بعد میں مزید حالات مل سکے یا کلام تک دسترس ہو گئی تو طبعِ ثانی میں اضافہ کر دوں گا۔ انشاء اللہ۔

انتخابِ اشعار کا معاملہ ذاتی ذوق اور پسند پر منحصر ہے۔ اس لیے جہاں تک کیفیت کا سوال ہے، اس کے لیے "رسوائی" کے شدید اندیشے کے باوجود مجھے کسی عذر کی ضرورت نہیں۔ لیکن بسا اوقات ایسا ہوا ہے، کہ جو شعر انتخاب میں آئے ہیں، اُن کے علاوہ اور کلام میسر ہی نہیں ہوا۔ اس لیے لینے اور ترک کر دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ممکن ہے کہ بعض شعرا کے انتخاب سے متعلق یہ اعتراض کیا جائے، کہ یہ بہت طولانی ہے۔ تو اس سے غرض یہ ہے کہ ان لوگوں کے دیوان رفتہ رفتہ ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔ اگر اُن کے اچھے کلام کا معتد بہ حصہ اسی طرح ایک جگہ محفوظ کر دیا جائے تو شاید مفید ثابت ہو۔

اب مجھے ایک خوش گوار فرض ادا کرنا ہے یعنی جن اصحاب سے اس تذکرے کی تکمیل میں کسی طرح کی مدد ملی، اُن کا شکریہ۔ جناب قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹر (پٹنہ) اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی (رام پور) اور ڈاکٹر مختار الدین احمد (علی گڑھ) نے نہ صرف کتابیں مستعار دیں، بلکہ اپنے مشوروں سے بھی مستفید فرماتے رہے۔ کتابیں مہیا کرنے میں متعدد دوسرے احباب نے بھی مدد فرمائی۔ اُن میں سے ڈاکٹر سید محمد محی الدین قادری زور (حیدرآباد) اور سید جمیل الدین (بمبئی) مولانا امداد صابری (دہلی) اور جناب رحمت قطبی (دہلی) اور جناب فرخ کنولی (علی گڑھ) کے نام خاص طور قابلِ ذکر ہیں۔ علائی کا کلام اُن کی غیر مطبوعہ بیاض سے لیا گیا ہے۔ جو ہز ہائنس نواب مرزا امین الدین احمد خان بہادر ثانی (لوہارو) بالقابہم کی نوازش سے دیکھنے کو ملی۔ میں نے منشی مہیش پرشاد مرحوم کی یادداشتوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ تفتہ کے حالات کی تحقیق کے لیے سکندرآباد گیا تو وہاں کی کوچہ گردی میں جناب شیو راج بہادر مرحوم (دہلی) میرے شریکِ غالب رہے تھے۔

یہاں آپ کو نہ صرف کئی نئے شعرا کے نام اور حالات ملیں گے، بلکہ بعض ایسے شعرا کے حالات بھی مکمل اور مفصل نظر آئیں گے جن کے نام پہلے سے تذکروں میں موجود ہیں،

آپ کو اِن میں بہت سی نئی باتیں ملیں گی۔ میں نے ہر ایک ترجمے کے آخر میں اپنے ماٰخذ کا ذکر کر دیا ہے۔ مثلاً جوہر شاہجہانپوری کا تذکرہ، یہ اُن کے عزیزوں سے لے کر اعتبار الملک حکیم ضمیر حسن خاں دلؔ شاہجہانپوری نے لکھ بھیجا۔ اسی طرح آرامؔ کے حالات اور تصویر اُن کے پوتے بابو پرتھی ناتھ صاحب آگرہ سے دستیاب ہوئے اور نشاطؔ کے اُن کے پوتے جناب شیام نرائن سریر (ڈیرہ دون) سے۔ عزیؔ و ثاقبؔ کے مفصل حالات جناب سید معشوق حسین اطہر ہاپوڑی مرحوم نے مرحمت فرمائے تھے۔ اس سلسلے میں کچھ معلومات سید محمد جلیل ہاپوڑی سے بھی دستیاب ہوئیں۔ رنجؔ میرٹھی کی تصویر اور حالات اُن کے پرپوتے حکیم سیف الدین احمد سلمہٗ (میرٹھ) کا عطیہ ہیں۔ قاضی عنایت حسین رشکیؔ کے حالات اور کلام جناب قاضی غلام سجاد سنبلؔ بدایونی نے عنایت فرمائے۔ شاکرؔ کے حالات اُن کے صاحبزادے جناب ہادی مچھلی شہری (کراچی) نے ارسال فرمائے۔ بعض معلومات جناب احترام الدین احمد شاغلؔ (رجے پور) نے مہیا فرمائیں۔ بھوپال کے بعض شاگردوں سے متعلق کچھ تفاصیل اور رفعتؔ اور شوکتؔ کی تصویریں جناب محمد اظہر نادم سیتاپوری سے دستیاب ہوئیں۔

تصاویر کتاب میں جن اصحاب کی تصویریں شامل ہیں، اُن میں سے بعض کے ہم پہلے سے روشناس ہیں، لیکن اگر اُن کی بھی کوئی نئی تصویر ملی، تو اُسے ترجیح دی گئی ہے، تاکہ ایک نئی چیز منظرِ عام پر آجائے۔ بعض شعراء کی تصویریں بالکل نئی ہیں اور پہلی مرتبہ شائع ہو رہی ہیں، مثلاً تفتہؔ، ذکاؔ، رشکیؔ، رمزؔ، رفعتؔ، رنجؔ، شوکتؔ، وفاؔ وغیرہ۔ یہ سب تصویریں مجھے مندرجہ ذیل ذرائع سے دستیاب ہوئی ہیں۔

آرامؔ	جناب بابو پرتھی ناتھ صاحب، آگرہ (آرامؔ کے پوتے)
ادیبؔ	مخزن (لاہور) مئی ۱۹۰۵ء
اسمٰعیلؔ	جناب خان بہادر محمد اسلم سیفی، میرٹھ (اسمٰعیلؔ کے صاحبزادے)۔
تفتہؔ	جناب پرتھی ناتھ صاحب، آگرہ (آرامؔ کے پوتے)۔ اصل فوٹو غالباً آرامؔ کا کھینچا ہوا ہے۔
حالیؔ	جناب خواجہ غلام السیدین مدظلہٗ (بوساطت جناب حامد علی خاں (جامعی))۔
حیدرؔ	یادگارِ ضیغم

تلامذۂ غالب

ذکا	جناب عبدالرزاق شبلی صاحب، حیدرآباد (ذکا کی ہمشیرہ کے نواسے)۔
راقم	اردو (سہ ماہی) اپریل ۱۹۳۱ء
رشکی	حضرت نواب محمد اسمٰعیل خاں بالقابہ، میرٹھ (نواب محمد اسحاق خاں مرحوم کے صاحبزادے اور رشکی کے بھتیجے)۔
رفعت	سیف بھوپالی: مرزا ابوالقاسم محتشم (خلف رفعت) کے نواسے (بوساطت جناب نادم سیتاپوری)۔
رمز	عجائب گھر، لال قلعہ، دہلی (بہ شکریہ محکمۂ آثارِ قدیمہ، حکومتِ ہند)۔
رنج و طبیب	حکیم سیف الدین احمد، میرٹھ (رنج کے پرپوتے)۔
زکی	شاملِ دیوان
سخن	احوالِ غالب (بہ شکریہ انجمن ترقیِ اردو، علی گڑھ) یہ تصویر قاضی عبدالودود بیرسٹر کو سید فصیح الدین بلخی سے ملی اور انھیں سخن کے صاحبزادے خواجہ معین الدین حسین نے دی تھی۔
سیاح	شاملِ دیوان (بہ شکریہ ادارۂ ادبیاتِ اردو، حیدرآباد)۔
شوکت	جناب میاں محمد مکرم محمد خاں بھوپال (شوکت کے پوتے)، (بوساطت جناب نادم سیتاپوری)۔
صفیر	آج کل (ماہانہ) فروری ۱۹۵۶ء (بہ شکریہ پبلیکیشن ڈویژن، حکومتِ ہند)۔
طالب	تاریخِ ادبِ اردو مؤلفہ جناب ڈاکٹر رام بابو سکسینہ
ظفر	عجائب گھر، لال قلعہ۔ دہلی (بہ شکریہ محکمۂ آثارِ قدیمہ، حکومتِ ہند)۔
علائی	اردو (سہ ماہی) جنوری ۱۹۴۴ء
مجروح	تاریخِ ادبِ اردو مؤلفہ جناب ڈاکٹر رام بابو سکسینہ
محمود	یادگارِ ضیغم
مشتاق	شاملِ دیوان
نشاط	آج کل (ماہانہ) فروری ۱۹۵۵ء (بہ شکریہ پبلیکیشن ڈویژن، حکومتِ ہند)۔

نظام	کلیاتِ نظام
نیّر رخشاں	مرزا ناصرالدین احمد خاں (خسرو مرزا)، (باقر علی خاں کامل کے نواسے)۔
وفا	ذخیرۂ منشی مہیش پرشاد مرحوم (بہ شکریہ انجمن ترقیِ اُردو۔ علی گڑھ)۔

میں ان تمام حضرات کا ممنونِ احسان ہوں اور ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں، جنہوں نے کتب یا حالات یا تصاویر مہیا کرکے اس کتاب کی تکمیل میں اعانت فرمائی۔

مالک رام

نئی دہلی

۱۵ر دسمبر ۱۹۵۷ء

فہرستِ شعراء

تلامذۂ غالب

فہرست حواشی

آرام ـــــــ رائے بہادر منشی شیونرائن اکبرآبادی

خاندان کے کائستھ اور ماتھر ذات کی مانک بھنڈاری اَل کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے بزرگ اصل میں اجمیر کے رہنے والے تھے، جہاں سے ۱۷۴۸ء کے لگ بھگ ان کے پر دادا رائے اُجاگر چند نقلِ مکان کرکے آگرے آئے اور یہاں اپنی قابلیت سے بنارس کے جلا وطن راجہ چیت سنگھ کے وزیر بن گئے۔ رائے اُجاگر چند کے صاحبزادے رائے منشی دھرنے بھی آگرے میں بہت نام پیدا کیا۔ وہ بالترتیب داروغۂ پولیس، ناظرِ محکمۂ نمک کے سپرنٹنڈنٹ اور آخر میں کوتوالِ شہر رہے۔ سرکاری ملازمت سے فارغ ہوکر وہ غالب کے نانا میرزا غلام حسین خاں کمیدان کی جایداد کے منصرم بن گئے۔ اُنھوں نے خود بھی خاصی بڑی جایداد پیدا کرلی تھی، جس سے وہ امیرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ آرام کے والد منشی نند لال بھی پہلے آگرہ منصفی میں ناظر رہے، اور پھر راجہ جوتی پرشاد کی سرکار میں مختارِ عام مقرر ہوئے۔ اُن کی وفات پر تفتہ نے مرثیہ لکھا تھا جو اُن کے دیوان میں موجود ہے۔

منشی شیونرائن آگرے ہی میں ۱۰ ستمبر ۱۸۳۲ء کو پیدا ہوئے۔ بہت صغر سنی میں والدہ کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد ان کی پرورش اور تربیت زیادہ طور پر منشی کنہیا لال کے ہاتھوں ہوئی جو اُن کے دادا کے چھوٹے بھائی تھے[1]۔ آرام کی تعلیم بہت اچھے پیمانے پر ہوئی۔ وہ ابتدائی مدارج طے کرکے ۱۸۴۷ء میں آگرہ کالج میں داخل ہوگئے۔ یہاں اُنھوں نے انگریزی اور

---

[1] انہیں سے متعلق حالی نے یہ واقعہ "یادگارِ غالب" میں لکھا ہے۔

"منشی بہاری لال مشتاق کا بیان ہے کہ لالہ کنہیا لال ایک صاحب آگرے کے رہنے والے، جو میرزا صاحب کے

فارسی کی تکمیل کی۔ انگریزی میں وہ مشہور انگریز اُردو لغت نویس ایس۔ ڈبلیو فیلن صاحب کے شاگرد تھے۔ کالج سے تعلیم ختم کرنے کے بعد ۱۸۵۶ء میں وہ اسی جگہ ۳۵ روپے ماہانہ تنخواہ پر انگریزی کے مدرس مقرر ہوگئے۔ ۱۸۵۷ء کے مشہور ہنگامے میں اُنھوں نے کوئی حصہ نہیں لیا اور جہاں تک بن سکا حکام کی مدد کرتے رہے جس کے صلے میں انھیں بعد میں دو مہینے کی تنخواہ بطور انعام دی گئی۔

۱۸۵۸ء میں وہ کالج کی نوکری ترک کرکے آبکاری کے محکمے میں ملازم ہوگئے۔ یہاں سے دل اکھڑا تو محکمۂ انکم ٹیکس میں پہنچے اور اس کے بعد منصفی میں۔ دو ایک سال میں وہ سو روپیہ ماہوار پر محکمۂ چنگی کے سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوئے۔ یہاں انھوں نے بہت قابلِ تعریف کام کیا جس سے اس محکمہ کی آمدنی میں بہت اضافہ ہوا اسی تجربہ کا نتیجہ تھا کہ بعد میں دھول پور اور فرخ آباد کی ریاستوں نے بھی انہیں اپنے ہاں اس محکمے کی تنظیم کے لیے طلب کیا۔

لیکن اُن کے اصلی جوہر آگرہ میونسپلٹی کی سکتری کے زمانے میں کھلے۔ یہاں اُنھوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں کو استعمال کیا اور کمیٹی کا سارا انتظام ایسی مضبوط بنیادوں پر رکھ دیا کہ اس سے کمیٹی کی آمدنی میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہونے لگی۔ اسی زمانے میں اُنھوں نے رفاہِ عام کے کاموں میں بھی ایسا بڑھ چڑھ کے حصہ لیا کہ شہر کے باشندے دل و جان سے اُن کے شیدائی ہوگئے۔ ۶۹—۱۸۶۸ء اور ۱۸۷۸ء کے قحط کے زمانوں میں اُنھوں نے مختلف امدادی کام شروع کرکے لوگوں کے لیے روزی کا سامان مہیا کیا۔ اور اس طرح ہزاروں آدمیوں کو موت کے منہ سے بچا لیا۔ سکتری کے زمانے کی نمایاں خدمات کا اعتراف حکومتِ وقت کی طرف سے بھی ہوا۔ اوّل ۱۸۷۷ء کے دہلی دربار میں انہیں خلعت اور سند

ہم عمر تھے' ایک بار دلّی آئے اور جب میرزا صاحب سے ملے تو اثنائے کلام میں ان کو یاد دلایا کہ جو مثنوی آپ نے پتنگ بازی کے زمانے میں لکھی تھی' وہ بھی آپ کو یاد ہے؟ انھوں نے انکار کیا۔ لالہ صاحب نے کہا' وہ اُردو مثنوی میرے پاس موجود ہے چنانچہ انھوں نے وہ مثنوی میرزا کو لا کر دی اور وہ اُس کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اس کے آخر میں یہ فارسی شعر کسی استاد کا پتنگ کی زبان سے لاحق کر دیا تھا ؎

رشتہ در گردنم افگندہ دوست | می کشد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست

لالہ صاحب کا بیان تھا کہ میرزا صاحب کی عمر جب کہ یہ مثنوی لکھی تھی' آٹھ نو برس کی تھی۔" (یادگار غالب ص ۹۷)

خوشنودی عطا ہوئی اور اس کے بعد ۱۸۸۷ء میں جب ملکہ وکٹوریہ کی پچاس سالہ جوبلی منائی گئی تو انہیں رائے بہادر کے خطاب اور دربار میں کرسی نشینی کے اعزاز سے نوازا گیا۔

رائے بہادر منشی شیونرائن کی ہردل عزیزی کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ وہ شہر بھر میں منشی جی کے نام سے مشہور تھے۔ کمہار اُن کے مٹی کے کھلونے بنا کے بیچتے تھے۔ اور یہ منشی جی کے نام سے بکتے تھے۔

منشی شیونرائن کی علمی سرگرمیاں بھی کچھ کم قابلِ ذکر نہیں۔ ۱۸۵۸ء میں جب وہ ابھی مشکل سے ملازمت میں داخل ہی ہوئے تھے، انہوں نے اپنے خرچ پر مفید عام اسکول جاری کیا۔ وہ نہ صرف اس کی مالی امداد ہی کرتے، بلکہ خود یہاں پڑھاتے بھی تھے۔ ان کی نیک نیتی اور خلوص کی برکت کہ یہ مدرسہ آج تک جاری ہے اور اب اس میں ترقی ہو کر دسویں درجے تک تعلیم کا انتظام ہے۔ انہیں فنونِ لطیفہ کے مختلف شعبوں سے بھی بہت دلچسپی تھی۔ فوٹوگرافی میں کامل دستگاہ تھی اور اس سلسلے میں انھوں نے کئی نمائشوں میں انعام حاصل کیے۔ وہ اچھے نقشہ نویس بھی تھے۔ ہیئت اور نجوم میں بھی خاصا دخل تھا اور زائچہ بنانے کی خاص مہارت تھی۔ ان کی علمی سرگرمیوں کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ انھوں نے ایک مطبع مفید الخلائق کے نام سے قائم کیا۔ غالب کی دو کتابیں دستنبو فارسی (۱۸۵۸ء) اور دیوانِ اردو (۱۸۶۳ء) بھی اس مطبع سے شائع ہوئیں۔ دو پرچے بھی اسی مطبع سے شائع ہوتے تھے۔ ایک پندرہ روزہ گلدستہ معیار الشعرا اور دوسرا ماہانہ مفید الخلائق۔ ان دونوں کی ادارت کے فرائض بھی آرام ہی کے ذمے تھے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں مفید الخلائق کے ساتھ ہندی زبان کا ضمیمہ سروپ کارک کے عنوان سے چھپتا رہا۔ گلدستہ کے لیے کبھی کبھی غالب بھی اپنا کلام بھیجتے رہتے تھے۔ اسی مطبع سے ۱۸۵۸ء میں ایک ماہوار پرچہ رسالہ بغاوتِ ہند کے عنوان سے شائع ہوتا رہا۔ اس کے ایڈیٹر آرام کے دوست ڈاکٹر مکند لال تھے۔ اس میں ۱۸۵۷ء کی تحریک کے حالات قسط وار چھپتے رہے۔

آرام کا کلام زیادہ دستیاب نہیں ہوا۔ ایک غزل کے علاوہ جو حُسنِ اتفاق سے محفوظ رہ گئی، متفرق شعر ملتے ہیں۔ یا تو زیادہ کہتے نہیں تھے یا پھر اُسے مرتب کرنے کی طرف توجہ نہیں کی۔ جو کچھ کہا ضائع ہو گیا۔ انھوں نے ایک انگریزی کتاب (FOUR MESSENGERS) کا قاصدانِ شاہی کے عنوان سے مسٹر کین کی مدد سے (۱۸۵۹ء میں) چھاپا تھا۔ اس کی زبان

کی اصلاح غالب نے کی تھی۔ اسی زمانے میں اس کا ہندی ترجمہ بھی "راج دوتوں کی کتھا" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اُردو کتاب کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ خود میرے پاس اس کے پانچویں ایڈیشن (۱۸۹۲ء) کا نسخہ ہے۔ آرام ۱۸۹۸ء میں کمیٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے، دو سو ماہانہ پنشن مقرر ہوئی، لیکن اس کے بعد وہ زیادہ جیے نہیں۔ ۱۸۹۶ء سے اُنھیں گُردے میں پتھری کی شکایت تھی، یہی مرض جان لیوا ثابت ہوا۔ اور وہ یکشنبہ ۴۔ ستمبر ۱۸۹۸ء کو دن کے ساڑھے گیارہ بجے اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ اپنے پیچھے جسمانی یادگار سات لڑکیاں اور دو لڑکے (بابو گھونا تو پرشاد اور بابو رام چند) چھوڑے۔ دونوں سرکاری ملازمت میں ڈپٹی کلکٹری کے عہدوں تک پہنچے۔ اُن کی اولاد آگرے میں موجود ہے۔

کلام میں کوئی خاص بات نہیں۔ تصوف کی طرف میلان پایا جاتا ہے۔

اُسی کو زندگی کا لطف ہے اس دہرِ فانی میں ۔۔۔ کہ جو نزدیک اچھوں کے بھلا اور باخدا ٹھیرے

قیام اپنا ہو اس محنت سرائے دہر میں کیونکر ۔۔۔ جہاں آفت ہی آفت ہو وہاں آرام کیا ٹھیرے

آرامِ دل کا چین گیا، اب سکون گیا ۔۔۔ ہم تو بلا میں پھنس گئے، جب سے جنون گیا

اندازِ جلوہ سازیِ سینا ندیدہ ام ۔۔۔ عشق کردہ ام، فروغِ تجلی ندیدہ ام

سوگوارِ دلِ مرحوم منم، اے آرام! ۔۔۔ باعثِ گریہ چہ گویم، بہ چرا می نالم

کے از قتلِ مینا نہ پُرسد ۔۔۔ چرا تو گریۂ مستانہ کردی

[شعر و سخن، ص ۱۵؛ ماتھر پتر کا (انگریزی) دسمبر ۱۹۲۵ء و جنوری و فروری ۱۹۲۶ء؛ خطباتِ گارساں دتاسی، ص ۲۷۶، ۳۰۶، ۷۹۴؛ خم خانۂ جاوید (۱)، ص ۱۷۔]

آزر ـــــ نواب ذوالفقار علی خاں دہلوی

ان کے والد نواب حیات علی خاں اور دادا معتمد الدولہ نواب احمد علی خاں خلف نواب یعقوب علی خاں تھے۔ آخر الذکر کے بھائی (شاہ ولی خاں) احمد شاہ ابدالی کے وزیر اور

خود دہلی کے قلعہ دار تھے۔

شکوہ کرنے کی کیا مجال ہمیں — شکر پرداں زبان کٹتی ہے

خدنگِ غمزہ نے گویا خطا کی — ہوئے ناخوش، تپاں دیکھا جو مجھ کو

جو میں نہ ہوں، تو نہ ہو، گردشِ آسماں کے لیے — مرے ستانے نے کام اس سے اک جہان کے لیے

[تذکرۂ اہلِ دہلی، ص ۱۳۰؛ سخن شعرا، ص ۱۹؛ خم خانۂ جاوید (۱)

ص ۵۲)۔

آگاہ ——— نواب سید محمد رضا دہلوی ملقب بہ احمد مرزا خاں۔

والد کا نام امیر مرزا تھا، دادا نواب معظم الدولہ محمد علی خاں تھے اور جدِّ اعلیٰ نواب روشن الدولہ سید مظفر، جو محمد شاہ کے عہد میں بخشی تھے۔ آگاہ ۱۸۳۹ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے تک بہادر شاہ کے چھوٹے بیٹے خضر سلطان کے مصاحب رہے۔ جب اس کے بعد خاندانی جایداد ضبط ہو گئی تو جے پور چلے گئے۔ مہاراجہ سوائی رام سنگھ بہادر نے کچھ وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ اپنے معاصرین ظہیر، انور وغیرہ سے بہت اچھے تعلقات تھے۔ بلکہ ظہیر کے برادرِ نسبتی بھی تھے۔ "غالباً مئی ۱۹۱۷ء میں ۸۰ سال عمر میں جے پور میں انتقال کیا۔" (قاموس المشاہیر، ۱۹۱۱ء) گھاٹ دروازے کے باہر کے قبرستان میں دفن ہوئے تھے۔ اب قبر کا نشان نہیں ملتا۔ چند شعر دیکھیے۔

غیر کے بدلے بھی کل مرنے پر میں تیار تھا — ہجر کے ہاتھوں، کچھ ایسا زیست سے بیزار تھا

لایا تو اسے جذبِ محبت کا یہیں تھا — گھر غیر کا ہو راہ میں، یہ بھی مری قسمت

غیر تو انجمنِ ناز سے ٹلتا ہی نہیں — یہ بھی کیا دم ہے ہمارا کہ نکلتا ہی نہیں

ایک ہم ہیں کہ گھلے جاتے ہیں یوں شمع صفت — اور اک دل ہے تمہارا کہ پگھلتا ہی نہیں

بے حجابانہ وہ کیوں کر دل میں پیکاں ہو گئیں — جو نگاہیں اٹھ نہ سکتی تھیں، خدایا! شرم سے

موت کی دشواریاں دم بھر میں آساں ہو گئیں — شکر ہو کس سے ادا، قاتل کی تیغِ تیز کا

تم ہمیں دل سے بھلا دو لاکھ بار — ہم نہ بھولیں گے تمہاری یاد کو

اب کہاں آگاہ! غالب سا شفیق — روئیے دل کھول کر استاد کو

یہ بھی اک رنگ ہے محبت کا — روتے ہیں ہم، اور ہنسا کرے کوئی

قہر میں لطف کے آثار، خدا خیر کرے! — مہرباں وصل میں ہے یار، خدا خیر کرے!

[خم خانہ جاوید (۱) ص ۱۰۹-۱۱۰؛ گلستانِ سخن، ص ۱۲۷؛
بزم سخن، ص ۸-۹؛ یادگار ضیغم، ص ۸۵؛ قاموس المشاہیر (۱)
ص ۱۱؛ تذکرہ شعرائے جے پور، ص ۵۵-۵۸۔]

احسانؔ ــــــ حاجی احسان علی خاں ڈیرہ دونی

حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے تھے۔ تجارت ذریعہ معاش تھی۔

توجہ وہ جو بھولے سے ہمارے حال پر کرتے — تو ممکن تھا تسلّی میں ہم اپنے دن بسر کرتے

جتنا ہو سکا احباب سے، افسوس، اے احسانؔ! — کبھی جا کر ہمارے حال کی اُن کو خبر کرتے

[یادگار ضیغم، ص ۱۴؛ خم خانہ جاوید (۱) ص ۱۶۰]

احسنؔ ــــــ مفتی محمد سلطان حسن خان

حکومت انگریزی میں صدر الصدور تھے۔ ان ہی کا ذکر غالب کے اس خط میں ہے، جو انہوں نے منشی "غلام بسم اللہ" صاحب بریلوی کے نام لکھا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"آپ کے منصف صاحب کی بھی غزل میں اصلاح کم ہوئی ہے۔" (عود ہندی صفحہ ۱۹۶)

منصف صاحب سے یہاں یہی احسنؔ مراد ہیں۔ غلام بسم اللہ بسملؔ نے ان سے عربی پڑھی تھی۔ بسملؔ کے حالات احسنؔ کے صاحبزادے جناب حکیم عماد الحسن نے نواب صدر یار جنگ مرحوم کی فرمائش پر لکھے تھے۔ کلام میسر نہ آیا۔

[خط منشی مہیش پرشاد مرحوم بنام مولف۔]

احسن ــــــــ حکیم مظہر احسن خاں رام پوری

حکیم محمد مجتبےٰ خاں کے بیٹے اور حکیم محمود خاں کے پوتے تھے۔ رام پور میں ۱۸۴۷ء (۱۲۶۴ھ) میں پیدا ہوئے۔ اگرچہ خاندانی پیشہ طبابت تھا، لیکن اس کے ساتھ تجارت کو بھی کسبِ معاش کا وسیلہ بنایا۔ لکڑی کا کاروبار کرتے تھے۔ ماہر خوش نویس بھی تھے۔ عہدِ کلب علی خانی کا رام پور مختلف علوم و فنون کے ماہرین کا ملجا و ماوا تھا۔ انھوں نے رام پور کے تمام اساتذہ سے استفادہ کیا اور ہفت قلم کہلائے۔ اس کے علاوہ فارسی اور عربی مولوی عبدالمجید خاں اور سید علی حسین اور مولوی نورالنبی سے پڑھی۔ عروض کی تعلیم مولوی جمال شاہ اور منشی مظفر علی اسیر سے حاصل کی۔ غالب کی وفات کے بعد اسیر سے اصلاح بھی لیتے رہے۔ ایک مختصر قرابادین بھی اُن سے یادگار ہے۔ عروضِ سیفی کا اُردو ترجمہ بھی کیا تھا۔ صاحبِ دیوان تھے۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں کہتے تھے۔

آخر زمانۂ حیات میں پیلی بھیت میں قیام اختیار کر لیا اور وہاں کچھ تجارت اور زمینداری بھی کر لی تھی۔ ۱۳۰۲ھ میں یہاں سے ایک ہفتہ وار اخبار "خورشید آفاق" کالا۔ اسے اپنے ذاتی "مطبع مظہری" میں چھاپتے تھے۔ پیلی بھیت میں ان کے شاگردوں کی خاصی تعداد تھی۔ ۱۸ اپریل ۱۸۹۱ء کو ۴۴ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ اور پیلی بھیت ہی میں دفن ہوئے۔

یارب! ہوئی ہے عمر اسی شغل میں بسر   کوثر پہ اہتمام ہو مجھ بادہ خوار کا

اُبھر بانیوں پہ تو مرتا ہے اک جہاں   کہیے کہ کیا غضب ہو اگر مہرباں ہوں آپ!

بات کرنے میں تو شرماتے ہو تم!   ظلم کرنے میں نہیں آتا لحاظ؟

ہل ہیں غیر کو رہتے ہیں وفا پر ناخوش!   ایک ہم ہیں کہ جفا پر بھی تری شاد رہے

آنکھیں اُٹھاکے دیکھ لو للٰہ اک نظر   بندہ بھی چشمِ لطف کا اُمیدوار ہے

ہر دم ہے جاں کنی ترے عاشق کے واسطے   کہتے ہیں جس کو مرگ، غمِ انتظار ہے

روئے تو منم داز فرطِ نزاکت ترسم   کہ نظر نیز نہ گردد بتو بارِ عارض

(تذکرہ کاملانِ رامپور، ص ۳۹۳-۳۹۴؛ بزم خانۂ جاوید (۱)، ۱۷۲-۱۷۳؛ انتخاب یادگار (۲)، ص ۷-۸؛ یادگارِ ضیغم، ص ۵۳-۵۴)

اخگر ــــــــــ حکیم فتح یاب خاں رامپوری

قوم کے پٹھان تھے۔ شاعری گویا ورثے میں پائی۔ اِن کے دادا محمد خاں عَلَم (متوفی ۱۲۶۸ھ) تھے؛ اور والد ظفر یاب خان جو مظفر خاں کے نام سے مشہور ہوئے۔ اُن کا زیادہ زمانہ نواب عبداللہ خاں بہادر (نواب محمد سعید خاں والیِ رامپور کے بھائی اور نواب ناظم فردوس مکان کے چچا) کی رفاقت میں بحیثیتِ ناظر دہلی اور میرٹھ میں بسر ہوا۔ یہ بھی شاعر تھے۔ گرمؔ تخلص تھا اور بقول امیر مینائی طبیعت بھی گرم پائی تھی۔ عربی فارسی کے فاضل اور صاحبِ دیوان تھے، جس میں ۳۰ - ۴۰ ہزار شعر سے کم نہیں ہوں گے۔ گرمؔ ذوقؔ سے اصلاح لیتے تھے۔ ۶۰ برس کی عمر میں ۱۰ - جمادی الثانی ۱۲۸۵ھ (۲۸ - ستمبر ۱۸۶۸ء) کو جے پور میں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئے۔

اخگرؔ ۱۸۴۳ء میں پیدا ہوئے۔ رسمی تعلیم مختلف استادوں سے ہندستان کے طول و عرض میں پھر کر حاصل کی۔ بڑے سیلانی آدمی تھے۔ طبابت میں بھی دسترس تھی، اور اس فن میں خاص [illegible] حاصل تھا۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے سابق پروفیسر خان بہادر مولوی فدا علی خاں ایم۔ اے انھیں اخگرؔ کے بیٹے تھے۔ یہ بھی شاعر تھے، پہلے گرمؔ اور اخگرؔ کی مناسبت سے شعلہؔ تخلص کرتے تھے، پھر اُسے بدل کر فداؔ کر لیا تھا۔ بنکم چندر چٹرجی کا ایک مشہور ناول بشابرکھا ہے۔ فداؔ نے اس کا ترجمہ بِس کا رُکھ کے نام سے کیا تھا۔ یہ چھپا ہوا موجود ہے۔

اخگرؔ کا انتقال ۱۹۱۴ء یا ۱۹۱۵ء میں چنسرہ (ہگلی) میں ہوا، اور وہیں سپردِ خاک ہوئے۔ کلام کا نمونہ حسبِ ذیل ہے :-

قابو نہ تھا جو دل پہ، تو اخگرؔ! بتایئے ــــ جانا ہی اس کے پاس تمھیں کیا ضرور تھا

دلِ ناکام کو پھر اُن نگاہوں کی تمنا ہے ــــ جگر میں ڈوب جانا، پھر وہ یاد آنا ہر نشتر کا

قاتل تھا تُو تو، گرچہ نہ تھا بندہ کُشتنی ــــ ظالم کیا نہ پاس، کچھ اپنے بھی نام کا

نہ آئے تم، تو نہ گھر سے مرے سدھاری رات ــــ مری طرح ہے، مگر منتظر تمھاری رات

سیاہی دونوں میں ٹھہری موافقت کا سبب ــــ ہمارے بخت کی دم ساز ہے ہماری رات

حشر کہنے سے کھٹکتا ہوں، خدا خیر کرے ــــ ہے قیامت، نہ ہوا واں بھی جو پُرساں کوئی

دُو رنگی حسن کی اور عشق کی نیرنگی، واہ! دیکھے آئینہ کوئی، اور ہو حیراں کوئی
عمر گو صحبتِ انساں ہی میں گذری اپنی پر تماشا ہے، کہ دیکھا نہیں انساں کوئی
جاؤ کوے غیر میں، اے نالہ ہاے نارسا! اپنے ہی سر پر تھے تم، محشر اُٹھانے کے لیے

[انتخاب یادگار (۲) ص ۱۲؛ تذکرہ کاملانِ رامپور، ص ۳۲۴؛
معارف (۱۷)، ص ۲۸۳-۲۹۹؛ ایضاً (۲۲)، ص ۳۰۸-۳۱۳؛
مشرقی بنگال میں اُردو، ص ۱۳۹]

اخگر ــــــ مولوی فرزند علی عظیم آبادی

مرزا پور میں وکیل عدالت تھے۔

خود نما تھا سب حسینانِ زمن میں آئینہ ہے مگر حیران تری انجمن میں آئینہ

[مرقع ادب (۲)، ص ۲۰-۲۲؛ بزمِ شعرا، ص ۱۹]

ادیب ــــــ مولوی محمد سیف الحق دہلوی

آپ کے والد مولوی احسان الحق، مفتی محمد اکرام الدین خان بہادر صدر امین دہلی کے بیٹے تھے۔ سلسلۂ نسب ان کا شیخ عبد الحق محدث دہلوی تک پہنچتا ہے۔

شیخ محدث دہلوی کا نام نامی تعارف کا محتاج نہیں۔ ہندستان میں علم حدیث کو رواج دینے کا سہرا آپ کے سر ہے۔ اُن کے جدِ اعلیٰ آقا محمد سب سے پہلے بخارا سے واردِ ہندستان ہوئے۔ یہ علاء الدین خلجی (۱۲۹۶-۱۳۱۶ء) کا زمانہ تھا۔ مولوی احسان الحق صاحب ان آقا محمد کی نویں پشت میں تھے۔ اُن کے چار صاحبزادے ہوئے۔

خان بہادر مولوی محمد انوار الحق (۱۳۲۰ھ) یہ مدتوں راجپوتانہ ریذیڈنسی میں میر منشی رہے۔ اُن سے چھوٹے مولوی محمد وحید الحق تھے۔ مولوی محمد سیف الحق ادیب تیسرے تھے۔ سب سے چھوٹے خان بہادر مولوی محمد اشرف الحق تھے جو حیدر آباد دکن میں مہتمم بندوبست رہے اور وہیں اُن کا انتقال ہوا۔ اُن کی اولاد اب بھی وہاں موجود ہے۔

مولوی سیف الحق ادیب ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے۔ دہلی کے علما کی خدمت میں رہ کر علومِ متعارفہ حاصل کیے۔ نہایت ذہین اور ذکی الفہم تھے بہت جلد طاق ہو گئے۔ جولانیِ طبع نے شاعری کی طرف مائل کیا اور اصلاح کے لیے غالب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ کلام کی اُپج دیکھ کر میرزا نے فرمایا "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" میرزا غالب کے بعد چندے میرزا یوسف علی خاں عزیز سے بھی مشورہ کیا۔

شروع میں عدالتِ منصفی دہلی میں بہ عہدۂ نائب ناظر ملازم ہوئے۔ لیکن طبیعت نہ جمی۔ نوکری چھوڑ، ایک اخبار "میو گزٹ" چھاپنے لگے۔ جب یہ اخبار بند ہو گیا تو مختلف پرچوں اور رسالوں میں مضمون لکھتے رہے۔ اسی زمانے میں انجمنِ قصور (ضلع لاہور) میں سکتری کا عہدہ قبول کر لیا اور انجمن کے رسالے کی ادارت کا کام بھی کرتے رہے لیکن جلد ہی یہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے سررشتۂ تعلیم میں ملازم ہو کر لاہور آ گئے اور اس کے بعد یہاں کے اخبار "کوہ نور" کی ایڈیٹری کے فرائض انجام دیتے رہے۔ چند دن کے لیے "رفیق ہند" کے جواب میں ایک ماہوار رسالہ "شفیق ہند" بھی نکالا جس کے ساتھ دو ضمیمے "نسیم صبح" اور "شام وصال" بھی چھپتے تھے۔ جب یہاں سے طبیعت بالکل اچاٹ ہو گئی تو حیدر آباد دکن پہنچے اور ساڑھے چار سو روپیہ ماہانہ پر پریس ریورٹر مقرر ہو گئے۔ داغ جب پہلی مرتبہ ۱۸۸۸ء میں حیدر آباد گئے ہیں، تو انھیں کے ہاں ٹھیرے تھے۔ یہ مکان افضل گنج میں پرانی محبوب گنج کی کمان کے برابر میں تھا۔ اس کا ذکر بھی انھوں نے ایک مقطع میں کیا ہے ؎

اڑاتے ہیں مزے دنیا کے ہم اے داغ گھر بیٹھے
دکن میں اب تو افضل گنج اپنی عیش منزل ہے

صرف ۴۵ برس کی عمر تھی جب کثرتِ شراب نوشی کی علت میں ۸ ستمبر ۱۸۹۱ء (۳ صفر ۱۳۰۹ھ) کو دہلی میں انتقال کیا۔ قطب میں اپنے جدِ اعلیٰ محدث دہلوی کے مزار کے قریب

دفن ہوئے۔[1] ادیب کا نکاح سید امیر علی کی صاحبزادی حمیدی بیگم سے ہوا تھا۔ اس بیوی سے انہوں نے چار جسمانی یادگاریں باقی چھوڑیں۔ تین لڑکے محمد اکرام الحق، محمد اسلام الحق اور (خان بہادر) محمد انعام الحق اور ایک لڑکی فہمیدی بیگم۔ محمد اکرام الحق کا تخلص عجیب تھا، بہ ظفر کیا۔ ظفر حق ان کا تاریخی نام تھا، یعنی ان کی پیدائش (۱۹- رجب ۱۲۸۸ھ (۵- اکتوبر ۱۸۷۱ء) کو ہوئی۔ یہ مدتوں ریاست حیدر آباد دکن میں محکمہ کروڑ گیری میں ملازم رہے۔ ان کے صاحبزادے اظہر حق صاحب آج کل حیدر آباد ہی میں موجود ہیں۔ محمد اسلام الحق بھی شعر کہتے تھے۔ سلیم تخلص تھا۔

ادیب نہایت اچھے خوش نویس تھے۔ فنِ تاریخ گوئی میں بہت اچھی مہارت تھی۔ تحقیقِ لفظی کا بہت خیال رہتا تھا۔ اور اس موضوع پر بلند پایہ مضمون ان کے قلم سے نکلے۔ مزاج میں ظرافت تھی، اس لیے مجلس میں خوب چہکتے تھے۔ تقریر بھی بہت اچھی کرتے تھے اور جلسوں میں ان کی مانگ رہتی تھی۔ ان کے ترقی پسند رجحان کا ثبوت اس سے ملتا ہے، کہ جب آزاد اور حالی انجمنِ پنجاب لاہور میں نئی شاعری کی بنیاد ڈال رہے تھے، تو ادیب کی کوشش سے دہلی سوسائٹی کی سرپرستی میں بھی مناظمے ہونے لگے۔ جن میں مصرع طرح کی جگہ کسی خاص موضوع پر نظمیں پڑھی جاتی تھیں۔

ادیب کا کلام دہلی کے روزمرہ اور محاورہ کی جان ہے، معاملہ بندی اور بے ساختگی ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ افسوس وارستہ مزاجی اور لا اُبالی طبیعت نے انھیں اپنا کلام مرتب کرنے کی فرصت نہ دی، ورنہ کام کی چیز ہوتا۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

یوں ہوا حال ستم سے، ترے سودائی کا — آپ ہی شوق ہے گویا تجھے رسوائی کا

موت آ گئی مجھے، سرِ شام فراق میں — دشمن نے آج کام کیا، دوست دار کا

ہو جان پر جو ایک مصیبت، تو رو دیئے — دل بھی ملا یہاں، تو ترے اختیار کا

راہِ وفا پہ گر نہیں آتے ہیں وہ، نہ آئیں — دل ہی کہیں ہو کاش، مرے اختیار کا

---

[1] مولوی محمد عبدالجبار خاں صوفی ملکاپوری نے تذکرہ شعرائے دکن (ص ۴۰۲) میں لکھا ہے کہ "حیدر آباد دکن میں مسافرِ عدم ہوئے"۔ یہ ٹھیک نہیں۔ انتقال دہلی میں ہوا تھا۔ اور وہیں دفن ہوئے۔

کر چشم و دل کی خیر، خدا سے طلب، ادیب!
لپکا بُرا پڑا ہے تجھے، انتظار کا

جس کو مارا، وہ اُف نہیں کرتا
ہاتھ ہلکا ہے، میرے قاتل کا

آئے تھے جب، تو لائے تھے کیا ساتھ واں سے ہم
حرمان و یاس لے کے چلے ہیں، یہاں سے ہم

کب تک عتاب، ایک کرم کی نگاہ بھی
تنگ آ گئے ہیں اب ستمِ آسماں سے ہم

خالی خیالِ یار سے دل، ایک دم نہیں
رہتے ہیں اپنے گھر میں بھی، اک میہماں سے ہم

سب کچھ، ادیب! عشق نے جی سے بھلا دیا
جانا کہاں ہے اور تھے آئے کہاں سے ہم

ہے مری طرح سے الطاف کی اُس پر بھی نظر
حال پر غیر کے آتا ہے ترحم مجھ کو

غیر تک پوچھتے ہیں، "ہو گئی حالت کیسی"
ڈال دی آپ نے، ہم پر یہ مصیبت کیسی

کہہ دیا اس نے، کہ "اب یہ بھی نہ دیکھو گے کبھی"
جب کہا میں نے، کہ "منھ دیکھے کی اُلفت کیسی"

ایک تو ذکرِ عدو، اس پہ بگڑنا، کہ "سنو
ٹوٹتی ہے یہ قیامت پہ قیامت کیسی"

غیر سے چار گھڑی کو بھی جدا ہو، تو کہوں
کہ گزرتی ہے کسی کی شبِ فرقت کیسی

آج دو ٹوک کیے لیتے ہیں اُن سے ناچار
بن گئی اپنے ہی دم پر، تو مروّت کیسی

مبارک ہو، ملتے ہو گر دشمنوں سے
تمہاری یہی نیک نامی کریں گے

گویا مرا قصور تھا، ایسا خجل ہوا
جب شکوۂ جفا یہ وہ بولے "خطا ہوئی"

اب کیا عوض میں بوسے کے، لو گے کسی کی جان؟
بندہ نواز! کہہ تو چکا میں "خطا ہوئی"

خط دے کے میرا اُن کو، اُلجھیو نہ، نامہ بر!
ایسا نہ ہو، کہ میری بلا تیرے سر پڑے

لے جاؤ میرے سینے سے ناوک نکال کے
پر دل نکل نہ آئے کہیں، دیکھ بھال کے

[مرآۃ حقایق، ص ۱۴۹-۱۵۰؛ خم خانۂ جاوید (۱) ص ۲۵۲-
۲۵۷؛ تذکرہ محبوب الزمن، ص ۲۳۹-۲۴۱؛
قاموس المشاہیر (۱)، ص ۷۳-]

آسمٰعیل ــــــــ مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی

۱۲ر نومبر ۱۸۴۴ء کو میرٹھ میں اپنے خاندانی مکان واقع محلہ مشائخان میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام شیخ پیر بخش تھا، جن کا سلسلۂ نسب حضرت محمد بن ابو بکر صدیق رضؓ سے ملتا ہے۔ ان کے جدِ امجد قاضی حمید الدین خجندی مغلیہ خاندان کے بانی بابر بادشاہ کے ہمراہ ۱۵۲۶ء میں ہندستان آئے۔ فتحِ ہند کے بعد بابر نے انھیں یک ہزاری منصب دے کر قصبۂ سیکری کا چودھری بنا دیا۔

مولانا اسمٰعیل کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ دس برس کی عمر میں قرآن ناظرہ ختم کیا۔ جب ذرا بڑے ہوئے تو مرزا رحیم بیگ رحیم کے مدرسے میں فارسی کی مزید تعلیم کے لیے داخل ہوئے۔ یہ ۱۸۵۷ء سے پہلے کا واقعہ ہے۔ خان بہادر مولانا محمد اسلم سیفی (مولانا اسمٰعیل کے خلفِ اصغر) "حیاتِ اسمٰعیل" میں لکھتے ہیں۔

"اس زمانے کا ذکر ہے کہ مرزا غالب نے قاطع برہان کے نام سے ایک رسالہ برہانِ قاطع کے خلاف شائع کیا تھا۔ یہی وقت تھا کہ مرزا رحیم بیگ کے مکتب میں مولانا (محمد اسمٰعیل) متعلم تھے۔ مرزا رحیم بیگ نے مرزا غالب کی قاطع برہان کے جواب میں ایک رسالہ ساطع برہان تصنیف کیا تھا مولانا کے سپرد یہ خدمت تھی کہ مختلف کتب لغات سے الفاظ تلاش کرتے اور ان کے معانی سُناتے رہیں اور کبھی کبھی مسودات بھی تحریر کیا کریں۔" (ص۹)

یہاں حضرت سیفی کو غلط فہمی یا سہو ہوا ہے جس زمانے میں مولانا اسمٰعیل، مرزا رحیم بیگ کے مدرسے میں طالب علم تھے اس وقت تک مرزا غالب کی قاطع برہان عالمِ وجود میں بھی نہیں آئی تھی۔ یہ کتاب ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے دوران میں مرتب ہوئی اور پہلی دفعہ ۱۸۶۲ء میں چھپی۔ جب کہ مولانا کی عمر ۱۸ برس کی ہو چکی تھی۔ خود جناب سیفی کے بیان کے مطابق مولانا محمد اسمٰعیل اس سے دو برس پہلے ۱۸۶۰ء میں انسپکٹر مدارس کے دفتر میں کلرک کی حیثیت سے ملازم ہو چکے تھے۔ ظاہر ہے کہ قاطع برہان کی اشاعت کے زمانے

میں مولانا اسمٰعیل، رحیم بیگ کے مکتب میں متعلم نہیں تھے، اس لیے وہ الفاظ کی تلاش اور مسودات کی تحریر کی خدمت بجا نہیں لا سکتے تھے۔

مولانا محمد اسمٰعیل ۱۸۶۰ء سے ۱۸۶۷ء تک اس دفتر میں ملازم رہے اور یہ سارا زمانہ میرٹھ سے باہر نہیں گئے۔ اس کے بعد ۱۸۷۰ء تک تین برس سہارن پور ضلع اسکول میں صدر مدرس فارسی کے عہدے پر فائز رہے۔ غالب پہلے جنوری ۱۸۶۰ء میں رام پور گئے ہیں اور دوسری مرتبہ اپریل ۱۸۶۵ء میں۔ دوسرے سفر میں میرزا میرٹھ میں نہیں ٹھیرے۔ البتہ پہلے سفر میں رام پور سے واپسی پر دو دن کے لیے نواب محمد مصطفےٰ خاں شیفتہ کے ہاں اُترے ہیں؛ اس وقت مولانا محمد اسمٰعیل کی عمر صرف سولہ برس کی تھی، اور ابھی انھوں نے شاعری شروع بھی نہیں کی تھی۔ اس لیے ان دونوں سفروں میں اُستاد اور شاگرد کی ملاقات کا کوئی موقع نہیں تھا۔ میرا خیال ہے کہ دونوں کبھی نہیں ملے، اس لیے مولانا نے مشورۂ سخن خط و کتابت ہی سے کیا ہوگا۔

مولانا ۱۸۷۱ء میں سہارن پور سے واپس میرٹھ آئے اور پہلے ضلع اسکول میں اور پھر نارمل اسکول میں فارسی کے معلم رہے۔ ۱۸۸۷ء میں وہ اسی عہدے پر آگرہ نارمل اسکول میں منتقل ہو گئے اور اس کے بعد بارہ برس تک آگرے میں مقیم رہے۔ مولانا کی شہرت بحیثیت شاعر اسی زمانے میں ہوئی۔ جب اُن کی بعض نظمیں مولانا وحید الدین سلیم کے پرچے معارف (علی گڈھ) میں شایع ہوئیں۔ آگرے ہی سے وہ ۱۸۹۹ء کے اواخر میں ملازمت سے پنشن لے کر اپنے وطنِ مالوف واپس آئے اور عمر کے باقی ایام یہیں میرٹھ میں بسر کیے۔

انھوں نے قیام آگرہ کے زمانے ہی میں ابتدائی درجوں کے لیے کتابوں کا ایک سلسلہ لکھا، جو مدتوں یو۔ پی کے مدارس میں داخلِ نصاب رہا اور اہلِ نظر کی رائے ہے کہ آج تک اس سے بہتر کتابیں بچّوں کے لیے نہیں لکھی گئیں۔

۱۹۱۲ء میں اُنھیں حکومت ہند کی طرف سے اپنی علمی خدمات کے اعتراف میں خان صاحب کا خطاب ملا تھا۔

۱۹۱۴ء میں نواب عماد الملک شمس العلماء مولوی سید حسین بلگرامی کی تحریک پر طوطیِ ہند حضرت امیر خسروؒ کے تمام کلام کی تصحیح و طباعت کا کام شروع ہوا تھا۔ ملک کے مختلف صاحبِ قلم حضرات کے ذمے ایک ایک کتاب لگائی گئی تھی۔ مثنوی "قران السعدین" جو حاکم بنگالہ نصیر الدین محمود بغرا خاں اور معز الدین کیقباد شاہ دہلی کی ملاقات کے حال پر مشتمل ہے، مولانا کے حصے میں آئی۔ افسوس کہ انھیں اس کا مطبوعہ نسخہ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ یہ ان کی وفات سے چند ماہ بعد ۱۹۱۸ء میں علی گڑھ سے شائع ہوئی۔ لیکن جو محنت اور جگر کاوی انھوں نے اس کی تصحیح اور تنقید میں کی ہے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ آخری ایام میں وہ حضرت امیر خسروؒ کی سوانح عمری مرتب کر رہے تھے کہ موت کا بلاوا آ گیا۔

معمولی علالت کے بعد یکم نومبر ۱۹۱۷ء (۱۴ محرم الحرام ۱۳۳۶ھ) کو جمعرات کے دن عصر کے وقت وفات پائی۔ اسی دن مغرب کے قریب جنازہ اٹھا اور شہر کے باہر ایک خاص قطعۂ زمین میں دفن ہوئے۔ جو باغیت اور غازی آباد سے آنے والی سڑکوں کے چوراہے کے قریب واقع ہے۔ لوحِ مزار پر کتبہ حسبِ ذیل ہے:

پیدائش ۔ ۱۲ ۔ نومبر ۱۸۴۴ء

وفات ۔ یکم نومبر ۱۹۱۷ء

اے ادیبِ علم و دانش، بانیِ فضل و کمال

اے خطیبِ خطبۂ خلق و ادب حلم و حیا

پیشوائے قوم مولانا محمد اسمٰعیل

ماہتابِ برجِ حکمت، آفتابِ فلسفہ

یہ دونوں شعر اس مرثیے سے ماخوذ ہیں جو منشی عنایت نبی ارشد نے مولانا کی وفات پر کہا تھا۔

وفات کے وقت عمر چند دن کم ۷۳ برس کی تھی۔ اپنے پیچھے اولاد میں دو لڑکے محمد محمود اور محمد اسلم اور ایک صاحبزادی قیوم النساء یادگار چھوڑی۔

کلیاتِ اسمٰعیل کا پہلا ایڈیشن اُن کی زندگی میں (۱۹۱۱ء) چھپا۔ لیکن یہ بہت ناقص تھا۔ دوسرا ایڈیشن اُن کے صاحبزادے جناب محمد اسلم سیفی نے ۱۹۳۸ء میں شائع کیا اور اُس کے شروع میں "حیاتِ اسمٰعیل" کا اضافہ کیا۔

مولانا اسمٰعیل نے اُردو، فارسی نظم و نثر میں بہت کچھ لکھا۔ میں نے کلام میں صرف اُن کی غزلوں کا انتخاب کیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا اصلی کارنامہ ان کی وہ نظمیں ہیں جو انھوں نے اپنی ناقابلِ تقلید اور عدیم المثال طرز میں بچّوں کے لیے لکھی ہیں۔ بچّوں کے لیے کوئی چیز لکھنا کس قدر مشکل ہے، اس کا اندازہ کچھ ان ہی کو ہو سکتا ہے جنھوں نے کبھی یہ کام کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے لیے بچّوں کی ذہنیت اور نفسیات کا گہرا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ محض پند و نصائح اور آسان زبان اس کے لئے کافی نہیں بلکہ موضوع کو ایسے طریقے سے پیش کرنا کہ بچّے کی سادہ طبیعت خود بخود اس کی طرف مائل ہو اور نصیحت اس کے دل پر نقش ہو جائے، یہ اصل بات ہے۔ مولانا محمد اسمٰعیل اس مقصد میں غیر معمولی طور پر کامیاب ہوئے ہیں۔

اُن کی غزلوں اور نظموں کا دل پسند موضوع تصوّف اور اخلاق ہے۔ ایک تو طبیعت فطری طور پر نیک تھی، اس پر دورِ آخر کے مشہور ولی اللہ حضرت سید غوث علی شاہؒ پانی پتی

؎ حضرت سید غوث علی شاہ، خورشید علی نام، ابو الحسن کنیت اور سید غوث علی شاہ عرف تھا۔ سلسلۂ نسب ۸ پشتوں میں حضرت شیخ عبد القادر جیلانی تک پہنچتا ہے۔ آپ کے اجداد میں حضرت سید محمد عرف سید محمد غوث سب سے پہلے ہندستان آئے وہ روم سے خراسان اور وہاں سے ملتان پہنچے (اخبار الاخیار) ملتان سے نقل مکان کر کے اوچہ تشریف لے گئے اور وہیں انتقال فرمایا۔ ان کے پوتے سید مصلح الدین ناصر الحسن عرف میر میراں لاہور میں بس گئے۔ ان کی اولاد میں سے اک بزرگ ۱۷۵۰ء سے پہلے مونگیر ضلع بہار کے قصبہ استھاواں چلے گئے۔ سید غوث علی شاہ یہیں استھاواں میں ۲ر ستمبر ۱۸۰۴ء (یکم جمادی الآخر ۱۲۱۹ھ) کو عالمِ وجود میں آئے۔ ۱۲ برس کی عمر میں اپنے والد بزرگوار جناب سید احمد علی رسالدار کی معیت میں لاہور گئے اور تعلیم کی غرض سے مختلف اکابر کی خدمت میں رہے۔ مولانا شاہ عبد العزیز محدث دہلوی اور مولانا فضل امام خیر آبادی ان کے اُستادوں میں تھے اور یہ خود مولانا فضل حق کے ہم سبق تھے۔ تکمیلِ تعلیم کے بعد مختلف مقامات کی سیر کر کے علومِ باطنی حاصل کیے۔ اور ۶۰ برس کی عمر میں پانی پت میں مقیم ہو گئے یہیں ۷ر مارچ ۱۸۸۰ء (۲۶ ربیع الاوّل ۱۲۹۷ھ) کو وصال ہوا۔ مزار شہر کے باہر ہے جہاں سالانہ عرس ہوتا ہے۔ "او بود شہنشہِ حقیقت" تاریخ ہے۔ یہ غالب کے دوستوں میں تھے۔ ان کے آپس میں دید و بازدید کے تعلقات تھے۔ (تذکرۂ غوثیہ)

کی بیعت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ انھوں نے اپنے مرشد کے حالات نثر میں "تذکرۂ غوثیہ" کے عنوان سے لکھے ہیں۔* اس کتاب کی دل کشی کی کماحقہ تعریف نہیں ہوسکتی۔ زبان کے لحاظ سے ایسی بے ساختہ اور موضوع کے لحاظ سے ایسی پُرخلوص کتابیں اُردو میں بہت کم تصنیف ہوئی ہیں۔

جن لوگوں نے اُردو شاعری کو نئے ڈگر پر ڈالا۔ ان میں مولانا اسمٰعیل صفِ اوّل کے لوگوں میں سے ہیں۔ جب ۱۸۷۴ء میں مولانا آزاد لاہور میں انجمنِ پنجاب کی قیادت میں نئے رنگ کے مشاعروں کی بنیاد رکھ رہے تھے۔ مولانا اسمٰعیل بھی اسی زمانے میں نئے نئے مضمونوں پر نظمیں تصنیف کر رہے تھے، جیساکہ اُن کے مجموعہ کلام "ریزۂ جواہر" (مطبوعہ ۱۸۸۰ء) سے ظاہر ہے۔ قادر الکلامی، محاورہ بندی، برجستگی اور آمد، کسی بات میں وہ اپنے معاصرین سے پیچھے نہیں، بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے، کہ بہت کم اس میں ان کی برابری بھی کر سکتے ہیں۔

اُردو غزلوں کا مختصر انتخاب یہ ہے:۔

ہر ایک دل کا ہے نقشا مرے جگر کا سا
تمھارے تیر میں انداز تھا نظر کا سا

اب مہربان ہوگئے، یہ کیا غضب ہوا!
میرے سوا حریفِ ستم کوئی بھی نہ تھا

محرم نہیں ہے گوش، مگر اس پیام کا
ہے بے لب و زبان بھی غل تیرے نام کا

رستے کی انتہا، نہ ٹھکانا مقام کا
ہیں بے قرار، منزلِ مقصود بے نشاں

ہم بیٹھنے نہ پائے، کہ وہ بدگماں اُٹھا
اس انجمن میں جائیے اب کس اُمید پر؟

پھر ہم کہاں جو پردۂ رازِ نہاں اُٹھا
وصل و فراق وہم سہی، دل لگی تو ہے

---

* عام لوگ اس کتاب کو سید گل حسن شاہ صاحب کی تصنیف خیال کرتے ہیں۔ کیونکہ ان ہی کا نام اس کے مصنف کی حیثیت سے سرورق پر لکھا ملتا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ سید گل حسن شاہ جس خطۂ ملک کے رہنے والے تھے، وہاں کی زبان کا اس سے کیا تعلق جو اس کتاب میں استعمال ہوئی ہے، میں نے کتاب کا اصلی مسودہ خود مولانا اسمٰعیل مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا، اُن کے صاحبزادے جناب سیفی صاحب کے پاس دیکھا ہے۔ جس کے بعد کوئی شبہہ ہی نہیں رہ سکتا کہ کتاب مولانا اسمٰعیل کی لکھی ہوئی ہے۔

پروانے کی تپش نے خدا جانے کان میں — کیا کہہ دیا کہ شمع کے سر سے دھواں اٹھا

بنائیں بگڑی ہوئی کو تو ایک بات بھی ہے — بگاڑنا نہیں مشکل، بنی بنائی کا

اٹھا حجاب، تو بس دین و دل دیے ہی بنی — جنابِ شیخ کو دعویٰ تھا پارسائی کا

کام اگر حسبِ مدعا نہ ہوا — تیرا چاہا ہوا، برا نہ ہوا

سخت فتنہ جہان میں اٹھتا — کوئی تجھ سا ترے سوا نہ ہوا

تو نہ ہو، یہ تو ہو نہیں سکتا — میرا کیا ہے ہوا ہوا، نہ ہوا

نقابِ جور میں روپوش، اک لطفِ نہاں نکلا — وہ میرے حال پر مجھ سے بھی زیادہ مہرباں نکلا

نہ تھا بزمِ احبا ہی میں تیرا ذکر، دشمن بھی — بیاں کرتا سرِ بازار، تیری داستاں نکلا

حجابِ شاہدِ مطلق نہ اٹھا ہے، نہ اٹھے گا — جسے ہم لامکاں سمجھے تھے، وہ بھی اک مکاں نکلا

میں کبھی کا مر بھی رہتا، نہ غمِ فراق سہتا — اگر اپنی زندگی پر مجھے اختیار ہوتا

یہ جو عشقِ جاں ستاں ہے، یہ وہ بحرِ بیکراں ہے — نہ سنا کوئی سفینہ، کبھی اس سے پار ہوتا

کبھی بھول کر کسی سے، نہ کرو سلوک ایسا — کہ جو تم سے کوئی کرتا، تمھیں ناگوار ہوتا

نہیں معلوم، کیا واجب ہے، کیا فرض — مرے مذہب میں ہے تری رضا فرض

ساقی! ادھر تو دیکھ، کہ ہم دیر مست ہیں — کچھ مستیِ نگہ بھی ملا دے شراب میں

بس، اے رنگ و بو! تو نہ کر نازِ بے جا — خدا جانے، کیا بات ہم دیکھتے ہیں

جو تشریف لاؤ، تو ہے کون مانع؟ — مگر خوے بد کو بہانے بہت ہیں

کرو دل کے ویرانے کی کنج کاوی — دبے اس کھنڈر میں خزانے بہت ہیں

نہ لے شمع! اور رو کے مر، شام ہی سے — ابھی تجھ کو آنسو بہانے بہت ہیں

بس اک آستانہ، ہے سجدے کے قابل — زمانے میں گو آستانے بہت ہیں

اتنا تو جانتے ہیں کہ بندے خدا کے ہیں — آگے حواس گم، خردِ نارسا کے ہیں

کھٹکا بھی کچھ ہوا نہیں اور دل اڑا لیا — یہ سارے ہتھکنڈے تری زلفِ دوتا کے ہیں

تو ہی نہیں ہے رمزِ محبت سے آشنا — ورنہ دیارِ حسن میں رسمِ ستم نہیں

سر ہی کے بل گئے ہیں سدا، رہروانِ عشق — حیرت زدہ نہ بن، کہ نشانِ قدم نہیں

کیسی طلب، کہاں کی طلب، کس لیے طلب! ہم ہیں، تو وہ نہیں ہے! وہ ہے، تو ہم نہیں

کبھی تقصیر جس نے کی ہی نہیں ہم سے پوچھو، تو آدمی ہی نہیں
یا وفا ہی نہ تھی، زمانے میں یا مگر دوستوں نے کی ہی نہیں
بندگی کا شعور ہے جب تک بندہ پرور! وہ بندگی ہی نہیں

خوفِ ناکامی ہے جب تک کامیابی ہے محال مشکلیں، جب بندھ گئی ہمت، سب آساں ہو گئیں
کیا انھیں اندوہِ ہنگامِ سحر، یاد آ گیا! شام ہی سے بزم میں شمعیں جو گریاں ہو گئیں
اک فرشتے بھی تو ہیں، جن کو نہ محنت ہے، نہ رنج خواہشیں دل کی بلائے جانِ انساں ہو گئیں
تھی وہ توفیقِ الٰہی، میں نے سمجھا اپنا فعل طاعتیں بھی میرے حق میں عینِ عصیاں ہو گئیں

بزمِ ایجاد میں بے پردہ کوئی ساز نہیں ہے یہ تیری ہی صدا، غیر کی آواز نہیں

بلبل کے دل میں داغِ وداعِ بہار ہے یارب! کوئی فریفتۂ رنگ و بو نہ ہو

بے حوصلگی ہے گلۂ تلخیِ دوراں جو دیں اُسے پی جایئے گو زہر ملا ہو
تنگی سے نہ دل تنگ ہو، جا شکرِ خدا کر اے خوش! وہ دلِ تنگ، کہ راضی برضا ہو
گاہک ہی نہ ہو کوئی، تو ہے عرضِ ہنر ہیچ اے وائے! گلِ تازہ جو صحرا میں کھلا ہو

پھر کچھ کچھ ان کے وعدے پہ اب اعتبار ہے مایوسِ مرگ پھر دلِ اُمیدوار ہے
چل، مے کدے کو، بیٹھ نہ گوشے میں تنگ دل زاہد! وسیع رحمتِ پروردگار ہے

البتہ اُس کے فضل پہ موقوف ہے نجات کچھ زہدِ خشک میں ہے، نہ دامانِ تر میں ہے

ہے رگِ ہر برگ میں رنگِ بہار دیکھنے کو چشمِ بینا چاہیے

ہے تو اغیار سے خطاب، مگر میری ہر بات کا جواب بھی ہے
واں برابر ہے خلوت و جلوت اس کی بے پردگی حجاب بھی ہے

اب فارسی کی دو غزلوں کے چند شعر ملاحظہ کیجیے :-

اے روئے تو بے نقاب تاکے برخود تپد آفتاب تاکے
بشکن سرِ زلف تاب دارت دلہا ہمہ پیچ و تاب تاکے
در روزِ شمار کس مپرسم گیرم زغمت حساب تاکے

حسنِ تو نقاب درتمنا بد | شوخیِ تو در حجاب تا کے
صد قفل زدم درِ تمنا | دل بستۂ فتحِ باب تا کے
زاہد! بہ نوائے خارج آہنگ | دل برکنی از رباب تا کے

ہرچند مرا نیست بتو ہیچ کلامے | ہردم زتو صد بار پیامے وسلامے
گفتم بتو از لب نہ برون آمدہ حرفے | رفتم بتو از جائے، نہ برداشتہ گامے
آنگاہ، کہ ناگاہ، بہ بے گاہ رسیدیم | سالیست، نہ ماہیست، نہ صبحیست، نہ شامے
منزل نگہِ مارا، نہ سلوکیست، نہ رسمے | نے ہم سفرے ہست، نہ میلے، نہ مقامے
آں مے کہ بخوردیم، نہ درخورد عوام ست | خم خانۂ مارا، نہ خمے ہست، نہ جامے

صد فتنہ برانگیختہ، ناکردہ نگاہے
صد مرحلہ طے ساختہ، ناکردہ خرامے

[حیاتِ اسمٰعیل]

انور ـــــــ سید شجاع الدین عرف امراؤ مرزا دہلوی

ان کے والد مشہور خوش نویس یاقوت رقم ثانی میر جلال الدین حیدر تھے۔ انور راقم الدولہ سید ظہیر الدین عرف نواب مرزا ظہیر کے چھوٹے بھائی تھے۔ نواب سعید الدین احمد خاں طالب نے اپنے والد نیر رخشاں سے ان کی شاگردی کے سلسلے میں ایک عجیب روایت نقل کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ جب میرزا زین العابدین خاں عارف کو خطِ نسخ سیکھنے کا شوق ہوا وہ سید جلال الدین یاقوت رقم ثانی استاذِ ظلِ سبحانی بہادر شاہ ظفر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان دنوں عارف کی شاعری کا عام شہرہ تھا۔ ادھر میر جلال الدین کے ان دونوں صاحبزادوں کو شاعری کی چیٹک تھی اور وہ ایک اچھے استاد کی توہ میں تھے

میر جلال الدین کو یہ اچھا موقع ہاتھ آیا۔ اُنھوں نے عارفؔ سے کہا کہ میں آپ کو یوں تو شاگرد کرتا نہیں۔ ہاں تبادلہ کرتا ہوں۔ یعنی میں آپ کو نسخ کی تعلیم دوں گا اور اس کے اصول بتاؤں گا۔ آپ میرے دونوں لڑکوں کو شاعری کے رموز بتائیں اور شاعر بنا دیں۔ عارفؔ مرحوم نے منظور کر لیا اور معاملہ اس پر طے ہو گیا۔ اگرچہ عارفؔ نے ایک سال کے بعد سلسلۂ تعلیم ختم کر دیا اور اُستاد نے سند لکھ دی لیکن ظہیرؔ اور انورؔ مدتوں عارفؔ سے اصلاح لیتے رہے۔ چونکہ دونوں جوہر قابل تھے تھوڑے ہی دن کی مشق سے کچھ کا کچھ ہو گئے۔ جب بہادر شاہ ظفرؔ کو ان کا حال معلوم ہوا تو اُنھوں نے ان دونوں کو استاد ذوقؔ کے سپرد کر دیا۔ خدا معلوم یہ بات کہاں تک صحیح ہے۔ طالبؔ ہی کی روایت ہے، کہ داغؔ بھی شروع میں کامل تین برس تک عارفؔ سے اصلاح لیتے رہے تھے۔ اس زمانے میں اُن کا تخلص مرزا تھا جو نیّر رخشاں کا دیا ہوا تھا۔ بعد میں جب ولی عہد مرزا فخرو نے ان کی والدہ وزیر بیگم عرف چھوٹی بیگم سے نکاح کیا تو یہ بھی اپنی والدہ کے ساتھ قلعے میں اُٹھ گئے۔ مرزا فخرو نے اُنھیں بھی ذوقؔ کے حوالے کر دیا۔ داغؔ تخلص ذوقؔ کا عطیہ ہے۔ یہ گویا مرزا فخرو پر چوٹ ہے۔

دیوانِ ذوقؔ کا جو ایڈیشن ۱۲۷۹ھ (۱۸۶۳ء) میں شائع ہوا تھا[۱]۔ اس کی ترتیب

---

[۱] عام خیال یہ ہے کہ دیوانِ ذوقؔ کا یہ پہلا ایڈیشن تھا لیکن میرے اپنے کتب خانے میں دیوان کا ایک ایسا نسخہ موجود ہے جو مطبع محمدی دہلی (محمد مرزا خاں) سے مارچ ۱۸۵۹ء میں شائع ہوا تھا اور لطیفہ یہ کہ اس میں ویرانؔ و ظہیرؔ والے نسخے سے ایک شعر زیادہ نہیں۔ فرق ہے تو صرف اتنا کہ ترتیب اس میں بالعکس ہے یعنی ویرانؔ کے ۱۸۶۳ء والے نسخے میں پہلے قصاید ہیں اور پھر غزلیات۔ ۱۸۵۹ء کی اشاعت میں پہلے غزلیات ہیں اور قصاید آخر میں۔ مجھے شبہ گذرتا ہے کہ ۱۸۵۹ء کی تاریخ جعلی ہے۔ یعنی چونکہ ویرانؔ وغیرہ نے اپنا دیوان رجسٹری کرا لیا تھا اس لیے مطبع محمدی کے نسخے کے ناشر نے قانونی گرفت سے بچنے کے لیے ترتیب بدل دی۔ اور تاریخ پہلے کی ڈال دی؛ ورنہ یہ نسخہ ۱۸۶۳ء کے بعد چھپا تھا۔

واللہ اعلم

میں غلام رسول ویراں اور ظہیر کے ساتھ انور بھی شریک تھے۔ اس کے بعد مولانا محمد حسین آزاد
نے بہت کچھ تصرف کر کے بلکہ اپنی طرف سے اضافے کر کے وہ دیوان شائع کیا جو اب متداول
ہے۔ ذوق کے بعد انور غالب سے مشورہ کرنے لگے تھے، نہایت ذہین اور طباع تھے۔
افسوس کہ عمر نے وفا نہ کی، ورنہ خدا معلوم کتنی ترقی کرتے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد پہلے رام پور
اور وہاں سے جے پور گئے۔ وہیں ۱۸۸۵ء (۱۳۰۲ھ) میں ۳۸ برس کی عمر میں خدا کو
پیارے ہوئے۔ بقول لالہ سری رام اُن کے دو مکمل دیوان ضائع ہو گئے۔ خدا مغفرت
کرے لالہ سری رام موصوف کو، انھوں نے بڑی محنت سے ایک دیوان مرتب کر کے
نظم دلفروز معروف بہ دیوان انور کے نام سے مطبع رفاہ عام لاہور سے شائع کرایا
(۱۳۱۶ھ/ ۱۸۹۹ء) ورنہ آج اُن کا کلام دیکھنے کو آنکھیں ترستیں۔ بہت پُر گو تھے۔
دیوان میں شاید ہی کوئی زمین ایسی ہو، جس میں دو غزلہ بلکہ سہ غزلہ تک موجود نہیں۔ زبان
پر قدرت، روزمرّہ، اور آمد۔ معاملہ بندی اور لطیف طنز ان کے کلام کا جوہر ہیں۔

انتخاب ملاحظہ ہو:-

وہ آنکھیں نہیں، ہائے کیا ہو گیا — وہ کافر تو اب کچھ نیا ہو گیا
تمھیں یاں تک آنا قیامت سہی — ہمیں جی سے جانے میں کیا ہو گیا؟

نظر ملتے ہی وہ کچھ ہو گیا، جو کچھ کہ ہونا تھا — پشیماں ہو رہا ہے دیدۂ انجام بیں کیا کیا

کہیں مہرِ طور جلوہ افگن، کہیں درِ دیر اُس سے روشن — وہاں تو ہے جائے جائے مسکن، ہمیں تو رکھا نہیں کہیں

تھک کے بیٹھے ہو درِ صومعہ پر کیا، انور! — دو قدم اور، کہ یہ خانۂ خمّار ر

کیسی حیا، کہاں کی وفا، پاسِ خلق کیا — ہاں یہ سہی، کہ آپ کو آنا یہاں نہ
کچھ اپنے دل کے ولولے، کچھ زاہدوں کی ضد — سر پھوڑنے کو ورنہ وہی آستاں نہ
میں اور روزِ وصل، عدو اور شبِ فراق — یہاں آسماں نہ تھا، کہ وہاں آسماں

جان سننے والوں کی واعظ لبوں پر آ گئی — واہ، کیا کہنا ہے حضرت، آپ کی گفتار

تم آج ہی چل پھر کے، مٹا دو نہ یہ جھگڑا — کیوں کل پہ رکھو شورشِ غوغائے قیامت

وہ دن گئے، کہ مصر کو پہنچا کوئی بخیر! — تم ورنہ آفتِ صد کارواں ہو آج

ہاں رویدادِ بزمِ عدو، کیوں کہو، مگر
یہ تو کہو، کہ شب کو کہاں تھے، کہاں ہو آج

کوئی تڑپے نہ کیوں تاب و تواں تک
نہ پوچھیں گے، نہ دیکھیں گے کہاں تک

کچھ کچھ وہ چھیڑ لطف کی، کم کم عتاب میں
جی ہے امید و یاس سے کس کس عذاب میں

یہ مستیوں کا رنگ ہے جوشِ شباب میں
گویا کہ وہ نہائے ہوئے ہیں شراب میں

جو کہے سچ ہے، نہ مے پی، نہ کہیں دل اٹکا
گفتگو کچھ سخنِ ناصحِ ناداں میں نہیں

ہے یہ مذہب کہ انھیں دیکھ کے کچھ کہہ نہ اٹھوں
گرچہ اب تک کوئی لغزش مرے ایماں میں نہیں

نظر ہو، تو نظر آتی ہے کیفیت دو عالم کی
چلو انور! تماشا دیکھ آئیں بزمِ رنداں میں

گویا کہ سب غلط ہیں مری بدگمانیاں
دیکھے تو کوئی شکل تمھاری حیا کے ساتھ

ہر ہر قدم پہ بیٹھتا آتا ہے، راہ میں
لایا ہوں کس کی بزم سے دل کو لگا کے ساتھ

کچھ ہم رُکے رُکے رہے، کچھ وہ کھچے کھچے
ارمان جی کے جی ہی میں، کیا کیا یہاں رہے!

کچھ تو مل جائے لبِ شیریں سے
زہر کھانے کی اجازت ہی سہی

دل میں یاں آ کے نکلنا کیسا
اے، وہ ارمانِ شہادت ہی سہی

بے طرح پڑتی ہے نظر اُن کی
خیر دل کی نظر نہیں آتی

ربط بڑھ جائے تو حسن و عشق کی ہو شان ایک
جو نفس ہے سینۂ عاشق میں شمعِ طُور ہے

نہیں سمجھا، نہ آپ آئے کہیں سے
پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے

میں اس برہم مزاجی کے تصدق
اُلجھتے ہیں وہ زلفِ عنبریں سے

کہاں کی دل لگی، کیسی محبت
مجھے اک لاگ ہے جانِ حزیں سے

وہ کچھ بے تابیاں، بگڑے سے تیور
لڑائی میں مزا ہے اُس حسیں سے

ادھر لاؤ ذرا دستِ حنائی
پکڑ دیں چور ہم دل کا یہیں سے

قہر ہیں مستی میں، وہ انگڑائیاں
خالی ہاتھوں لڑتے ہیں تلوار سے

شکایت کی تمھارے آستاں کی
زمیں بھی سوچتی ہے آسماں کی

یہ حالت ہے مرے دردِ نہاں کی
کہ صورت دیکھتے ہو رازداں کی

جاں بخش ہے گفتار، تو لب چشمۂ حیواں
پھر کہیے، کہ اُن پر کوئی کس بات پہ مر جائے

یہ خوشی کم ہے کہ ہم اس بزم میں اک طرف بیٹھے تو ہیں ناشاد سے

[نغمۂ دلفروز (دیباچہ خم خانۂ جاوید (۱) ص ۴۸۱۔
۴۸۹ ؛ قاموس المشاہیر (۱)، ص ۱۱۲]

باقر ـــــــ شاہ باقر علی بہاری

ضلع گیا (بہار) میں پیر بگہ ایک مختصر سا قصبہ ہے۔ باقر وہاں کے ایک مشہور خاندان مشائخین کے چشم و چراغ تھے۔ والد کی طرف سے سلسلۂ نسب حضرت مخدوم العارفین جلال الدین محمد کبیر الاولیا گازرونی پانی پتی کے واسطے سے حضرت رکن الدین عبد الرحمٰن الکبیر مدنی تک اور والدہ کی طرف سے حضرت غوث اعظم عبد القادر جیلانی رحمۃ تک پہنچتا ہے۔

ان کے مورث اعلیٰ خواجہ رکن الدین عبد الرحمٰن الکبیر، خلیفہ منصور عباسی (۷۵۴ء۔ ۷۷۵ء) کے زمانے میں حکومت کی سخت گیری کے باعث مدینہ منورہ سے نقل مکان کر کے گازرون (فارس) چلے آئے۔ اور بعد میں ان کے اخلاف یہاں سے سرخس منتقل ہو گئے۔ اس خاندان کے جو بزرگ سب سے پہلے ہندستان آئے، ان کا نام خواجہ شہاب الدین عبد الرحمٰن ثانی ہے۔ وہ غالباً سلطان محمود غزنوی کے ہمراہ ۴۰۳ھ (۱۰۱۲ء) میں یہاں آئے۔ سلطان نے انھیں پانی پت کی حکومت اور قضاءت سپرد کی۔ وہ عمر بھر یہیں رہے اور یہیں دفن ہوئے۔ اُن کی دسویں پشت میں حضرت جلال الدین محمد کبیر الاولیا ہوئے۔ جو اپنے زمانے کے مشہور ولی اللہ گذرے ہیں۔ اُن کی تیسری پشت میں حضرت مخدوم شاہ داؤد طلب علم کی غرض سے نکلے اور صوبۂ بہار میں، جو اس وقت علم و فضل کا مرکز تھا پہنچے اس طرح اس خاندان کی ایک شاخ پانی پت سے بہار منتقل ہو گئی۔

جناب باقر کے والد بزرگوار حضرت شاہ وارث علی انھیں اسلاف کے نام

لیوا تھے۔ ان تک کسی نے ملازمت کا تعلق پیدا نہیں کیا تھا۔ صرف عبادت و ریاضت اور درس و تدریس ان کا معمول رہا۔ سب سے پہلے جس نے اس خاندان میں ملازمت کا پیشہ اختیار کیا، وہ شاہ وارث علی ہی تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اپنی حکمت عملی کے تحت چاہتی تھی، کہ یہاں کے معزز اور صاحب اثر اور باوقار لوگ اس کی ملازمت میں داخل ہو جائیں، تاکہ عوام میں اس کی ساکھ قائم ہو جائے۔ چنانچہ بعض مجبوریوں کے باعث شاہ وارث علی بھی سررشتۂ عدالت میں منسلک ہو گئے۔ ان کی ملازمت کا سارا زمانہ آرہ میں گذرا۔ بیس برس یہاں رہے۔ جب مرض الموت میں مبتلا ہوئے، تو اپنے وطن بیربگہ چلے آئے اور یہیں ۲ر دسمبر ۱۸۳۳ء (۱۹ر رجب ۱۲۴۹ھ) کو واصل حق ہوئے۔

حضرت شاہ وارث علی کی اولاد میں دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ بیٹوں میں بڑے شاہ حسین علی تھے اور چھوٹے ہمارے صاحب ترجمہ شاہ باقر علی۔

باقر ۱۹ر جون ۱۸۳۱ء (۸ر محرم ۱۲۴۷ھ) کو بروز یکشنبہ پیدا ہوئے۔ یہ اپنے والد کی سب سے چھوٹی اولاد اور اُن کی وفات کے وقت صرف ڈھائی برس کے تھے۔ چنانچہ ان کی تعلیم و تربیت ان کی والدہ نے کی۔ سب سے پہلے قرآن کریم حفظ کرایا، پھر گھر ہی پر ایک اُستاد سے فارسی کی تکمیل کرائی۔ اس کے بعد عربی پڑھنا شروع کی تھی، کہ یہ سلسلہ رُک گیا اور زمانے تک اُنھیں دوبارہ اس کی طرف توجہ کرنے کی فرصت نہ ملی۔ یہ اُنھوں نے بہت مدت بعد مولانا مہدی حسن سے پڑھی۔ اس دوران میں البتہ انھوں نے لکڑی، پٹہ، گتگہ وغیرہ کے فن خلیفہ مداری اور میر یار محمد سے حاصل کیے۔ پھر تیر اندازی، شمشیر زنی، نیزہ بازی، شہسواری، بانک، بنوٹ، میر کریم اللہ سے سیکھے اور کافی بڑی عمر میں اپنی ملازمت کے زمانے میں ایک شخص مراد خان بھوپالی سے بندوق چلانا اور نشانہ لگانا سیکھا۔ غرض کہ جملہ فنون سپہ گری، اور مردانہ کھیلوں میں طاق تھے۔

باقر بھی اپنے والد اور بڑے بھائی کی طرح انگریزی حکومت کے ملازم رہے۔ ۱۸۵۹ء میں اُن کی سب سے پہلی تقرری سررشتۂ افیون میں گماشتے کی حیثیت سے آرہ میں ہوئی۔ یہاں سے ۱۹ برس کے قیام کے بعد ۱۸۷۸ء میں بڑہروا (ضلع موتی ہاری)

تبادلہ ہوا۔ پھر ۱۸۸۲ء میں پٹنے آئے اور یہیں سے ۱۸۸۹ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ اس کے بعد مستقل سکونت آرہ میں اختیار کرلی۔

ملازمت سے پنشن پا لینے کے بعد اُن کی تندرستی زیادہ خراب رہنے لگی معدے نے کہ اُم الامراض ہے۔ بہت تکلیف دینا شروع کی۔ کبھی شدید قبض ہو جاتی اور کبھی شدید اسہال۔ غرض صحت روز بروز کمزور ہونے لگی۔ وہ ایک خانوادۂ تصوف کے چشم و چراغ اور خود صاحبِ حال بزرگ تھے۔ عقاید کے لحاظ سے سنّی حنفی اور حضرت شاہ قیام اصدقؒ (متوفی ۲۱۔ رمضان ۱۳۰۱ھ = ۱۵۔ جولائی ۱۸۸۴ء) سے طریقۂ چشتیہ نظامیہ میں بیعت اور خود اُن کے خلیفہ اور صاحب اجازت تھے۔ اس لئے اوراد و وظائف اور ریاضت کا معمول بیماری کے ایام میں بھی نہیں چھوٹا۔ وفات سے ایک دن پہلے یک بیک فرمایا' کہ مجھے ایک ضروری کام سے گیا جانا ہے۔ چنانچہ بستر وغیرہ بندھوایا۔ اور گاڑی سے گیا پہنچ گئے۔ اگلے دن اسہال شروع ہو گئے طبیعت پہلے ہی سے نڈھال تھی۔ رہی سہی کسر اسہال نے پوری کردی۔ طاقت بالکل زایل ہو گئی۔ اسی حالت میں شب جمعہ ۲۴۔ جولائی ۱۹۰۸ء (۲۴۔ جمادی الثانی ۱۳۲۶ھ) کو وفات پائی۔ جنازہ پیر بگہ لایا گیا اور یہاں اپنے خاندانی قبرستان میں اپنی والدہ کی قبر کے متصل دفن کیے گئے۔ انّا للّٰہ و انّا الیہ راجعون۔

باقرؔ نے اپنی عمر میں تین نکاح کیے۔ پہلی شادی کے وقت اُن کی عمر صرف ۱۷ برس کی تھی۔ یہ بیوی جلد ہی فوت ہو گئیں۔ ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ دوسرا نکاح دو ڈھائی سال بعد اسی مرحومہ کی چھوٹی بہن سے ہوا۔ ان سے دو لڑکیاں باقرؔ کے بعد زندہ رہیں۔ تیسرا نکاح شیخ امیر اللہ صدیقی کی صاحبزادی سے ہوا۔ یہ بزرگ بھرت پور کے رہنے والے اور راجہ صاحب نانپارہ کے ہاں ملازم تھے۔ اس نکاح سے باقرؔ کے تین بیٹے اور ایک بیٹی اُن کی وفات کے وقت موجود تھے۔ سب سے بڑے جناب عطا حسین جنہوں نے ان کا دیوان مرتب کرکے شایع کیا ہے۔ یہ پہلے حکومت ہند کے محکمۂ ریلوے میں ملازم ہوئے اور بعد میں حیدرآباد دکن چلے گئے

دوسرے فرزند خان بہادر مولوی عبدالصمد صاحب ڈپٹی کلکٹر اور تیسرے ڈاکٹر عبدالکریم بھی گورنمنٹ میں ملازم رہے۔

باقرؔ نے قاطع برہان کے معرکے میں بھی حصہ لیا تھا۔ غالبؔ نے موید برہان کی تصنیف پر اپنا مشہور قطعہ لکھا تھا (انشا کردہ است۔ غوغا کردہ است) جس پر یہ شعری مباحثہ شروع ہوگیا۔ اس موقع پر باقرؔ نے دو قطعے عبدالصمد فدا اسلمپٹی (شاگرد مولوی احمد علی احمد جہانگیر نگری) کے جواب میں اور ایک منشی جواہر سنگھ جوہرؔ لکھنوی (شاگرد ناطقؔ مکرانی) کے جواب میں لکھے تھے۔ آغا علی شمسؔ نے ایک مضمون اردو نثر میں لکھا تھا، جس میں غالبؔ کے کلام پر اعتراض کیے تھے۔ باقرؔ نے اس کا جواب فارسی نثر میں دیا۔ باقرؔ کے یہ منظومات اور مضمون ہنگامۂ دل آشوب میں شامل ہیں اور وہیں سے دیوانِ باقرؔ میں بھی نقل کیے گئے ہیں۔

باقرؔ نے شاعری گویا ورثے میں پائی تھی۔ ان کے والد شاہ وارث علی بھی شاعر تھے۔ اشکیؔ تخلص تھا، انھوں نے اپنے کلام پر اصلاح شیخ محمد وجیہہ الدین عشقیؔ (خلف شیخ غلام حسین مجرمؔ عظیم آبادی) سے لی تھی۔ عشقیؔ اپنے وقت کے استاد تھے۔ گارساں دتاسی کا تذکرہ بہت حد تک عشقیؔ کے تذکرے سے ماخوذ ہے۔

خان بہادر سید علی محمد شادؔ کے استاد شاہ الفت حسین فریادؔ، ان ہی اشکیؔ کے بھانجے اور شاگرد بھی تھے۔

باقرؔ اردو میں کم اور زیادہ فارسی میں کہتے تھے۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

بگفتمش کہ مبر نام و ننگِ من، فرمود　　بَرد، بَرد، کہ نخواہیم نام و ننگِ ترا

ذرہ وردے طلب، تا محرمِ رازے شوی　　حاصلِ ایں زہدِ تو، زاہد! تو ابے بیش نیست

اے جان و دلم سوختہ آزارِ محبت　　جاناں چہ کنم پیشِ تو اظہارِ محبت

آغوشِ من و شاہدِ صد گونہ تمنا　　بالینِ من و سایۂ دیوارِ محبت

اے باقرِ دل خستہ! چنیں حالِ تو چونست　　شاید کہ دلت گشتہ گرفتارِ محبت

اے سنگ دل! یکے نشنیدی و مدتے　　باقرؔ بر آستانِ تو فریاد کرد و رفت

توانم داشتن در سینہ رازِ عشق را پنہاں — چہ سازم، ضبطِ عشق از چشمِ گریانم نمی آید
زدستِ وحشتِ دل نیست یک روزے نصیبِ من — کہ صد چاک از گریباں تا بداماں نمی آید
چہ می پرسی زاحوالم، چہ گویم با تو، اے ظالم! — چہا جورے، کہ از دستِ تو بر جانم نمی آید

کجا شد غالبِ شیریں نوا، باقرؔ! کہ آہ اکنوں
صدا زاں طوطیٔ ہندِ خوش الحانم نمی آید

ایں قدر جور و جفا، بر دلِ رنجور مکن — ہرچہ خواہی بکن، از پیشِ خودم دور مکن

ہوشم بربود آں صنمِ جلوہ طرازے — جادو نگہے، ماہ وشے، مایۂ نازے
جائے کہ تو باشی و منِ خستہ جگر ہم — سرسبز شود گلشنِ رازے و نیازے
کوتاہ کنم دامنِ صحرائے طلب را — گر دست دہد سلسلۂ زلفِ درازے

شکلِ تصویر ہو خاموش، تماشا کیا ہے — بیٹھے بیٹھے کھچے جاتے ہو یہ نقشا کیا ہے

تمہاری دید کی حسرت میں دیکھو جان جائے گی — کھلی رہ جائیں گی آنکھیں نکل جائے گا دم اپنا
کلیجہ تھامے ہاتھوں سے مرے گھر روز آؤگے — کسی دن تو اثر دکھلائے گا اندوہ و غم اپنا

[مقدمہ دیوانِ باقرؔ؛ تاریخ شعرای بہار ص ۶۵، ۸۷؛
حیاتِ فریاد ص ۱۵۵-۱۶۰؛ نگار (اپریل ۱۹۵۲) ص ۴۱-۴۰؛
ہنگامۂ دل آشوب]

بسملؔ ـــــ منشی شاکر علی (غلام بسم اللہ) میرٹھی ثم بریلوی

ان کے والد منشی سرفراز علی بانس بریلی کے رہنے والے، قوم کے کمبوہ، کمسریٹ میں سررشتہ دار تھے۔ بسملؔ میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ شاکر علی اصلی نام تھا۔ غلام بسم اللہ تاریخی نام ہے۔ (۱۲۳۹ھ) ان کی تعلیم بیشتر مارہرہ اور بریلی میں ہوئی۔ عربی بعد میں

مفتی محمد سلطان حسن خاں صابر الصمدوری سے حاصل کی ۔ مدتوں مظفر نگر اور میرٹھ میں
ناظر عدالت رہے ۔

مذہب سے بہت دل چسپی تھی ۔ دو مرتبہ حج کیا ۔ حضرت شاہ عبدالرحمن رح (گنج)
سے بیعت تھے ۔ اسی لیے آخر میں نعت گوئی سے زیادہ شغف رہا ۔ نعتوں کا مجموعہ
"نالۂ بسمل" چھپ چکا ہے ۔

پنشن لینے کے بعد بریلی میں مقیم ہو گئے تھے ۔ یہیں زیر جامع مسجد آج بھی ان
کے خاندان کے لوگ رہتے ہیں ۔ ۱۸۹۸ء (۱۳۱۵ھ) میں وفات پائی ۔ محو بریلوی نے
تاریخ کہی "ان العاقبت للمتقین" ۔ اپنے آبائی قبرستان میں دفن ہوئے ۔

غالب کی تقلید کا بہت شوق تھا اور ان کی طرحوں میں لکھنے کی کوشش
کرتے تھے ۔ نعت بھی کہتے تھے ۔ چنانچہ نعتوں کا ایک مجموعہ "نالۂ بسمل" کے
عنوان سے شائع کیا تھا ۔ غالب کی ایک زمین میں چند شعر ملاحظہ ہوں ۔

شب دفورِ اشک سے گردوں کفِ سیلاب تھا — دورۂ چشمِ کواکب، حلقۂ گرداب تھا
واں حنا بندی، عناں گیرِ خرامِ ناز تھی — یاں تنِ کا ہیدہ، غرقِ اشکِ خونِ ناب تھا
واں رُخِ پر نور تھا، صبحِ امیدِ زندگی — یاں ہر اک داغِ جگر، خورشیدِ عالمتاب تھا
حسنِ تمکین آزما کو، پاسِ خودداری اُدھر — خانہ زادِ عشق کو ملحوظ یاں آداب تھا
ان کو پاسِ ننگ دامن گیر، مجھ کو پاسِ وضع — وہ اُدھر بیتاب تھے اور میں اِدھر بیتاب تھا

میں نے دیکھا رات بسمل کو پڑا تھا خاک پر
بسترِ سنجاب تھا نے بالشِ کم خواب تھا

[یادگارِ ضیغم، ص ۶۸؛ خم خانۂ جاوید (۱)
ص ۵۹۰-۵۹۱]

بیتاب ـــــ صاحبزادہ عباس علی خاں رام پوری

رام پور کے حکمران خاندان سے تھے۔ ان کے والد نواب محمد عبدالعلی خان بہادر تھے۔ جو نواب فردوس مکاں محمد یوسف علی خاں بہادر کے حقیقی چچا تھے۔

چونکہ انتخاب یادگار کی تالیف کے وقت ان کی عمر ۶۶ برس کی تھی اس لیے تقریباً ۱۲۲۴ھ (۱۸۰۹ء) میں پیدا ہوئے ہوں گے۔ ۱۸۳۷ء تک دہلی میں رہے، پھر لکھنؤ چلے گئے۔ اپنی ظاہری اور باطنی خوبیوں کے باعث ہم عصروں میں ممتاز تھے۔ اُردو کلام پر حکیم مومن خاں مومن دہلوی سے اصلاح لیتے تھے۔ ان کی وفات (۱۸۵۲ء) کے بعد کسی سے مشورہ نہیں کیا۔ لیکن غالب کے دوسرے سفر رام پور (۱۸۶۵ء) کے بعد ان کے شاگرد ہو گئے۔ اپنا دیوان بھی ان کی خدمت میں اصلاح کے لیے بھیج دیا۔ اور ان کی وفات تک خط و کتابت کے ذریعہ مشورہ بھی کرتے رہے۔

۱۸۵۷ء کے بعد رام پور میں حاکم صدر بنائے گئے اور فروری ۱۸۸۳ء تک اسی عہدے پر متمکن رہے۔ ۶ر جون ۱۸۸۳ء (مطابق ۲۹ر رجب ۱۳۰۰ھ) کو ظہر کے وقت فوت ہوئے۔ دیوان "گلدستۂ باغ جناں" کے عنوان سے شعبان ۱۳۰۱ھ میں چھپا تھا۔ گلزارِ عشق اور بہارِ عشق دو قصّے بھی لکھے تھے، جو طبع نہیں ہوئے۔ ان کے قلمی نسخے رام پور کے کتب خانے میں موجود ہیں۔

ان کے چھوٹے بھائی صاحبزادہ محمد عنایت علی خاں بھی فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے اور عنایتؔ تخلص کرتے تھے۔ بقول شیفتہؔ و کریم الدین فارسی کلام صہبائیؔ کو اور اُردو میر حسن تسکینؔ (شاگرد نصیرؔ و مومنؔ) کو دکھلاتے تھے لیکن امیر مینائی کہتے ہیں کہ مومنؔ سے مشورہ تھا۔ یہ ۱۴۔ اگست ۱۸۴۸ء (۱۴۔ رمضان ۱۲۶۴ھ) کو زہر خورانی سے دہلی میں فوت ہوئے۔ درگاہ حضرت خواجہ باقی باللہؒ میں مدفون ہیں۔

بیتابؔ کے کلام کا نمونہ یہ ہے:-

ہر بات میں برہم کوئی اتنا نہیں ہوتا
آپس میں، ذرا سمجھو تو، کیا کیا نہیں ہوتا

یوں، کون ستاتا ہے مری جان کسی کو؟
خوبی پہ جسے اپنی بھروسا نہیں ہوتا

کچھ بن گئی ہے ایسی ہی دم پر مرے، ورنہ
مرنا تو کسی کو بھی گوارا نہیں ہوتا

کروں اللہ سے فریاد، تمھارا ہو کر
تمہیں منصف ہو، کہ پھر میں رہوں کس کا ہو کر

خیر گذری، کہ ذرا چونک کے، پھر لگ گئی آنکھ
رہ گیا یوں ہی سا کچھ حشر کا غوغا ہو کر

دوستی اپنی، خدا کے لیے، تہہ کر رکھیے
نہیں بھاتا ہے مجھے ناصحو! اتنا اخلاص

بیتاب! دردِ عشق کہاں، اور ہم کہاں
بیٹھے بٹھائے ٹوٹ پڑا، ناگہاں فلک

ان بے وفائیوں کا دکھاتا ذرا مزہ
ہوتا ذرا بھی دل جو مرے اختیار میں

بیتاب کا بھی رند و! معلوم ہے پتا کچھ
ہم اس کو دیکھتے تھے، اکثر اس انجمن میں

پھر بیٹھے بیٹھے چھیڑ نکالی، خدا سے ڈر
ظالم! ابھی تو آنکھ کا آنسو تھما نہیں

کون کہتا ہے کہ یاں آنے کا دستور نہیں
بات تو یہ ہے کہ ملنا اُنھیں منظور نہیں

یا بند ناصحوں کی زباں کر دے، اے خدا!
یا مجھ کو دے یہ صبر، کہ بیٹھا سنا کروں

بہرِ خدا بتا تو دے اتنا بھی، ناصحا!
اس کو کروں نہ یاد، تو پھر کیا کیا کروں

ہزار صبر کرو، لاکھ بے قرار نہ ہو
نہیں وہ چیز محبت، کہ آشکار نہ ہو

نہیں کرنا تھا جو، وہ کر بیٹھے
آپ باتیں بنائیں، گھر بیٹھے

وفادار، ناصح! مبارک تمھیں
ہمیں تو وہی بے وفا چاہیے

مقابل میں تیرے تو، اے پند گو!
تجھی سا کوئی بے وفا چاہیے

بجا ہیں تمھارے سب ارشاد، پر
ذرا اور کی بھی سُنا چاہیے

زباں سے نام اس کا دم بدم ناصح لو آتا ہے
خدا کے واسطے چپ رہ کلیجہ منھ کو آتا ہے

تو صبر ہے عشاق کا شیوہ، یہ ستم گر
جب جی ہی پہ بن جائے تو پھر کیا نہیں کرتے

بیتاب! یہ کیا قہر ہے، او جان کے دشمن!
ہر بات پہ یوں پھوٹ کے رویا نہیں کرتے

پاس رکھنے کا جو بیتاب! کریں وہ دعویٰ
صحبتِ غیر بھی، ناچار گوارا ہو جائے

کیا کہے جاتے ہو، کچھ وصل کی تدبیر بتادو — آپ عقبیٰ میں تو، ناصح رہے کام آنے سے
مل گیا راہ میں بت خانہ بھلے سے، زاہد! — کعبے کو جا ہی چکے تھے ترے بہکانے سے

ذکر اُس کا ہو، کچھ بھی فرمائیے — کاش ناصح ہی دل کو بہلائے
اور اُن کا گِلا ہوا اُلٹا — کرکے شکوہ بھی ان سے پچھتائے

معمور ہے خدا کی عنایت سے مے کدہ — ساقی اگر نہیں، نہ ہو، مے سے کام ہے
بیتاب اپنی، خدا نے دیے ہیں تجھے بھی ہاتھ — یہ خُم ہے، یہ سبو ہے، یہ شیشہ، یہ جام ہے

آج پیغام بر! نہ کچھ کہنا — ہیں وہ ہم پر بہت خفا بیٹھے
یہ بھی قدرت خدا کی، اے بیتاب! — تم بھی اب بن کے پارسا بیٹھے

[گلشنِ بے خار، ص ۳۴-۳۵، ۱۳۷؛ طبقات الشعرائے ہند، ص ۳۷۶؛ انتخاب یادگار، ۷۶-۸۱، ۲۲۳-۲۲۴؛ اخبار الصنادید، ص ۱۷۳؛ خم خانۂ جاوید (۱) ص ۶۲۴۔]

بیدل ___ مولوی عبدالسّمیع رامپوری

فارسی اور عربی کی علمی استعداد بہت اچھی تھی۔ ۱۲۷۰ھ (۵۴-۱۸۵۳ء) میں کسبِ علم کے لیے دہلی آئے۔ اور مفتی صدرالدین خاں سے عربی پڑھی۔ انہی ایام میں شعرگوئی کا شوق ہوا تو میرزا غالب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اوائل میں طبیعت غزل کی طرف زیادہ مایل رہی۔ بعد میں اس رسمی شاعری کو چھوڑ کر اپنی تمام توجہ مذہبی علوم و مسایل پر محدود کر دی۔ ایک نعتیہ دیوان اور ایک مختصر رسالہ نورِ ایمان کے نام سے موجود ہے، جس میں مختلف مسایلِ دینی نظم کیے ہیں۔ چونکہ ان کی کوئی غزل دستیاب نہیں ہوئی، اس لیے رسالہ نورِ ایمان سے ایک اقتباس درج ہے۔

دوستو یہ ہے دارِ فانی چند روز	یہاں کا عیش و کامرانی چند روز
ہیچ ہیں سب نغمۂ چنگ و رباب	لذتِ صوتِ اغانی چند روز
بس کوئی دن کی ہے یہ رنگین بہار	ہے چمن کی گل فشانی چند روز
چشمِ نرگس کا ہے غمزہ کوئی دن	نازِ سروِ بوستانی چند روز
ہے چہکتا طوطیِ شکر شکن	سُن لو اس کی خوش بیانی چند روز
پھر جو ڈھونڈو گے تو یہ بیدلؔ کہاں	کر لو اس کی میہمانی چند روز

(نورِ ایمان (دیباچہ))

بیدلؔ ـــــــ مولوی ابوالحسنات محمد حبیب الرحمٰن انصاری سہارنپوری

مشہور عالم مولانا حاجی احمد علی محدث سہارنپوری کے صاحبزادے تھے جو خاندانِ ولی اللّٰہی میں مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب کے نامور شاگردوں میں ہوئے ہیں۔ مولانا احمد علی اپنے دور کے مشہور عالم تھے۔ اُن کے علم و فضل سے بہت لوگوں نے استفادہ کیا۔ مولانا شبلی نعمانی بھی اُن کے شاگردوں میں سے تھے۔ ان کی وفات ۱۲۹۷ھ میں ہوئی۔ نساخ نے تاریخ کہی ہے

چوں آں احمد علیِ نیک باطن	بسوے خلد زیں دارالفنا رفت
برائے سالِ ترحیلش بہ نساخ	ملک گفتا: "ز دنیا مقتدا رفت"

ان کے تین بیٹے حیدرآباد دکن گئے۔ مولانا حبیب الرحمٰن ان میں سے منجھلے تھے۔ یہ ۱۲۵۹ھ میں پیدا ہوئے 'ظہور الدین احمد' تاریخی نام ہے۔ ۱۳۱۲ھ میں نواب عماد الملک ناظم تعلیمات حیدرآباد دکن کے بُلاوے پر وہاں گئے" اور مدرسہ عالیہ نظام میں سو روپیہ مشاہرہ پر فارسی کے مدرس مقرر ہوئے۔ دورانِ قیام حیدرآباد میں مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر کے متوسلین میں شامل رہے۔

بیدل بڑے جید عالم تھے۔ بعض کتابوں کا ترجمہ بھی کیا مثلاً مسند امام ابوحنیفہ، تاریخ تیموری، مقامات بدیع ہمدانی۔ یہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ایک رسالہ فضیلت علم بھی لکھا، جو سلسلہ وار ماہانہ پرچے دبدبۂ آصفی میں چھپتا رہا تھا۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار کی وفات کے بعد کچھ دن تک دبدبۂ آصفی اور محبوب الکلام کی ادارت بھی کرتے رہے۔ مہاراجہ بہادر کی سرکار سے بھی کچھ ماہانہ مقرر تھا۔

غالب کے علاوہ حسین علی خاں شاداںؔ سے بھی استفادہ کیا تھا طبیعت مشکل پسند اور مضمون آفرین پائی تھی۔ فی البدیہہ اشعار کہنے میں خاص ملکہ تھا۔

تنگیٔ زخم نے ارمانوں کے عقدے نہ کھلے ۔۔۔ کاش دل بھی مرا ہم رنگ گریباں ہوتا

عیش دنیا ہیچ ہے، اور پوچ ہے اس پر غرور ۔۔۔ آج ہم غمناک ہیں اور کل عدو غمناک تھا

لگی ہو جیب، اسے کیا جانے کہہ دیا ہی گیا ۔۔۔ نقاہت دل مضطر نے گفتگو ہو کر

کسی کی زود پشیمانی میرے مرنے پر ۔۔۔ دل عدو میں کھٹکتی ہے آرزو ہو کر

حریم کعبۂ غیرت سے مت نکال قدم ۔۔۔ جیا تو خاک جیا، ننگ آبرو ہو کر

قطرہ میں البحر کا تماشا ۔۔۔ نقشہ ہے خدائی کا بشر میں

مجھ کو شکوہ کی قسم، تم کو وفا کی سوگند ۔۔۔ کیا کہوں، کس سے کہوں، سخت پریشانی ہے

تیرا وہ حسن، کہ ہنگامہ طلب عالم ہے ۔۔۔ میرا وہ دم، کہ چلا میری نظر سے پہلے

[(۱) خم خانہ جاوید، ص ۳۳-۳۴؛ دفتر ہفتم، (۲) تزک محبوبیہ، ص ۶۶۲-۶۶۴؛ دار العلوم کے سپوت، ص ۸۳]

بے صبر ــــــ منشی بال مکند سکندر آبادی

ان کے والد رائے کانہہ سنگھ (کانجی مل۔ خم خانہ جاوید) قوم کے بھٹناگر کائستھ تھے۔

یہ بھی اسی سکندر آباد کے رہنے والے تھے جہاں کے تفتہ تھے اور غالباً اُن سے کچھ عزیزداری بھی تھی۔ بہت صغرسنی میں شعر و سخن کا شوق پیدا ہوا، چندے تفتہ سے بھی مشورہ کرتے رہے۔ علمی استعداد بہت اچھی تھی۔ غالباً فارسی کے علاوہ عربی اور سنسکرت بھی جانتے تھے۔ اس کے علاوہ منطق اور نجوم میں بھی اچھی دستگاہ تھی۔ ان کے بہت شاگرد تھے، جن میں بنواری لال شعلہ زیادہ مشہور ہوئے۔ مدتوں سرکار انگریزی میں محکمۂ مال میں منشی گری اور داروغگی کے عہدوں پر متمکن رہے۔ اسی سلسلے میں دہلی میں سکونت کا اتفاق ہوا اور یوں غالب سے ملنے کی تقریب پیدا ہوگئی۔ ستر برس کی عمر تھی جب ۱۸۹۰ء میں انتقال کیا۔

اُردو اور فارسی دونوں میں کہتے تھے۔ دیوان اور ایک مثنوی لختِ جگر مطبوعہ موجود ہے۔ مثنوی میں ۲۵۰۰ شعر ہوں گے۔ ایک دوسری مثنوی "اخگرِ عشق" غیر مطبوعہ رہ گئی۔ یہ ۱۲۷۳ھ میں لکھی گئی تھی۔ "لالۂ پرداغ" تاریخ ہے۔ اب ان کے چند شعر دیکھیے۔

مدعا اگر ہے تو یہ ہے، عاشقِ دلگیر کا   اشک میں ہونا اثر کا، آہ میں تاثیر کا
بےخودانِ عشق کو کیا حاجتِ ترکِ لباس   تن سے پیراہن جدا ہوتا نہیں تصویر کا

عیاں جب اپنا فروغِ جمال تو نے کیا   تمام کر دیا مہ کو، کمال تو نے کیا

آدمی کی کٹتی ہے بیصبر! کس سختی سے عمر   پیر ہونا طفل کا لانا ہے جوئے شیر کا

زبس ہر چیز کی قدر اس کی ضد سے ہوتی ہی ظاہر   ہوئی جس روز سے شادی، نہ ہم نے لطفِ غم پایا

فتورِ پیری نے آ کے قویٰ میں ڈال دیا   سحر نے تفرقہ مہماں سرا میں ڈال دیا

تجھ سے کیا اُس کا گلہ، کیا ترا احسان مجھ پر   غیر پر تیر چلایا تھا، مرے آن لگا

کر کے مجھ کو قتل، وہ مغرور بولا غیر سے   "تھا بہت اس کو بھی اپنی سخت جانی پر گھمنڈ"

کچھ میں کہتا ہوں، تو کہتے ہیں "کیا چاہتے ہو؟"   چپکے بیٹھے نہیں رہتے ہو، "اُٹھا چاہتے ہو"
تم نہ بولے، تو نہ بولا کوئی تم سے، بیصبر!   اب کہا چاہتے ہو کچھ، تو سُنا چاہتے ہو

غیر کو دیکھنا بچشمِ عتاب   دیکھنے کا بہانہ تو دیکھو

تیغِ ابرو شہرۂ آفاق ہے   چشم بد دور اپنے فن میں طاق ہے

یار جب مجھ کو یاد آتا ہے   گریہ بے اختیار آتا ہے

ابھی تو گذرے ہیں دن ایک دو، ابھی کیا ہے   دلا! تو بیٹھا کوئی دن تو رو، ابھی کیا ہے

زمیں سے آسماں، اور آسماں سے لامکاں پہنچے   تلاشِ یار میں دیکھو کہاں سے ہم کہاں پہنچے

سوزِ جگر یہ اپنا نہیں خود بخود، ضرور   یہ آگ تو کسی کی لگائی ہوئی سی ہے

بوٹا سا قد، چھریرا سا تن، چمپئی سا رنگ   بھولی سی صورت، آنکھ لجائی ہوئی سی ہے

رخصت وہ ہوا، اشک ہمارے نکل آئے   خورشید کے چھپتے ہی ستارے نکل آئے

وہ جوشِ خوں نہیں، محتاج ہو جو نشتر کا   نہ نکلے توڑ کے جو رگ کو، وہ لہو کیا ہے

گر افتخار ہے معشوق کا، تو عاشق سے   نہیں جو میں ترے نزدیک کچھ، تو تو کیا ہے

نہیں ہے صبر تو بیصبرا! ہے تلاش عبث   جو چیز کھوئی گئی، اس کی جستجو کیا ہے

آخر ترے غم میں مر گئے ہم   بھرنا تھا جو دکھ سو بھر گئے ہم

بیصبرا! نہ جان کا کیا خوف   اس کوچے میں بے خطر گئے ہم

اس دل نے کیا خراب مجھ کو   دکھلائے نہ کیا عذاب مجھ کو

بیصبرا! میں زندگی سے ہوں تنگ   دے موت خدا شتاب مجھ کو

جاناں دہدم شراب و نوشم   ایں کفر بدیں نمی فروشم

بر ساقی و بادہ، باد قرباں   نقدِ دل و دین و صبر و ہوشم

دستِ من و دوشِ عیش، کامروز   دستِ صنم است زیب دوشم

از نغمہ زباں مباد خاموش   گوید بدم ار کسے، "خموشم"

یارے و مطرب است بیصبر
باید کہ نہ جز نشاط کوشم

[تذکرۂ آثار الشعرائے ہنود، ص ۲۳-۲۷؛ بہارِ سخن، ص ۸۶-۸۷؛
خم خانۂ جاوید (۱) ص ۶۸۲-۶۸۳]

بےصبر ــــــ عین الحق کاٹھوی

ضلع میرٹھ (تحصیل باغپت) میں ایک قصبہ کاٹھ ہے۔ یہاں کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی عمر سرکاری ملازمت میں بسر کی۔ بعد میں ریاست نانپارہ (یو۔پی) میں بہرائچ کے قریب ایک گاؤں (؟ رام پور) ٹھیکے پر لے لیا۔ یہیں ۱۹۲۵ء کے لگ بھگ تقریباً ۸۰ برس کی عمر میں انتقال کیا۔

فارسی کی تعلیم بہت اعلیٰ تھی۔ بلامبالغہ ہزارہا شعر یاد تھے۔ ایک تذکرۃ الشعرا مرتب کیا۔ ایک کتاب "سرقۂ شعری" کے نام سے لکھی تھی۔ دونوں کے مسودے بہرائچ میں حضرت سالار جنگ مسعود غازیؒ کی درگاہ کے کتب خانے میں ہیں۔

افسوس کہ کلام مہیا نہ ہو سکا۔

[از جناب بدر الدین صاحب سجادہ نشین رٹول (ضلع میرٹھ)]

بیمار ــــــ حکیم محمد مراد علی

پنجابی الاصل اور سجادہ نشینانِ ڈھوڈہ کی اولاد میں سے تھے۔ ان کے دادا سید احسان علی، طبابت کا پیشہ بھی کرتے تھے اور اسی سلسلے میں مہاراجہ صورت سنگھ والیِ بیکانیر نے انھیں مہارانی صاحبہ کے معالجے کے لیے بیکانیر طلب کیا۔ خدا نے ان کے علاج سے مہارانی کو شفا بخشی۔ انعام میں مہاراجہ نے انھیں موضع دلت پورہ (معروف بہ رائے سنگھ پورہ) کی جاگیر عطا فرمائی اور یہ یہیں بس گئے۔ سید احسان علی نے اپنا خاندانی پیری مریدی کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ بیمار کے والد کا نام سید کرم علی عرف میاں کریم جی تھا۔ بیمار سولہ برس کے تھے جب تعلیم کے لیے دہلی آئے۔ عربی، فارسی نواب محمد قطب الدین خاں سے پڑھی اور اسی زمانے

میں غالب کی خدمت میں بھی حاضر ہوتے رہے۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد ہندستان اور بیرونی ممالک کی سیر کے لیے نکل گئے اور اس دوران میں کشمیر اور کاشغر اور ختن تک کا چکر کاٹ آئے۔ واپس لوٹے تو محکمۂ پولیس میں سررشتہ داری اور انسپکٹری کے عہدوں پر فائز رہے، اپنے خاندانی پیشۂ طب میں بھی اچھی دستگاہ تھی۔ جنگ نامۂ روم و روس، مسایل خمسہ اور متعدد نثری مضامین ان سے یادگار ہیں۔ اودھ پنچ اور دہلی پنچ کے نامہ نگاروں میں سے تھے۔

چڑھ گئے رندوں کے ڈھب پر آج حضرت شیخ جی — کھل گیا چھٹا، میاں کے زہد بے بنیاد کا
عاشقِ زار کو ہرگز نہ ستاتا، ظالم — خوف کچھ بھی جو تجھے ہائے خدا کا ہوتا
ہم مر گئے، تس پر بھی خطاوار ہی ٹھیرے — اندھیر یہ ہم نے تری سرکار میں دیکھا
اِس ہستیِ موہوم پہ نازاں نہ ہو، ناداں! — اک دم کا بھروسا نہیں، بیمار! یہاں کا
نام والوں کے مٹائے ہائے سب نام و نشاں — اے فلک بے مہر! بتلا، تجھ کو کیا حاصل ہوا
وہ مسیحا جب نہ آیا، ہم تڑپ کر رہ گئے — جان دینا تم کو اے بیمار! مشکل کیا ہوا

[خم خانۂ جاوید (۱) ص ۶۸۶ - ۶۸۷؛ یادگار ضیغم ص ۷۸]

پیرجی ——— پیرجی قمرالدین دہلوی

کتب فروشی اور معلمی ذریعۂ معاش تھا۔ غالب کے علاوہ مرزا قربان علی بیگ سالک سے بھی اصلاح لی۔ ۱۲۹۸ھ (۱۸۸۰-۱۸۸۱ع) میں فوت ہوئے۔

رہ و رسمِ محبت سے خبر تم کو نہیں اصلا — ٹھکانا زاہدو! کیا ہے تمھارے دین و ایماں کا
وہ کیا غیر سے رشتۂ مہر توڑیں — کہ یہ بھی نزاکت کے شایاں نہیں ہے
مرے دل کو ہو کس طرح سے مسرت — کہ اس بزم میں ہائے رضواں نہیں ہے

ہر اک شعر اس کا ہے، گنج معانی　　مقرر یہ غالب ہو شاداں نہیں ہے

(رضواں سے شمشاد علی بیگ رضواں اور شاداں سے حسین علی خاں شاداں مراد ہیں۔ گویا یہ غزل ۱۸۷۶ء اور ۱۸۸۰ء کے درمیانی زمانے میں لکھی گئی ہے۔)

[خم خانۂ جاوید ۲، ص ۱۳]

تپش ــــــ مولوی غلام محمد خاں دہلوی

ابتدا میں نواب اکبر علی خاں بہادر کے زمانے میں دربار پٹودی میں بزمرۂ شعرا ملازم تھے۔ جب ان کا انتقال ہو گیا تو یہ لکھنؤ پہنچے اور وہاں مدتوں منشی نولکشور کے مشہور اودھ اخبار کے ایڈیٹر رہے۔ اپنے زمانے کے بہت مشہور صحافی تھے۔ جب اودھ اخبار سے الگ ہوئے تو اپنا ہفتہ وار پرچہ "مشیر قیصر ہند" جاری کیا یہ بھی بہت دن چلا۔ جب امیر مینائی کی امیر اللغات کی دونوں جلدیں شائع ہوئی ہیں تو اس پرچے میں ایک مسلسل مضمون اس کی اغلاط سے متعلق نکلتا رہا تھا۔ ۱۳۲۰ھ (۱۹۰۲۔۱۹۰۳ء) میں فوت ہوئے۔ عیش باغ لکھنؤ میں مدفن ہے۔

نظم و نثر، اردو، فارسی، عربی اور تاریخ گوئی میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ آخر میں شعر گوئی تقریباً ترک کر دی تھی، صرف نثر لکھتے تھے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

سادگی میں بھی نکلتے ہیں ترے لاکھ بناؤ　　بن گئے حسن خداداد کا زیور گیسو
منفعل ہوتے ہیں بدلتے ہیں جب نکہتوں سے　　سرنگوں ہیں ترے رخسار کے اوپر گیسو
گھر دمکے ہیں دھواں دھار گھٹائیں راتیں　　کاکل و ابرو و خط، زلف معنبر، گیسو
مست ہو جائیں نہ کیوں آہوئے تاتار و ختن　　ہوں ہوا دار صبا، جب ترے کھل کر گیسو

سچ تو یہ ہے، کہ نہ حور اچھی نہ جنت اچھی　　سامنے میرے اگر ہو تری صورت اچھی
کیا بیان کیجے کہ کس طرح کٹی ہجر کی رات　　شب فرقت سے تو ہے صبح قیامت اچھی

بہ قبضہ، مطلع پر نور آفتاب ظفر | بلمعۂ نظر افروز، مشرق تنویر
بود بہ معرکہ از بس نغزائے تیغش خوں | بکف چو نبض طپد، موج جوہر شمشیر
ہلال پیکر و خورشید لمعہ، سعد سرش | ستارہ جوہر و سیماب چشمہ، برق خمیر
بشرح گرم روی ہائے برق طبع سمند | عنانِ خامہ طپد، ہمچو نبض در تحریر

[یادگار ضیغم، ص ۳۰-۳۴ ؛ گلدستۂ سخن، ص ۱۸-۲۰ ؛

آب بقا، ص ۱۷۰ ؛ قصاید مدحیہ نظام، ص ۳۷۸ ؛

پیام یار (دسمبر ۱۸۸۹ء) ص ۶ -]

تپش ـــــــ سید مدد علی اکبرآبادی

اصل ان کی ایران سے ہے۔ ان کے والد کا نام میر نجف علی جعفری سبزواری تھا۔ سلسلۂ نسب حضرت امام جعفر صادقؑ سے ملتا ہے۔ تپش ۱۸۱۹ء میں آگرے میں پیدا ہوئے اور وہیں محلہ زین خانہ میں سکونت رہی معلمی پیشہ تھا۔ عربی، فارسی دونوں زبانوں میں معقول دستگاہ تھی۔ فارسی مولوی قمرالدین سے اور عربی ملا حسن اور صحیح مسلم تک مفتی ریاض الدین خاں سے پڑھی۔ شروع میں میاں نظیر اکبرآبادی کے صاحبزادے خلیفہ گلزار علی اسیر سے چند غزلوں پر اصلاح لی۔ بعد میں مرزا غالب کے شاگردوں میں شامل ہو گئے۔ اردو اور فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے۔ شیعہ مذہب کے پیرو تھے۔

متعدد تصانیف مثلاً خزینۃ القواعد، فاتح الاذہان، محاربات ہند (۱۲۲۸ھ تا ۱۲۸۶ھ)، جغرافیہ منظوم، رسالہ منظہر علم در حساب، ہدایت الانام بہ منقبت چہاردہ معصوم ان سے یادگار ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف علوم سے دلچسپی تھی۔

(خم خانہ جاوید میں تپش کا حال طپش تخلص کے تحت بھی لکھا گیا ہے صحیح تپش ہے جیسے کہ مدد علی نے خود لکھا ہے) کلام میں کوئی خاص بات نہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو:-

یار نے سن کے مرے نالے، تجاہل سے کہا | "کوئی تو روتا ہے" واللہ مقر باہر

بے اثر ہوتی نہیں، سنتے ہیں، آہِ عاشقاں — پھر یہ کیا ہے، آہ کا اپنی اثر ہوتا نہیں

تری ہے عفو کی عادت مری ہے عصیاں کی — کیا ہے کس لیے پھر موردِ قصور مجھے

فراق و درد و الم، غم، ستم، فغان و تپش — یہ ساتوں گھیرے ہیں ہفتے سے بے قصور مجھے

صفا اگر طلبی، زاہدا بمشربِ ماست — بجز ریا، دگر از فرشِ بوریا مطلب

بر دلم افتادہ از جعدش بلا ہائے دگر — "در سرم از نکہتِ زلف است سودائے دگر"

گل شدہ از مردنِ غالب چراغِ شاعری — اے تپش! در خلق مثلش کیست یکتائے دگر

[شعر و سخن، ص ۳۳-۳۵؛ گلستانِ بے خزاں، ص ۷۵؛

خم خانۂ جاوید (۲)، ص ۳۵-۳۶؛ نیز (۵)، ص ۲۴۷]

تحسین ـــــ حافظ قاضی عبدالرحمن پانی پتی

یہ اولاد میں تھے حضرت محمد جلال الدین کبیر الاولیاؒ کی۔ گویا ان کا اور غالب کے ایک دوسرے شاگرد باقر بہاری کا خاندان ایک ہے۔ ان کے والد پانی پت کے مشہور عالم قاضی محمد ثناء اللہ تھے جو ۱۱۴۳ھ میں پیدا ہوئے۔ سات برس کی عمر میں قرآن حفظ کیا۔ اس کے بعد مختلف اشغال میں لگے رہے۔ آخر میں دہلی پہنچے اور حدیث کی تکمیل حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سے کی۔ نقشبندی سلسلے میں پہلے خواجہ محمد عابد سنامی سے اور ان کی وفات کے بعد حضرت مرزا جانِ جاناں مظہر سے بیعت ہوئے۔ مظہر نے انھیں "علم الہدیٰ" کا لقب عطا فرمایا تھا۔

اس کے بعد واپس وطن پانی پت آ گئے اور ساری عمر افتاء و ارشاد اور درس و تدریس میں گزری۔ ان سے تیس سے زیادہ کتب یادگار ہیں۔ ان میں سے درسی کتاب مالا بدمنہ اور حنفی نقطہ نگاہ سے تفسیر مظہری (عربی) خاص طور پر مشہور ہیں۔ غرۂ رجب ۱۲۲۵ھ (۲ اگست ۱۸۱۰ء) میں فوت ہوئے۔ مولوی محب اللہ پانی پتی نے آیت قرآن

"فَہُم مُکرمون فی جنّت النعیم" سے تاریخ نکالی۔ (اس میں ایک عدد کم ہے، یعنی ۱۲۲۴)۔
تحسینؔ نے ضروری علوم دہلی میں حاصل کیے تھے۔ حافظِ قرآن تھے۔ تمام عمر یادِ خدا اور زہد و تقویٰ و قناعت میں بسر کر دی۔ ۱۲۹۴ھ (۱۸۷۷ء) میں بعارضۂ ذات الصدر انتقال فرمایا۔

فارسی کی طرف زیادہ توجہ تھی۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

تو زخمِ خنجرِ قاتل نخوردی | چہ دانی لذتِ بسمل شدن را
بسودا قوتِ دستم گر این ست | توانم چاک زد جیبِ کفن را
دروغے کرد از صدقِ محبت | بمردن زندہ نامِ کوہکن را

گر خوش و نغز، نہ حوران، با تو ارزانی ہمہ | با منِ مجنوں رہا کن، واعظا! آں سہ پارہ را
شورِ قلقل بود تحسینؔ، شب درونِ خانہ ات | داشتی مہماں کہ ایں شاہدِ مے خوارہ را

آنانکہ حقِ جلوۂ جانانہ شناسند | در سنگِ حرم، آتشِ بت خانہ شناسند
زاہد! نشوی منکرِ رنداں، کہ بمستی | رازِ دو جہاں، از خطِ پیمانہ شناسند
دانند کہ آوارگیم از پئے کاریست | فریاد کہ مجنونم و فرزانہ شناسند

مطلب زمے پرستاں قدحِ شراب، کایناں | ندہند جز بہ رندے، کہ زاہلِ راز باشد
چکنم چو زلفِ خوباں، زحرم کشد بہ دیرم | حذر از خمِ کمندے، کہ چناں دراز باشد
زرقیب تا بہ تحسینؔ، چہ تفاوت است دانی؟ | اگرت میانِ عشق و ہوس امتیاز باشد

آنم کہ حریفِ نگہِ عشوہ گراں را | تیز است گر این دشنہ مرا ہم جگرے ہست

خشک شد دامنِ تر بادۂ ناب ساقی | داغم از زہد ریائی دمِ آبے ساقی

زلفِ ترسا بچگانم سوئے میخانہ کشید | ورنہ من بودم و کنجے و کتابے، ساقی!
بود با چشمِ تو بحثے، بہ تغافل مارا | غمزہ طے کرد ز شوخی بجوابے، ساقی!

[صبحِ گلشن، ص ۸۲-۸۳؛ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۸؛
حیاتِ نو، ۱۹۳۴-۱۹۳۵ء۔]

تفتہ ــــــــ منشی ہرگوپال سکندرآبادی

دلّی سے ۴۰-۴۵ میل شمال کی طرف ایک اچھا خاصا قصبہ سکندرآباد (ضلع بلند شہر) ہے۔ جسے سکندر لودھی (۱۴۸۹ - ۱۵۱۷ء) نے بسایا تھا۔ اسی کے زمانے میں ایک بھٹناگر کائستھ خواجہ دیپ چند (خلف امر دیو) فیروزآباد (مضافات آگرہ) سے آکے یہاں بس گئے۔ چنانچہ ان کے خاندان والوں کی اَل آج تک "فیروزآبادی" ہے۔ اس خاندان کو ۴۰۴۵ بیگہ پختہ معافی اور عہدۂ قانونگوئی موروثی ملا تھا۔

خواجہ دیپ چند کی اولاد میں ایک صاحب موتی لال ہوئے ہیں۔ اُن کے آٹھ بیٹے تھے جن کی اولاد "اٹھ گھرے" کہلاتی ہے۔ منشی ہرگوپال انہی موتی لال کے بیٹے تھے۔ ۱۷۹۹ء - ۱۸۰۰ء (۱۲۱۴ھ) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ فارسی کا شوق شروع سے تھا۔ انگریزی محکمۂ بند و بست میں مدتوں قانون گو رہے لیکن شاعری کے شوق میں نوکری کو خیرباد کہہ دی۔ ۱۸۵۰ء میں تھوڑے عرصے کے لئے ریاست جے پور میں بھی ملازمت کا تعلق ہو گیا تھا لیکن یہ کھکھیڑ بھی زیادہ دن تک نہ سہہ سکے اور جلد ہی مستعفی ہو گئے۔ کبرسنی میں ۲-ستمبر ۱۸۷۹ء (۱۵-رمضان ۱۲۹۶ھ) کو سکندرآباد ہی میں وفات پائی۔ بدری کرشن فروغ نے تاریخ کہی ؎

ستمبر تم با بعالم گذاشت	کہ از دہر سوے جناں تفتہ رفت
دوم روز، در دہر با تم دو چند	زجورِ فلک الاماں، تفتہ رفت
سن عیسوی گفتم آخر، فروغ!	"چہ سوے جناں، زین جہاں تفتہ رفت"

۱۸۷۹ء

مولوی ممتاز احمدؔ تھانوی نے ہجری میں تاریخ وفات لکھی ؎

سالِ نقلش با دلِ زار از خرد
من شنیدم "بے سر و پا شد سخن"

۱+۱۲۹۵ = ۱۲۹۶

اولاد میں دو لڑکے (امراؤ سنگھ اور پیتمبر سنگھ) اور ایک لڑکی تھی۔ چھوٹا لڑکا پیتمبر سنگھ ۱۸۵۵ء (۱۲۷۲ھ) میں فوت گیا۔ اس کی وفات نے ان کی کمر توڑ دی۔ اسی موقع پر انھوں نے (۲۲۲) شعر کا ایک طویل مرثیہ لکھا تھا، جو اُن کے دیوان دوم میں موجود ہے۔ گلستان کی تضمین بھی اس کی یادگار کے طور پر لکھی تھی جیسا کہ اس کے آغاز میں صراحت کی ہے۔ صاحبزادی کا بھی جلد ہی اس کے بعد انتقال ہو گیا۔ امراؤ سنگھ ان کے بعد زندہ رہے۔ اُنھوں نے سنبلستان کے آخر میں اسی صاحبزادے کی شکایت لکھی ہے۔ اُن کی اولاد اس وقت سنگرور (ریاست جیند) میں موجود ہے۔

تفتہ ابتدا میں راقمؔ تخلص کرتے تھے۔ حسین قلی خاں نے اپنے تذکرے (نشترِ عشق) میں لکھا ہے کہ نورالعین واقفؔ بٹالوی کے دیوان کے مطالعے نے اُن کے دل میں شعر گوئی کا شوق پیدا کیا۔ چونکہ ذکاوت اور استعداد سے بہرۂ وافر ملا تھا، اس لیے تھوڑی سی توجہ اور مشق سے بہت جلد ترقی کر گئے۔ نشترِ عشق میں جو انتخاب دیا ہے، اس میں تخلص راقمؔ ہی ہے۔ مثلاً۔

۱؎ بے محل نہیں ہو گا، اگر یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ کر دیا جائے۔

عام طور پر مشہور ہے کہ مرحوم ڈاکٹر سر شانتی سروپ بھٹناگر جو ہندستان کے مایۂ ناز سائنس دان تھے، اور جن کا انتقال ۱۹۵۵ء کے شروع میں ہوا۔ تفتہ کے نواسے تھے۔ یہ غلط محض ہے۔ واقعہ یہ ہے۔

سکندر آباد کے کائستھوں ہی میں ایک صاحب دل سکھ رائے تھے۔ جو اگرچہ یقیناً اُسی خواجہ دیپ چند کی نسل سے ہوں گے جو تفتہ کے بھی مورثِ اعلیٰ تھے۔ لیکن جن کا بہرحال تفتہ سے کوئی قریبی تعلق نہیں تھا۔ ان دل سکھ رائے کے تین لڑکے تھے۔ تنا لال اور منا لال اور پیارے لال۔ آخر الذکر (پیارے لال) کی اولاد میں دو صاحبزادے (دیوی دیال اور جوالا دیال) اور دو صاحبزادیاں ہوئیں۔ ان میں سے ایک صاحبزادی (پاربتی دیوی) موگا (ضلع فیروز پور۔ پنجاب) کے لالہ ایشری پرشاد سے بیاہی گئیں۔ اُن کے تین بچے ہوتے۔ دو لڑکے اور ایک لڑکی۔ لڑکوں کے نام تھے شانتی سروپ اور جینتی سروپ۔ یہی شانتی سروپ، ہمارے سر شانتی سروپ بھٹناگر ہیں۔ دوسرے بھائی آج کل بلند شہر میں مقیم ہیں۔

تعجب ہوتا ہے، کہ خود سر شانتی سروپ نے اپنی زندگی میں اس کی تردید نہ کی۔ بلکہ جب مولوی عبدالحق اور خواجہ حسن نظامی نے ان کے دیوان لاجونتی کا مقدمہ لکھا اور اس میں اُن کے تفتہ کا نواسہ ہونے کا ذکر کیا، تو اُسے جوں کا توں رہنے دیا۔

رائی تو، کز غمت بیمار بود | عاقبت امروز، از دنیا گذشت
زرائی تو، چو ما سر گزشت پرسیدیم | کشید آہ دگر یباں درید دریغ نگفت

جب غالب کی شاگردی اختیار کی تو انھوں نے تخلص بدل کر تفتہ اور مرزا کا خطاب دے کر مرزا تفتہ بنا دیا۔ تفتہ استاد کے محبوب شاگردوں میں سے تھے، اور اُنھوں نے ان کی تہذیب و تحسین میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ تفتہ نے تمام عمر فارسی میں بسر کر دی۔ اُردو میں ان کے صرف اس ایک قطعہ کا پتہ چلتا ہے جو اُنھوں نے اُستاد کے انتقال پر کہا تھا۔

غالب وہ شخص تھا ہمہ داں جس کے فیض سے | ہم سے ہزاروں ہیچمداں نامور ہوئے
فیض و کمال و صدق و صفا اور حسن و عشق | چھ لفظ اس کے مرنے سے بے یاد سر ہوئے

فارسی میں بہت بڑا ذخیرہ یادگار چھوڑا۔ چار دیوان ہیں اور کسی میں بھی بارہ تیرہ ہزار شعر سے کم نہیں۔ سعدی کی گلستاں کی تضمین لکھی۔ ایک مثنوی سنبلستان، بوستاں کے جواب میں لکھی۔ تمام مشہور اساتذہ فارسی کی غزلوں پر غزلیں لکھی ہیں اور خوب خوب دادِ سخن دی ہے۔ بلکہ تیسرا دیوان تمام تر خلاقِ معانی کمال اسماعیل اصفہانی کی طرحوں میں ہے اور کسی جگہ فارسیت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

اس خروار سے بطور نمونہ چند شعر درج کرتا ہوں :

رہا نداز چنیں بے دانشی ہا یت خدا، اے دل! | بدامش افتی و دیگر طمع داری رہائی را
بندگوئی، کہ نشاں نیست زخونیں کفناں | مگر ایں لالہ، کہ بینی، زشہیدانِ تو نیست
روے کہ جانِ ما بلب آرد، دوائے ماست | مرگے، کہ رو بما نماید، شفائے ماست
تیغ افتاد از کفِ قاتل | زندگانی وبالِ گردنِ کیست
می وَوَدِ چار سُو، نمی دانم | برقِ گرمِ تلاشِ خرمنِ کیست

حکیم خلیل الرحمٰن خلیل (دیلی جمعیت) کے پاس تفتہ کے دیوان دوم کا وہ نسخہ تھا، جو خود تفتہ کے پاس رہا تھا۔ خلیل صاحب کا بیان تھا کہ اس کے حاشیہ پر کچھ ایسا کلام بھی ہے جو شائع نہیں ہوا، اور تفتہ نے خود درج کیا تھا۔

(زمانہ کانپور - جولائی ۱۹۳۴ء)

حسرت ہلاکِ بے کسی آں، کہ بر درت | با جانِ خستہ آمد و با چشمِ تر گذشت

ایں اگر گویم، اگر آید یقیں | قصدِ جانم، یارِ جانی می کند
دل کہ با مرگ آشنائی داشتہ ست | زندگانی، جاودانی می کند

سالکانِ تفتہ جاں، تنہا نہ منزل سوختند | راہ را در آتش افگندند و منزل سوختند
عاشقاں گرمِ تماشا، چون شدند از فرطِ شوق | بر رخِ معشوق دیدند آنچہ حایل، سوختند
بگذر از دیوانگانِ خود، کہ ایں آتش و ماں | طوق را کردند خاکستر، سلاسل سوختند
حال ہا باغ از من مپرس، اے محفلِ عیشِ تو گرم! | لالہ ہا، بے تو، برنگِ شمعِ محفل، سوختند
مشربم گیر و بزہد و اتقا آتش فگن | تفتہ! با حق ساختند آناں کہ باطل سوختند

اے تماشا گاہِ ایں دل روے تو | عالمے در دل تماشا کردہ ایم
ما نہ تنہا دیدہ پرنم کردہ ایم | آنچہ نتواں کرد، آں ہم کردہ ایم
وارد از خود رفتگی ہا، عالمے | رفتہ ایم و سیرِ عالم کردہ ایم

[تواریخ بلند شہر، ص ۱۳۱؛ صبحِ گلشن، ص ۸۶ - ۸۷؛
روزِ روشن، ص ۲۳۶ - ۲۳۷؛ خم خانۂ جاوید (۲)
ص ۱۱۵ - ۱۱۶؛ معاصر (۲)، ص ۱۲؛]

تمنّا ـــــــــ مولوی احمد حسین مرزا پوری

اس سلسلے میں دیکھیے میناؔ (مولانا احمد حسین مرزا پوری)
[شاطۂ سخن (۱)، ص ۱۳۹ -]

تمنا — مولوی محمد حسین مراد آبادی

مراد آباد کے شرفا میں سے تھے۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شوق کرتے تھے۔ اُردو میں شیخ مہدی علی ذکی[1] سے اصلاح لی۔ اور فارسی میں غالب سے۔ تلاشِ معاش میں حیدر آباد دکن بھی گئے لیکن وہاں کامیابی نہ ہوئی اور بے نیلِ مرام واپس مراد آباد چلے آئے۔ نواب محمد صدیق حسن خاں (بھوپال) کے احباب میں سے تھے۔ ۱۸۹۷ء میں دیوانِ اُردو شائع کیا تھا۔

ذرہ ذرہ زجنوں، بر سرِ کار است ایں جا — صد پری شیشہ بہ ہر مشتِ غبار است ایں جا

چو برقِ شوخیش، دیوانگاں را مجلس افروزد — پری رقصاں، بگردِ شمع چوں پروانہ برخیزد

چہ گوئی حالتِ زاہد کہ مدہوشانہ می آید — پری ہم از سرِ کوئے کسے دیوانہ می آید

---

[1] ذکی شیخ مہدی علی مراد آبادی، شیخ کرامت علی کے صاحبزادے تھے۔ مدتوں جنت آرام گاہ نواب محمد سعید خاں بہادر والیِ رام پور کی ملازمت میں رہے۔ بعد میں لکھنؤ چلے گئے۔ وہاں نواب واجد علی شاہ کی سرکار سے خطاب ملک الشعرا عطا ہوا۔ جب انگریزوں نے سلطنت اودھ پر قبضہ کر لیا اور نواب واجد علی شاہ کلکتہ چلے گئے تو یہ عہد فردوس مکاں میں دوبارہ رام پور آگئے۔ ذکی آخری دور کے مشہور شعرا میں تھے۔ تاریخ میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ اُردو کے علاوہ فارسی میں بھی کہتے تھے۔ ناسخ کے شاگرد تھے۔ علوم دینی میں بھی معقول دستگاہ تھی، جو علمائے فرنگی محل سے حاصل کیے تھے۔ انبالے گئے ہوئے تھے کہ مارچ ۱۸۶۷ء (ذی قعدہ ۱۲۸۳ھ) میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔ وفات کے وقت عمر ۷۰ برس کی تھی۔ کلیات مطبوعہ موجود ہے۔ ایک رسالہ عروض میں بھی کہا۔ یہ یادگیر یادگار چھوڑا۔ کتب خانہ رام پور میں اُن کی نوشتہ پانچ داستانیں بھی ہیں (طلسم جام جم، طلسم حیرت کدۂ آصفی، طلسم حکیم قسطاس، سبع سیارہ، بالا باختر) یہ آج تک شائع نہیں ہوئیں۔ خان بہادر ظفر حسین خاں (لکھنؤ) ان کے پوتے ہیں جنہیں ابھی پچھلے دنوں ایک کتاب مآل و شیئت لکھنے پر پانچ ہزار روپیہ حکومت ہند کی طرف سے انعام ملا ہے (خم خانۂ جاوید (۳) ص ۲۵۶-۲۵۷؛ رسالہ آج کل نومبر ۱۹۵۲ء؛ انتخاب یادگار، ص ۱۴۰؛ صبح گلشن، ص ۱۹۰

سویدائے دلِ عاشق، اگر باشد سپند اینجا | کہ دودِ خوں چکاں، از محفلِ جانانہ می آید
موجۂ غم ہر نفس طوفانِ فریادم کند | ماتمے دارم کہ مرگِ ناگہاں شادم کند
درجہاں نبود بدستِ ہیچ کس معموریم | خانۂ عشقم خرابیِ غم آبادم کند
تعلق از منِ دیوانۂ خود، یکقلم مگسل | وفا گر نیستت جاناں! بیا وبے وفائی کن

اُردو کلام فارسی سے پست تر ہے۔ نمونہ یہ ہے ؎

جوشِ اُلفت نے بڑے دھوکے میں رکھا عمر بھر | ہم یگانہ جانتے تھے جس کو، وہ بیگانہ تھا
یہ مرض تھا عینِ صحت، جو طبیب یار ہوتا | مجھے غم ہی خورمی تھا، جو وہ غم گُسار ہوتا
ہوئے ہیں آپ جو بیگانہ، آشنا ہو کر | بتائیے کہ بنے درد کیوں، دوا ہو کر؟
گو سو طرح کے رنج و بلا میں پھنسا رہے | دل کا یہی مزا ہے، کہیں مبتلا رہے

[شمع انجمن، ص ۱۰۰-۱۰۱؛ خم خانہ جاوید (۲)
ص ۱۳۳-۱۳۴]

توفیق ــــ شاہزادہ بشیر الدین میسوری ثم کلکتوی

آپ شاہزادہ شکر اللہ سلطان کے صاحبزادے اور سلطان شہید ٹیپو سلطان والیِ میسور کے پوتے تھے۔

آپ کے خاندان سے متعلق اختلاف ہے۔ کوئی اُنھیں پنجابی الاصل کہتا ہے، کوئی افغان بتاتا ہے۔ "نشانِ حیدری" کے مصنف کا بیان ہے کہ ان کے آبا و اجداد قریشی نسل کے عرب تھے۔ اُس کے مطابق اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ کا نام، جو سب سے پہلے ہندستان وارد ہوئے، ولی محمد تھا۔ وہ ایران اور پنجاب سے ہوتے ہوئے دہلی پہنچے۔ ممکن ہے کہ وہ راستے میں بہت دن پنجاب میں ٹھیرے ہوں اور

اس سے بعد میں لوگوں نے خیال کیا کہ وہ پنجابی ہیں۔ چندے دہلی میں قیام کر کے وہ گلبرگہ (دکن) پہنچے۔ یہاں ان کے صاحبزادے محمد علی کی شادی حضرت شاہ بندہ نواز کی درگاہ کے متولی کی صاحبزادی سے ہوگئی۔ تھوڑی مدت بعد جب ولی محمد کا انتقال ہوگیا تو محمد علی نے گلبرگہ سے نقل مکان کیا اور اپنی بیوی اور تین لڑکوں سمیت پہلے بیجاپور اور پھر کولار میں سکونت اختیار کرلی۔ پہلی بیوی کے بعد اُنھوں نے کولار ہی میں دوسری شادی کی۔ اس سے ان کا چوتھا لڑکا پیدا ہوا، جس کا نام اُنھوں نے فتح محمد رکھا۔ یہی شیخ فتح محمد حیدر علی کے والد اور ٹیپو سلطان کے دادا تھے۔

حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے عروج و زوال کی داستان 'تاریخ ہندستان' کا حصہ ہے اور وہاں دیکھی جاسکتی ہے۔ مئی ۱۷۹۹ء میں انگریزوں نے نظام حیدرآباد کی مدد سے ٹیپو سلطان کو شکست دی۔ خود سلطان میدانِ جنگ میں آخری دم تک لڑتے ہوئے شہید ہوئے اور ان کی سلطنت انگریزوں اور نظام اور میسور کے قدیم شاہی خاندان میں تقسیم کر دی گئی۔ سلطان شہید کے بارہ صاحبزادوں اور ایک صاحبزادی کے لیے دو لاکھ چوبیس ہزار پگوڈا (تقریباً ساتھ لاکھ روپیہ) سالانہ پنشن مقرر ہوئی اور ان سب کو ویلور کے قلعے میں نظر بند کر دیا گیا۔ ان ہی صاحب زادوں میں صاحبِ تذکرہ توفیق کے والدِ ماجد جناب شکر اللہ سلطان بھی تھے۔ ۱۸۰۷ء میں بعض لوگوں نے خروج کیا اور ان شاہزادوں کو آزاد کر کے دوبارہ تخت نشین کرنا چاہا اور اس منصوبے کی تکمیل کے لیے شکر اللہ سلطان ہی کو اپنا سردار اور سالار مقرر کیا۔ انگریزوں نے طاقت سے یہ مخالفت کی آگ تو دبا دی لیکن اسی کے ساتھ اُنھیں اس بات کا بھی یقین ہوگیا کہ اس خاندان کا میسور کے اتنا نزدیک رہنا مصلحت کے خلاف ہے۔ اس لیے سارے قافلے کو کلکتے بھیج دیا۔ یہاں یہ لوگ ٹالی گنج میں مقیم ہوئے۔ ان کی اولادِ امجاد اب بھی یہیں رہتی ہے۔

شاہزادہ بشیر الدین توفیق کی عمر کا بیشتر زمانہ کلکتے ہی میں گذرا۔ انھیں بھی اپنے والد بزرگوار کی طرح علم و فضل سے بہرۂ وافر ملا تھا اور اس پہلو سے بھی انھوں نے اپنے خاندان کی شاندار روایات قایم رکھیں۔ ان کے دیکھنے والے اُن کے اخلاقِ حمیدہ اور صفاتِ برگزیدہ کی تعریف کرتے ہیں۔ وہ اردو، فارسی نظم و نثر دونوں میں خاصی دستگاہ رکھتے تھے۔ چنانچہ دیوان ہزبر کی تقریظ و تاریخ اس پر گواہ ہیں۔ ۱۸۸۵ء (۱۳۰۲ھ) میں وفات پائی۔

ناسخ نے تاریخ لکھی ہے ؎

رفت شہزادہ بشیر الدین توفیق از جہاں ۔۔۔ سوئے خلد و داغِ ہجرِ خویش در دلہا سپرد

زد رقم سالِ رحیلش، کلکِ ناسخِ حزیں ۔۔۔ "وائے! حیف و آہ! شہزادہ بشیر الدین بمرد"
۱۳۰۲ھ

دوسری تاریخ ہے "رونقِ فردوس توفیق" (۱۳۰۲ھ)۔

توفیق کے علاتی بھائی شاہزادہ اعظم الدین بھی شاعر تھے۔ سلطان تخلص تھا۔

فارسی کے چند شعر ملے ؎

دلے آزادہ داری، ازیں خوشتر چہ می خواہی ۔۔۔ درونے سادہ داری، ازیں خوشتر چہ می خواہی

تو اے عاشق بار اشکِ سرخ در پیمانۂ چشمت ۔۔۔ مصفّا بادہ داری، ازیں خوشتر چہ می خواہی

چرا روشن نگردانی شبِ تاریکِ عاشق را ۔۔۔ جبینے ہمچو پروین، عارضے ہمچو قمر داری

شدی توفیق گر بے بہرہ، با گردونِ دوں مستیز ۔۔۔ زفیضِ طبعِ گوہر ریز، گنجے از گہر داری

ندیدہ است کس از شاخِ خشک میوۂ تر ۔۔۔ بجز قلم کہ دہد میوۂ تر و شیریں

{نگارستانِ سخن، ص ۱۸۔ ۱۹، ۴۰؛ خمخانۂ جاوید (۲)، ص ۱۵۲۔ ۱۵۳}

ہزبر تخلص تھا، جرنیل فریدوں قدر میرزا محمد ہزبر علی بہادر فرزند سلطان عالم واجد علی شاہ کا۔ ۱۲۶۱ھ میں پیدا ہوئے (جو آں اختر تاریخ ولادت ہے)۔ مدتوں مٹیا برج کلکتہ میں مقیم رہے۔ سلطان عالم ہی سے اصلاح لیتے تھے۔ (بزمِ سخن، ص ۱۲۰۔ ۱۲۱)۔

ثاقب ـــــ میرزا شہاب الدین احمد خاں دہلوی

نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر رخشاں کے بڑے صاحب زادے تھے۔ ۱۸۴۰ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم و تربیت شروع سے اپنے والدِ عالی مقدار کی نگرانی میں پائی، جس سے بہت جلد اپنی ظاہری اور باطنی خوبیوں کے باعث اقران و اماثل میں ممتاز ہو گئے۔ اُن کی بیدار مغزی اور قابلیت کا اعتراف، حکومتِ انگریزی نے بھی کیا اور عین نوجوانی میں اُنھیں دہلی میں آنریری مجسٹریٹ مقرر کر دیا۔

افسوس کہ بہت کم عمری میں انتقال کیا۔ صحت مدت سے خراب رہتی تھی۔ غالب کی وفات کے دو مہینے کے اندر اندر ۱۹ اپریل ۱۸۶۹ء (۶ محرم ۱۲۸۶ھ) کو دوشنبہ کے دن، عصر کے وقت وفات پائی۔ تپ دق بہت دن سے لاحق تھا۔ ہر طرح کے علاج کیے، لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا بلکہ حالت روز بروز بد سے بدتر ہوتی گئی۔ موت سے چند دن پہلے اسہال کا حملہ ہوا۔ دن میں بیس بیس، تیس تیس اجابتیں ہوئیں۔ جس نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ وفات کے وقت صرف ۲۹ برس کی عمر تھی۔ قدم شریف میں اپنے چچا نواب شمس الدین احمد خاں والیِ فیروز پور جھرکہ کے پہلو میں دفن ہوئے۔ قربان علی بیگ خاں سالک نے تاریخ کہی۔

از صدمۂ مرگِ ثاقبِ والا جاہ — ہر سو است نالہ ہائے جانکاہ
تاریخِ وفاتِ او چنیں سالک گفت — "روزِ ششم، مہِ محرم، صد آہ"
۱۲۸۶ھ

نساخ نے تاریخ لکھی:-

مر گئے آہ! شہاب الدین خاں — غم میں ہیں سب مومن و کافر
سال لکھا خامے نے وائے — حیف! شہاب ثاقب نیّر
۱۲۸۶ھ

نواب شمس الدین احمد خاں کی بیاہتا بیوی (جانی بیگم بنت مرزا مغل بیگ خاں) سے

دو لڑکیاں ہوئی تھیں۔ احمد النساء بیگم اور محمد النساء بیگم۔ احمد النساء بیگم، نواب عبدالرحمٰن خاں والی جھجر کے چچازاد بھائی نواب سعادت علی خاں کے نکاح میں آئیں۔ انھیں کی بڑی صاحبزادی سکندر جہاں بیگم سے ثاقب کا نکاح ہوا تھا۔ ثاقب نے اپنے پیچھے چار صاحبزادے (شجاع الدین احمد خاں تاباں[1]، بہاء الدین احمد خاں طلب، سراج الدین احمد خاں سائل[2] اور ممتاز الدین احمد خاں مائل) اور ایک صاحبزادی (اختری بیگم) اپنی یادگار چھوڑی۔ صاحبزادی کا نکاح نواب سر امیر الدین احمد خاں والیِ لوہارو سے ہوا۔ چاروں بیٹوں کو شاعری ورثے میں ملی۔ تاباں اور سائل نے تو اچھی خاصی شہرت حاصل کی۔

ثاقب تخلص غالب کا دیا ہوا تھا، جو شہاب کی مناسبت سے ہے۔ "زبان کا کیا ذکر

---

[1] ۲۲ر دسمبر ۱۸۶۱ء کو پیدا ہوئے۔ فارسی میں خاصی دستگاہ رکھتے تھے۔ پہلے حسین علی خاں شاداں سے، پھر داغ سے مشورہ کیا۔ نہایت مشاق اور زود گو تھے۔ شطرنج کا بھی لپکا تھا۔ ان کا نکاح باقر علی خاں کامل کی صاحبزادی محمد سلطان بیگم (عرف جندو بیگم) سے ہوا تھا۔ تاباں نے ۱۶ اپریل ۱۹۲۸ء کو انتقال کیا۔ مہرولی میں صندل خانۂ مرزا بابر میں مدفون ہیں۔

[2] ۲۰ر شوال ۱۲۸۰ھ (۲۹ مارچ ۱۸۶۴ء) تاریخ پیدائش ہے۔ "مرزا سراج الدین احمد خاں" سے تاریخ ولادت برآمد ہوتی ہے۔ مجروح، ارشد، داغ تینوں سے استفادہ کیا۔ ان کی پہلی بیوی نمولا بیگم، نواب ممتاز حسین خاں والیِ پاٹودی کی ہمشیرہ تھیں۔ ان سے انقطاع کے بعد دوسرا نکاح داغ کی لے پالک بیٹی لاڈلی بیگم سے ہوا۔ داغ ہی سے تلمذ تھا۔ استاد کے پاس بہت دن تک حیدرآباد میں مقیم رہے۔ اسی زمانے میں وہاں سے ایک رسالہ معیار الانشا بھی نکالتے رہے تھے۔ اپنی خاندانی روایات کے مطابق شاہ ملا مذاق (شاگرد ذوق) سے بیعت بھی تھے۔ ۱۵ ستمبر ۱۹۴۵ء کو ۸۰ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ مجموعۂ کلام شائع نہیں ہوا اور نہ اب شائع ہونے کی کوئی امید ہے۔ فرماتے تھے اپنی عمر میں ایک لاکھ کے قریب شعر کہے ہوں گے۔ ایک ضخیم مثنوی نور علیٰ نور جس میں نور الدین جہانگیر اور نور جہاں بیگم کی حیاتِ معاشقہ کا بیان ہے، نامکمل رہ گئی۔ اب بھی اس میں آٹھ دس ہزار شعر سے کم نہ ہوں گے۔ یہ بھی اپنی خاندانی ہڈوار، صندل خانہ مرزا بابر ہی میں دفن ہوئے۔ تاریخ ہوئی "بہ جنت جانشینِ داغ آسود" (تمنا)

کہ وہ ان کے گھر کی لونڈی ہے۔ کلام میں مضمون آفرینی کی کوشش کرتے ہیں۔ معاملہ خوب لکھتے ہیں تصوف اور اخلاق کی چاشنی بھی موجود ہے۔

کیوں وعدہ کرو، بے خبر آجاؤ کسی وقت ہوں وصل کا خواہاں، نہیں مشتاق خبر کا

گھر بیاباں میں بنایا نہیں ہم نے، لیکن جس کو گھر سمجھے ہوئے تھے وہ بیاباں نکلا

کیا چیر کے سینہ دل دکھائیں کچھ حال سنو، تو ہم سنائیں

تے نہیں یاں اگر، نہ آئیں اے کاش! مجھے وہاں بلائیں

ہم سینہ سپر کیے کھڑے ہیں وہ شوق سے خنجر، آزمائیں

جو کام میں غیر کے ہوئیں صرف افسوس، وہ دل رُبا ادائیں

اے بخت! کہاں تلک بُرائی اے چرخ! کہاں تلک جتائیں

کل میں نے کہا، کہ بندہ پرور ق چہرے سے نقاب آپ اُٹھائیں

کہتے ہیں ادا شناس باہم "اچھا ہو جو رُخ، تو کیوں چھپائیں"

بولے "ہُدہُد داور موسیٰ و طور سُن لی ہو، تو دیکھنے کو آئیں

بسم اللہ! ہم اُٹھائیں پردہ پر اُن سے کہو کہ تاب لائیں"

نہیں عقل سے عشق خالی، کہ اس میں بڑے تجربے ہم کو حاصل ہوئے ہیں

غلط فہم ہیں، عاشقانِ مجازی کہ محوِ تماشائے محمل ہوئے ہیں

رہیں گے گرفتارِ صورت پرستی اگر حسنِ معنی سے غافل ہوئے ہیں

نہ بیٹھیں، نہ ہوں قتل، انصاف یہ ہے کہ ہم خود بد آموزِ قاتل ہوئے ہیں

ہمیں ذوقِ صحرا نوردی ہے، ثاقب! نہ سمجھو، کہ جویائے منزل ہوئے ہیں

رنجش سے گر کہا ہو، تو ایماں نہ ہو نصیب کافر بتوں کو کہتے ہیں عشاق پیار سے

فکرِ وصال و ہجر کا صدمہ اُٹھائیے اس چند روزہ زیست میں کیا کیا اٹھائیے

بیٹھے ہیں ہم تو اب دلِ بے آرزو لیے وہ دن گئے کہ داغِ تمنا اُٹھائیے

ثاقب! وہ ضبطِ اشک کو سمجھے ہیں بے غمی　　　یہ رو دیجئے، کہ شورشِ دریا اُٹھائیے

[اکمل الاخبار ۴: ۱۶ / ۲۶ - اپریل ۱۸۶۹) بزمِ خانۂ جاوید '

(۲) ص ۱۶۶ - ۱۷۰]

جمؔ ـــــ نواب سید محمد جمشید علی خاں بہادر مراد آبادی

مراد آباد کے عمائد میں سے تھے۔ شاہی میں ان کو مشیر الدولہ سفیر الملک کا خطاب ملا تھا۔ سلسلۂ نسب آٹھویں امام حضرت علی رضا علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ مولانا محمد صالح جو بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے اتالیق تھے اور بعد میں فتاویٰ عالمگیری کے مولفوں میں بھی شامل رہے، جمؔ کے مورثِ اعلیٰ تھے۔ ان ہی خدمات کے عوض میں شاہجہاں نے انھیں پرگنہ حسن پور (ضلع مراد آباد) میں محمد آباد اور سات آٹھ اور گانوٗ دوامی جاگیر میں عطا کیے تھے۔ یہ جاگیر ۱۸۶۴ء تک اس خاندان میں رہی پھر انگریزی حکومت نے اُسے ضبط کر لیا۔

جمؔ کے دادا کا نام قاضی ظفریاب خاں تھا۔ والد قاضی ولایت علی، درجہ اول کی سند حاصل کر کے مراد آباد ہی میں وکالت کرتے رہے۔

جمؔ اچھے صاحبِ علم تھے، اُردو فارسی دونوں زبانوں سے مزاولت تھی۔ تاریخ اور صحافت سے خاص شغف تھا، ایک زمانے تک اخبار "جام جمشید" اور "روہیلکھنڈ پنچ" نکالتے رہے۔ ایک اخبار "بلند اختر" کا بھی اہتمام کرتے تھے۔ پھر ریاست جے پور میں عدالتِ فوجداری کے سررشتہ دار ہو کے چلے گئے۔ چندے ریاست کوٹہ میں حاکم اپیل بھی رہے۔ ریاست جے پور میں ان کی بہت قدر و منزلت ہوئی۔

ان کے بڑے صاحبزادے سید عبدالعلی صاحب بھی اپنے والد کے نقشِ قدم پر تھے۔ شاعر بھی تھے اور اخبار نویس بھی۔ عابد تخلص تھا اور داغ کے مشہور شاگردوں میں سے تھے۔ پہلے "جامِ جمشید" کے ایڈیٹر رہے۔ پھر اپنا ایک اخبار "مخبرِ عام" جاری کیا۔

اے مجمعِ بحرینِ دولت عدل و کرم را ۔۔۔ وے مطلعِ سعدین دَرت عِلم و عَلَم را

از روے تو شد صبحِ وطن، شامِ غریباں ۔۔۔ وز کوے تو شد داغِ دل، باغِ ارم را

ممنونِ تو ہر شیخ و برہمن بود، آرے ۔۔۔ شمع ست گلِ باغِ کرم دیر و حرم را

از شابِ دل روشنت اے نورِ جوانی ۔۔۔ برزد بزمن پیرِ فلک ساغرِ جم را

از فیضِ تو خون خشک شدہ در تنِ حاتم ۔۔۔ وز عدلِ تو دل تر شدہ کسرائے عجم را

شاہِ انجم چو شود رونقِ اورنگِ حمل ۔۔۔ سازد از فیضِ نظر فرشِ زمیں را مخمل

شاہدِ گل شود از ناز و ادا جلوہ فروش ۔۔۔ بلبلانِ چمن از شوق بخوانند غزل

ساغرِ لالہ گر ایں گونہ دہد ساقیِ شوخ ۔۔۔ چہ عجب شوقِ گرفتن بکند پنجۂ شل

چشم از عکسِ چمن سرخ شود ہمچو شفق ۔۔۔ طبع از گل بستاید ہمہ لبریز بغل

تھا خفتہ یہیں شب مست مے جامِ الم کا ۔۔۔ اک دولتِ بیدار کا رخ خواب میں چمکا

سر تا بقدم غیرتِ خورشید تھی پیکر ۔۔۔ تھا حسنِ حسینانِ جہاں عکس قدم کا

بکھرے ہوئے بالوں میں وہ عارض کے تھے جلوے ۔۔۔ گویا کہ گھٹا سے تھا کوئی چاند سا چمکا

ابرو کا وہ عالم تھا کہ تھی تیغ سیہ تاب ۔۔۔ کشتہ تھا دلِ راست ہر اک جلوۂ خم کا

آتی ہے مگر کوچۂ جاناں سے یہ اے جم ۔۔۔ دامن ہے معطر جو نسیمِ سحری کا

ہے نامۂ اعمال مرا سامنے میرے ۔۔۔ کہتا ہوں جسے اے دلِ مضطر شبِ فرقت

[قصاید مدحیہ نظام، ص ۲۰۱-۲۲۵؛ خم خانۂ جاوید (۵) ص ۹۵ھ-۹۶ھ؛ تاج التواریخ (حصہ اخبارات) ص ۶-۷]

جنوںؔ ــــــ خان بہادر قاضی عبدالجمیل بریلوی

خاندان کا سلسلہ خلیفۂ ثالث حضرت عثمانؓ سے ملتا ہے۔ ان کے آبا و اجداد شاہانِ مغلیہ کے زمانے میں مصر سے ہندوستان آئے۔ حکومتِ وقت کی طرف سے ان کی مناسب آؤ بھگت ہوئی اور وہ اعلیٰ عہدوں پر ممتاز رہے۔ آخر میں بریلی کی قضائت ان کے خاندان کے سپرد ہوئی۔ ان کے اجداد میں سے قاضی ثناء اللہ اپنے علم و فضل اور تدبر و فراست کے باعث نواب شجاع الدولہ کے خاص معتمد علیہ تھے اور انھیں جاگیر اور معقول وظیفہ ملتا تھا۔ ان کے انتقال (۱۱۸۷ھ) کے بعد قاضی غلام نبی ان کے جانشین ہوئے۔ دربار اودھ اور سرکار انگریزی دونوں جگہ ان کی قدر و منزلت تھی۔ ان کا ۱۶ دسمبر ۱۸۱۲ء کو انتقال ہوا۔ اور ان کے بیٹے قاضی غلام احمدؒ ان کے قائم مقام ہوئے۔

قاضی غلام احمدؒ بھی صاحبِ علم ہونے کے باعث حکومتِ وقت کی طرف سے موردِ اعزاز و اکرام ہوئے۔ صدر الصدور اور جسٹس آف کورٹ کے عہدے ملے متعدد مرتبہ خلعت عطا ہوئے۔ ۲۰ اگست ۱۸۳۸ء کو یہ راہیِ ملکِ جاودانی ہوئے، تو قاضی عبدالجلیل ان کے بڑے بیٹے اس وقت صدر امین تھے۔ اس لیے اُنھوں نے عہدہ قضائت سے بطیبِ خاطر دست برداری دے دی اور اپنے چھوٹے بھائی قاضی غلام حمزہ کو اس پر مقرر کرا دیا اور خود صدر امین ہی رہے۔ انگریزی پنشن جو اب تک ذاتی چلی آتی تھی، اُن ہی کے زمانے میں موروثی ہوئی۔ ان کی وفات ۴ دسمبر ۱۸۷۰ء (۱۰ رمضان ۱۲۸۷ھ) کو ہوئی۔ یہی ہمارے صاحبِ ترجمہ جنوںؔ کے والد بزرگوار تھے۔

قاضی عبدالجمیل ۱۸۳۵ء (۱۲۵۱ھ) میں پیدا ہوئے۔ کتب درسیہ صدر الصدور مفتی عنایت اللہ (مصنفِ تواریخ حبیب اللہ) سے پڑھیں۔ علوم ریاضیہ میں بھی دست گاہ

کامل تھی۔ فارسی اور عربی میں منتہی کا درجہ حاصل کیا۔ ان کے اسلاف کی طرح حکومت نے ان کی بھی بہت آؤ بھگت کی اور انھیں عہدۂ قضا پر فائز کیا۔ ۱۸۹۸ء میں خان بہادر کا خطاب ملا۔ ۲۰ مئی ۱۹۰۰ء کو انتقال کیا۔ اردو کلام پر مرزا غالب سے اصلاح لی۔ ان کے ذاتی تعلقات اپنے استاد سے بہت عقیدت مندانہ تھے اور استاد بھی ان سے بہت شفقت اور محبت کا سلوک کرتے تھے۔ غالب کی کتاب دستنبو کا دوسرا اڈیشن انہی کی نگرانی میں بریلی سے شائع ہوا تھا۔

ان کے بڑے صاجزادے قاضی محمد خلیل بھی شاعر تھے۔ حیرآن تخلص کرتے تھے۔

افسوس جنوںؔ کا کلام ضائع ہو گیا۔ اُنھوں نے کبھی اس کی ترتیب کی طرف توجہ ہی نہیں کی بلکہ آخری زمانے میں تو شعر و شاعری سے طبیعت کچھ اُچاٹ سی ہو گئی تھی۔

کچھ آیا راہ پہ، شاید وہ بدگماں میرا | کہ رات، ذکر بہت کچھ رہا وہاں میرا
یہ کیا کہ غیر نے جو کچھ کہا، بجا ہے وہی | مری زبان سے سُنتے، مگر بیاں میرا
جنوںؔ نے جور کا شکوہ کیا، تو کہتے ہیں | کہاں کو چھوڑ کے جاؤ گے آستاں میرا

جو حسین ہم کو ملا، کافر بے دین ہی ملا | جس کو دیکھا اُسے غارت گرِ ایماں دیکھا
نہ ہوا خندۂ بے وجہ، گوارا گُل کا | ہم نہ کہتے تھے، نہ کر سیرِ گلستاں دیکھا

کہاں یہ تاب کہ آنکھیں ملا سکوں تجھ سے | کہ اک نگہ میں دگرگوں ہے حال محفل کا

دیکھ کر اس بت کو، کیا کہیے، کہ کیا یاد آ گیا | ہم کو اس کی بے نیازی سے خدا یاد آ گیا
میں جو رخصت ہو کے اُن سے، پھر گیا تو یوں کہا | کیوں گئے، کیوں آئے، کیا بھولے تھے، کیا یاد آ گیا؟

ہے سرِ شام ہی سے بھاری رات | ہائے کیسے کٹے گی ساری رات

سرسری تھا گلۂ جور و جفا، اے جاں! | تم پشیماں نہ کرو مجھ کو پشیماں ہو کر

سامنے سے یوں نکل جاتے ہیں وہ | اُن سے گویا کچھ شناسائی نہیں

نہ بھی لطف و عنایت، ستم و جور ہی ہو | غم تو یہ ہے کہ نہیں حال کا پُرساں کوئی

غم تو یہ ہے، کہ میں نے ان سے بات   کیوں کہی، دل کی بے قراری کی

ہجر میں کون تھا، مرا ہمدرد   کچھ ترے غم نے غمگساری کی

اے جنوں! مر کے اس ستم گر پر   قدر بھی کھوئی، جاں نثاری کی

[ماہنامہ کمال (دہلی) جنوری ۱۹۱۲ء؛ غم خانۂ جاوید (۲)

ص ۲۷۶-۲۷۷]

جوہر ——— منشی جواہر سنگھ دہلوی

غالب کے ان کے والد رائے چھج مل سے بہت دوستانہ تعلقات تھے۔ چنانچہ جس زمانے میں وہ کلکتے گئے ہیں رائے چھج مل ہی کو اپنے معاملات کی دیکھ بھال سونپ گئے تھے۔ رائے صاحب موصوف فارسی بہت اچھی جانتے تھے اور غالب کے بہت قدردان تھے۔ ان کا انتقال ۱۲۷۷ھ (۱۸۶۰-۱۸۶۱ء) میں ہوا، تو غالب نے تاریخ وفات کہی ؎

گویند، رائے چھج مل شیریں کلام مرد   دیرینہ دوست رفت، ازیں تنگ نادریغ

گفتم، کسے ز سالِ وفاتش نشاں دہد   غالب شنید و گفت چہ گویم: "بسا دریغ"
۱۲۷۷ھ

منشی جواہر سنگھ انگریزی عملداری میں تحصیلدار تھے۔ یو۔پی اور پنجاب کے مختلف اضلاع میں رہے۔ غالب نے ایک رباعی میں ان کا خاص طور سے ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

تا میکش د جوہر دو سخن ور داریم   شانِ دگر و شوکتِ دیگر داریم

در میکدہ پیریم، کہ میکش از ماست   در معرکہ تیغیم، کہ جوہر داریم

جوہر صرف فارسی کہتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دیوان چھپا تھا لیکن دیکھنے میں نہیں آیا۔ ان کی ایک غزل اردوے معلےٰ میں ہے۔ اُسی کے چند شعر ملاحظہ ہوں:-

بہ حیرتم کہ ز دوزخ، کسانِ دوزخ را | کجا برند، چو آہم شرارہ بار افتد
نہ گبرم ونہ مسلماں، بہ حیرتم کہ مرا | سواے دوزخ و مینو کجا گزار افتد
قرار در وطن، افسردہ می کند، دل را | خوشا غریب! کہ دور از دیار بیار افتد
ترا کہ شیوہ دگرگوں کنی، بہ زعمِ بتاں | خوش ست، گر نہ جفا بر وفا قرار افتد
چکد ز خامۂ جوہر، سخن چناں کہ مگر | بزورِ موج، دُر از بحر، بر کنار افتد

اردوے معلیٰ کی تاریخ طبع کہی ؎

چو اردوے معلیٰ گشت تالیف | ہمانا یک جہاں گردید طالب
پےِ سالِ مسیحائیٔ طبعش | بگو جوہر "خجے اُردوے غالب"
(۱۸۶۹ء)

قاطع برہان (غالب) کی تاریخ کہی ؎

ایں نسخہ کہ غالباً چو او دیگر نیست | تالیفِ حریفِ غالبِ دوراں ہست
جوہر ایں گفت سالِ طبعش طبعم | زیبا فرہنگ قاطعِ برہاں ہست
۱۲۷۸ھ

تو در رہِ کرم بہ سرم گزار غلط | من در رہِ نشستن بہ انتظار غلط
برو، بزہد بد آموزیم مکُن، زاہد! | من و ز شاہد و مے توبہ در بہار غلط
بعمر در خورِ پرسش نیم مگر وقتے | شود بکلبۂ من راہِ آں نگار غلط
بر آں سرم، کہ دگر باکسے نیامیزم | اُمیدِ لطف ز یارانِ روزگار غلط

[اردوے معلیٰ، ص ۲۹۳-۲۹۴؛ سبدِ باغِ دو در؛
گلستانِ سخن، ص ۱۹۰؛ قاطع برہان، ص ۹۷]

جوہر ــــــ حکیم محمد معشوق علی خاں شاہجہانپوری

روہیل کھنڈ کے ایک معزز اور مشہور خاندانِ افاغنہ کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے جدِ اعلیٰ محمد عمر خان عرف عمر بابا ولایت کابل کے سرحدی قصبہ چمکنی کے رہنے والے تھے۔ جسے غوریا خاں کے پسر چہارم چمکنی خاں نے اپنے نام پر آباد کیا تھا۔ عمر بابا خود بھی اسی چمکنی خاں کی نسل میں سے تھے۔ اُن کی ریاضت و عبادت اور زہد و ورع کی بنا پر اُن کے معاصر اُن کا بہت اعزاز و اکرام کرتے تھے۔ عمر بابا کا مزار نواحِ چمکنی میں اب تک مرجعِ انام ہے۔ سب سے پہلے انہی عمر بابا کے صاحبزادے محمد ابراہیم خاں آغازِ شباب میں نواب بہادر خاں کے ہم رکاب شاہجہاںپور آئے اور یہیں بس گئے۔

محمد معشوق علی خاں جوہر کے والد کا نام اصغر علی خاں تھا۔ جوہر ۱۸۵۲ء میں شاہجہاںپور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ پھر دہلی اور لکھنؤ میں طب کی تکمیل کی۔ ۱۸۸۱ء سے ۱۸۸۷ء تک ریاست ڈیرہ (ضلع سلطان پور) میں ملازم رہے۔ یہاں سے نکلے تو ریاست بھوپال میں بزمرۂ وکلاء مختاری شامل ہوگئے۔ یہاں نہایت خوش حالی سے بسر ہوتی تھی۔ حکمران خاندان سے بھی اچھے تعلقات تھے، جیسا کہ اُن کے متعدد قصائد سے ظاہر ہوتا ہے۔ چونکہ وہ اکثر مشاعرے کرتے رہتے تھے، اس لیے بھوپال اور اس کے اطراف میں ان کے باعث اُردو زبان کو بہت ترقی ہوئی۔

۱۹۰۸ء میں بھوپال سے مولوی محمد عزیز مرزا ہوم سکریٹری کے ساتھ حیدرآباد دکن آئے جو بھوپال میں اُن سے ذیابطیس کا علاج کرانے آئے اور صحت یاب ہوگئے تھے غالباً بعد میں اُنھیں کے توسط سے اُن کی، قدر دانِ علم و فضل مہاراجہ سرکشن پرشاد مرحوم مدار المہام تک رسائی ہوئی۔ جوہر نے بوقتِ ملاقات ایک قصیدۂ غرّا نذر گزرانا، جس کے صلے میں مہاراجہ بہادر نے قدر افزائی کے علاوہ اُنھیں ریاست کی عدالتِ عالیہ (ہائی کورٹ)

کی سندِ وکالت بھی عطا فرمائی اور اس طرح آپ یہیں کے ہو رہے۔ مدّت دراز کی غیر حاضری کے بعد ۱۹۲۷ء میں اپنے وطن شاہجہانپور واپس آ گئے یہیں ایک ہفتہ کی مختصر علالت کے بعد بمرض اسہال اگست ۱۹۲۸ء میں انتقال کیا۔ ہوش و حواس آخر تک قائم رہے، بلکہ اپنی تجہیز و تکفین کا انتظام خود بحالتِ مرض کیا۔ بعد رحلت اپنے آبائی قبرستان واقع محلہ کارٹی پورہ میں متصل مزارِ حضرت اسحاق خاںؒ سپردِ خاک ہوئے۔

اولاد میں دو صاحبزادے۔ جناب حامد علی خاں حامدؔ اور محمود علی خاں بسلسلۂ ملازمت اورنگ آباد دکن میں موجود ہیں۔ خاندان کے بقیہ افراد شاہجہانپور میں ہیں۔

جوہرؔ طبابت میں بھی بہت اچھی دستگاہ رکھتے تھے، اگرچہ طبابت کو بطور پیشہ اختیار نہیں کیا۔ اُن کے دو دیوان۔ اردو اور فارسی مرتب شدہ ان کے خاندان میں موجود ہیں۔ اردو میں بلا مبالغہ سینکڑوں قصیدے اور قطعے ہیں۔ بہت قادر الکلام اور زود گو تھے۔ سو پچاس شعر کا قصیدہ ایک مختصر نشست میں کہہ لینا ان کے لیے کوئی بات ہی نہیں تھی۔ اردو اور فارسی اور عربی کے علاوہ ہندی بھی بہت اچھی جانتے تھے۔ اگرچہ جدّت اور تازگی اُن کے کلام کی خصوصیت نہیں لیکن اس کے باوجود وہ لُطف سے خالی نہیں۔

اب کلام کا مختصر انتخاب ملاحظہ ہو۔

غربت کی آفتوں کا گلہ کس لیے کریں ۔۔۔ اے ہم نشین! پائی بھی راحت وطن میں کیا

پیرِ مغاں کا کس لیے ملتا نہیں دماغ ۔۔۔ فصلِ بہار آ ہی گئی ہے چمن میں کیا

دیکھی کبھی خزاں، کبھی موسم بہار کا ۔۔۔ کیا اعتبار ہو چمنِ روزگار کا

شیخ جی ہاتھ تو موقع سے لگے تھے لیکن ۔۔۔ کچھ سمجھ بوجھ کے رندوں نے مگر چھوڑ دیا

گردن پہ وہ رکھ رکھ کے اُٹھا لیتے ہیں خنجر ۔۔۔ کچھ کچھ ہے محبت کی جھلک طرزِ جفا میں

بربادیِ گلشن پہ ہیں، گل چاک گریباں ۔۔۔ پیدا اثرِ درد ہے، غنچوں کی صدا میں

تکلیف نہیں کوئی بھی ہر چند قفس میں
لیکن ہے یہ کہنے کو کہ ہیں بند قفس میں

دم گھٹتا ہے، گھبراتا ہے دل، ہوش ہیں اُڑتے
دشمن کو بھی رکھے نہ خداوند قفس میں

دردِ منت کشِ فریاد نہیں ہے، جوہرؔ!
ورنہ اوروں کی طرح، ہم بھی زباں رکھتے ہیں

تصور بھی دلِ ویراں میں اب آتا نہیں اس کا
کوئی اُجڑا ہوا گھر بھی کہیں آباد ہوتا ہے

گذرے مجنوں کو مدتیں گذریں
دشتِ وحشت میں آج ہو ہے وہی

پھر مرے چھیڑنے کی باتیں ہیں
پھر رقیبوں سے گفتگو ہے وہی

یوں زمانے میں ہیں حسیں لاکھوں
جس کو جی چاہے، خوبرو ہے وہی

دل نہیں مانتا ہے، اے ناصح!
تو ہی بتلا کہ کیا کرے کوئی

یہ ایک جام، اور اُس میں بھی تھوڑا سا کچھ کم
نہ آئی دیتے ہوئے بھی تجھے حیا ساقی

اب فارسی کے چند شعر دیکھیے۔

ہر قدم قیس کہ در دشتِ جنوں زا انداخت
بہرِ وحشت زدگاں جادہ بصحرا انداخت

قیس چوں رفت ازیں غم کدۂ کون و فساد
بارِ سودائے محبت، بہ سرِ ما انداخت

روزیکہ دیدمت، شدم مبتلائے تو
گنجد بہ چشمِ من نہ کسے ماسوائے تو

بنگر وفائے من کہ چہا بر سرم گذشت
گاہے نہ حرف شکوہ زدم، از جفائے تو

دردِ دل را، جز بلطفت نیست ممکن راحتے
از ترحم، بر گدائے خود نظر کن ساعتے

بندہ ام، لیکن زنافرمانیت شرمندہ ام
از خلوصِ دل گہے ہرگز نہ کردم طاعتے

ما گدائے بے نوایم، بوریا مارا بس است
بود تختِ سلطنت بہرِ سلیمان راحتے

از وفورِ رحم نعمت ہا عطا کردی بمن
من ادائے شکر را ہرگز ندارم طاقتے

[آثار الشعرا، ۱۸۹-۱۹۰؛ خم خانۂ جاوید (۲) ۳۰۸-۳۱۰]

[جوہر]

حالیؔ ـــــــــ شمس العلماء مولانا الطاف حسین انصاری پانی پتی

مولانا حالی ۱۸۳۶ء (۱۲۵۳ھ) میں پانی پت کے "محلہ انصار" میں پیدا ہوئے نجیب الطرفین تھے۔ مادری سلسلہ ۳۴ واسطوں سے حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر منتہی ہوتا ہے۔ پدری سلسلہ میں ۲۹ واسطوں کے بعد جدِ اعلیٰ حضرت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور صحابی حضرت ایوب انصاری رضی اللہ عنہ تھے۔ ان کے پدری سلسلے میں حضرت شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری پیر ہرات تھے۔ اس خاندان میں سب سے پہلے خواجہ ملک علی ہروی غیاث الدین بلبن کے زمانے (۱۲۶۶ - ۱۲۸۷ء) میں ہندستان آئے۔ یہ اپنے وقت کے مشہور عالم تھے۔ یہاں پہنچنے پر حکومتِ وقت کی طرف سے پانی پت کے قاضی مقرر ہوئے۔ اس کے علاوہ منڈی میں اجناس کے نرخ مقرر کرنے کا اختیار بھی حاصل تھا مگر خاندان کی یہ ظاہری شان و شوکت حالی سے پہلے ہی ختم ہو چکی تھی، بلکہ اُن کے والد خواجہ ایزد بخش نے بھی اس جاہ و مال سے کچھ نہ پایا اور ساری عمر عسیر الحالی میں بسر کر دی۔ یہ نو برس کے تھے جب ۱۸۴۵ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ والدہ کو اس سے پہلے ہی کوئی دماغی عارضہ لاحق ہو چکا تھا۔ جس سے وہ بھی ان کی دیکھ بھال سے قاصر تھیں۔ چنانچہ اس کے بعد ان کی تعلیم و تربیت ان کے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین منظہر اور بڑی بہن کے سپرد ہوئی۔

زمانے کے رواج کے مطابق ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ پہلے قاری حافظ ممتاز علی کی نگرانی میں قرآن کریم حفظ کیا۔ پھر میر ممنونؔ کے بھتیجے یا بھانجے (اور داماد بھی) سید جعفر علی سے فارسی اور حاجی ابراہیم حسین انصاری سے عربی کا درس لینا شروع کیا۔ ابھی تعلیم ختم بھی نہیں ہونے پائی تھی، کہ گھر والوں نے ان کی مرضی کے خلاف انھیں خانہ داری کی زنجیروں میں جکڑ دیا۔ لیکن علم کی جو لگن ان کے دل میں تھی۔ تاہل کی ذمہ داریوں نے اس

میں کمی نہیں آنے دی۔ ۱۸۵۴ء میں جب کہ عمر ابھی ۱۷ برس کے لگ بھگ تھی، چپکے سے گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور دہلی جا پہنچے۔ اس دور کی دہلی گویا علم و فضل کا گہوارہ تھی۔ دور و نزدیک کے مشہور اور قابل علما نے یہاں حلقہ ہائے درس قایم کر رکھے تھے۔ یہ بھی مولوی نوازش علی[1] کے درس میں شریک ہو گئے اور سال بھر ان کی خدمت میں رہ کے کچھ عربی حاصل کی۔ اسی زمانے میں انھوں نے مولوی فیض الحسن سہارنپوری اور مولوی امیر احمد (اور شمس العلماء میاں نذیر حسین سے بھی) عربی پڑھی۔ اس کے بعد عزیزوں کے اصرار پر، اگرچہ وہ دہلی میں مزید نہ رہ سکے اور واپس پانی پت چلے آئے۔ لیکن یہاں وطن میں بھی انھوں نے تحصیلِ علم اور مطالعے کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ ۱۸۵۶ء میں معمولی مشاہرے پر کلکٹر حصار کے دفتر میں ملازم ہو گئے۔ لیکن اس تعلق کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ بپا ہو گیا اور وہ نوکری چھوڑ کر گھر پر آ گئے۔

"غدر" کے بعد حسنِ اتفاق سے وہ واقعہ پیش آیا جس نے انھیں مولوی الطاف حسین سے حالی بنا دیا۔ ۱۸۶۲ء میں وہ نواب محمد مصطفےٰ خاں شیفتہ کے مصاحب اور ان کے منجھلے صاحبزادے نقش بند خاں مجبور کے اتالیق ہو کر جہانگیر آباد (ضلع بلند شہر) چلے گئے۔ شیفتہ جہاں جید عالم تھے، وہیں اردو اور فارسی کی نظم و نثر کا بھی نہایت پاکیزہ ذوق رکھتے تھے اور جہاں تک نقدِ سخن کا تعلق ہے، اپنے زمانے سے یقیناً بہت آگے تھے۔ حالی کو

---

[1] مولوی نوازش علی اصل میں پونڈلی دیا باڑی (ضلع کرنال) کے رہنے والے تھے۔ دہلی کے علماء سے کتب درسیہ پڑھیں۔ شاہ محمد اسحاق سے حدیث کا سبق لیا۔ دہلی میں کھجور کی مسجد کے قریب سکونت تھی۔ حسین بخش سوداگر کے قائم کردہ مدرسے اور مسجد میں جو جامع مسجد کے جنوبی دروازے کے مقابل کٹرہ گوکل شاہ کے سامنے واقع تھی، ان کا درس ہوا کرتا تھا۔ اپنے زمانے کے مشہور واعظ اور بلند پایہ عالم تھے۔ سرسید بھی ان کے شاگرد تھے۔ انہوں نے درسی کتابیں انھیں سے پڑھی تھیں (تذکرہ اہل دہلی، ص ۱۰۱؛ حیات جاوید (۱) ص ۴۶؛ ایضاً ص ۴۰۸-۱۰، ۴۱۵)

خوش قسمتی سے ایسے یگانۂ روزگار شخص کی مصاحبت میسّر آگئی۔ شیفتہ اُردو اور فارسی میں مومن اور غالب کے شاگرد تھے اور اس عہد کے جملہ اصحابِ کمال اُن کے احباب میں سے تھے۔ چنانچہ حالی کو بھی ان کی معیت میں مفتی صدرالدین خاں آزردہ[1]، میرزا اسداللہ خاں غالب، نواب ضیاءالدین احمد خاں نیّر رخشاں، حکیم احسن اللہ خاں اور دوسرے اربابِ علم و فن سے ملنے کا موقع ملا۔ جوہر قابل تھا۔ شیفتہ جیسے سخن فہم اور سخن سنج کی صحبت نے اسے بیرونی آلائشوں سے پاک کر دیا اور ان نام آور اصحابِ کمال نے اسے جِلا دی۔ وہ خود تحریر کرتے ہیں کہ جب میں پہلی مرتبہ (۵۵-۱۸۵۴ء) بغرضِ تعلیم دہلی آیا ہوں تو ایک دن مرزا غالب کی خدمت میں حاضر ہوا اور انھیں اپنا کلام سنایا، تو انھوں نے فرمایا کہ "اگرچہ میں کسی کو فکرِ شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا، لیکن تمہاری نسبت

---

[1] مفتی صدرالدین خاں کشمیری الاصل اور مولوی لطف اللہ کے بڑے بیٹے تھے۔ ۱۲۰۴ھ (۸۹-۱۷۸۹ء) میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ "چراغ" تاریخ ولادت ہے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، شاہ رفیع الدین دہلوی اور مولوی فضل امام (والد مولوی فضل حق خیرآبادی) سے تعلیم حاصل کی اور خود صاحبِ مسندِ افتا ہوئے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان نے اس جامعیت کے بہت کم شخص پیدا کیے ہیں۔ شاہی میں بھی مسندِ افتا پر فائز تھے۔ انگریزی عہد میں بھی صدرالصدور رہے۔ ساری عمر درس و تدریس میں گذری۔ شاہ جہانی مدرسہ دارالبقا پھر سے زندہ کیا۔ طالب علموں کے تمام اخراجات کے خود کفیل ہوتے تھے۔ ان کے بیسیوں شاگرد مشہورِ عالم ہوئے۔ ان میں سرسید احمد خاں، نواب صدیق حسن خاں (بھوپال) نواب یوسف علی خاں (رام پور) مولانا خیرالدین (والد مولانا ابوالکلام آزاد) مولوی فیض الحسن خاں قابلِ ذکر ہیں۔ ۱۶ر جولائی ۱۸۶۸ء کو وفات پائی۔ "چراغِ دو جہاں بود" اور "وائے چراغِ دین" سے تاریخ نکلتی ہے۔ دہلی سے باہر قطب صاحب کے رستے میں درگاہ روشن چراغ کے احاطے میں آسودۂ خواب ہیں۔

شروع میں چند غزلیں شاہ نصیر کو دکھائیں۔ پھر مجرم اکبرآبادی سے مشورہ کیا اور آخرکار میر نظام الدین ممنون سے اصلاح لی۔ اردو، فارسی، عربی تینوں زبانوں پر یکساں قادر تھے۔ سارا مجموعۂ کلام غدر میں ضائع ہو گیا۔ ایک تذکرہ شعرا بھی مرتب کیا تھا۔ اس کا قلمی نسخہ لندن میں موجود ہے۔

(تذکرہ علمائے ہند، ص ۹۳-۹۴؛ خم خانۂ جاوید (۱) ص ۵۲-۶۱)

میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہیں کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے۔" اس زمانے میں وہ خستہ تخلص کرتے تھے۔ چنانچہ ان کی جو تضمین قدسی کی مشہور نعت پر مجموعہ "حدیثِ قدسی" میں شامل ہے۔ اس میں بھی یہی تخلص ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان ایام میں نہ انھوں نے کچھ زیادہ شعر کہے، نہ باقاعدہ طور پر کسی سے زیادہ اصلاح ہی لی۔ لیکن جب وہ مستقلاً شیفتہ کے پاس جہانگیر آباد آگئے تو یہاں آکے غالباً شیفتہ ہی کے کہنے سے انھوں نے غالب کی شاگردی اختیار کرلی۔ انھوں نے ایک شعر میں اپنے استفادے کا ذکر کیا ہے۔

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفیض ہوں
شاگرد میرزا کا مقلد ہوں میر کا

غالب کی شاگردی نے سونے پر سہاگے کا کام کیا اور حالی جلد ہی میرزا کے دوسرے شاگردوں اور اپنے ہم عصروں سے گوے سبقت لے گئے اور بالآخر خود استادی کا درجہ حاصل کرلیا۔

پس یہ علم و ادب کی انتہائی خوش نصیبی تھی کہ وہ شیفتہ کے ساتھ جہانگیر آباد گئے ورنہ [illegible] معلوم، انھیں وہ مواقع حاصل ہوتے یا نہیں جو انھیں میسّر آئے۔ وہ چھ برس تک شیفتہ کے ساتھ رہے اور ان کی وفات کے بعد یہاں سے نکلے تو مختلف جگہ ہوتے ہوئے ۱۸۷۰ء میں لاہور پہنچے۔ یہاں اس زمانے میں اُردو خاص توجہ کا مرکز بن رہی تھی۔ سررشتۂ تعلیم کے انگریز ڈائرکٹر میجر فلر تھے۔ اور رائے بہادر ماسٹر پیارے لال دہلوی، ایم، اے اُن کے مشیر کار۔ ماسٹر صاحب موصوف نے دہلی سے دعوت دے دے کر ایسے اصحاب کو بلایا، جو محکمے کی ترقی میں کسی طرح معاون ہو سکتے تھے۔ حالی کو یہاں سرکاری بک ڈپو میں ان کتابوں کی زبان درست کرنے کی خدمت سپرد ہوئی۔ جو سررشتۂ تعلیم، انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کروا رہا تھا۔ یہاں سے تقریباً چار برس کی ملازمت کے بعد وہ ۱۸۷۴ء کے اواخر یا ۱۸۷۵ء کے شروع میں دہلی آئے اور اینگلو عربک کالج میں فارسی اور عربی کے مدرس اول مقرر ہوئے۔ سرسید احمد خاں سے ان کی ملاقات یہیں ہوئی، جس کا ثمرہ ۱۸۷۹ء میں مدوجزرِ اسلام یعنی مسدس حالی کی شکل میں ظاہر ہوا۔ ۱۸۸۷ء میں نواب سر آسمان جاہ بہادر وزیر اعظم حیدر آباد دکن ہندستان

کی سیر کے لیے تشریف لائے تو سر سید نے حالی کو ان کی خدمت میں پیش کیا۔ نواب سر آسمان جاہ بہادر نے ازرہِ علم پروری حضور نظام کی سرکار سے امدادِ مصنفین کے صیغہ سے ان کا ۷۵ روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر کرا دیا۔ اس کے بعد ۱۸۹۱ء میں جب یہ کالج وفد کے ہمراہ دکن گئے تو یہ ۷۵ روپیہ سے بڑھا کر سو روپیہ کر دیا گیا۔ چونکہ سو روپیہ ماہانہ ان کی بسر اوقات کے لیے کافی تھا۔ اس لیے یہ ملازمت سے مستعفی ہو کر پانی پت آ گئے اور بقیہ عمر علم و ادب کی خدمت میں بسر کر دی۔ حکومتِ وقت نے ان کی خدمات کا اعتراف یوں کیا کہ ۱۹۰۴ء میں انھیں شمس العلما کا خطاب عطا کیا۔

خواجہ حالی کا نکاح ان کے بچپن ہی میں سید باقر علی کی صاحبزادی اسلام النساء سے ہو گیا تھا۔ اس سے ان کی تین اولادیں زندہ رہیں۔ اخلاق حسین اور سجاد حسین دو بیٹے اور عنایت فاطمہ ایک بیٹی۔ خواجہ اخلاق حسین کی صاحبزادی مشتاق فاطمہ کا نکاح آنریبل خواجہ غلام الثقلین سے ہوا تھا جن کے صاحبزادے خواجہ غلام السیدین (سیکریٹری وزارتِ تعلیم حکومتِ ہند) ہیں۔ صالحہ عابد حسین ان کی بہن ہیں۔ ان کا اصلی نام مصداق فاطمہ ہے۔ اردو کے مشہور افسانہ نگار خواجہ احمد عباس کی والدہ مسرورۃ النساء حالی کے چھوٹے صاحبزادے خواجہ سجاد حسین کی صاحبزادی تھیں۔ ان کا نکاح خواجہ غلام الثقلین کے بھائی خواجہ غلام السبطین سے ہوا تھا۔

۷۷ برس کی عمر میں ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء (۱۳ صفر ۱۳۳۳ھ) کو پانی پت میں انتقال فرمایا۔ اور حضرت شاہ شرف الدین بو علی قلندرؒ کی درگاہ کے صحن میں حوض کے کنارے دفن ہوئے۔

حالی کا کلام کسی تبصرے کا محتاج نہیں وہ نظم و نثر دونوں کے مسلمہ استاد ہیں۔ ان کی نثری کتابیں حیاتِ سعدی، یادگارِ غالب، حیاتِ جاوید، اردو زبان کا مایۂ ناز سرمایہ ہیں تو ان کا دیوان اور مسدس اور نظموں کے مجموعے انھیں صفِ اول کے شاعروں میں معزز جگہ دینے کے لیے کافی ہیں۔ وہ بڑی جامع شخصیت کے مالک تھے۔ "مقدمۂ شعر و شاعری" اور یادگارِ غالب سے فنِ تنقید میں گہری نظر کا پتہ چلتا ہے تو مسدس حالی اور سوانح عمریوں سے ان کے تاریخ کے مطالعہ اور روایت و درایت کی محققانہ

چھان بین کا سراغ ملتا ہے۔ دیوان سے پرانے رنگِ سخن پر قدرت کا اظہار ہوتا ہے، تو مسدس اور متعدد نظموں سے جو انھوں نے انجمن پنجاب کے جلسوں میں پڑھیں ان کی طبیعت کی آزادہ روی اور ترقی پسندی کا میلان نمایاں ہے۔ انھوں نے مولانا محمد حسین آزاد کے ساتھ مل کے ہماری فرسودہ شاعری کو نئی ڈگر پر ڈالنے میں جو خدمت سر انجام دی، وہ کسی طرح بھولنے کی چیز نہیں۔ اردو کے علاوہ عربی اور فارسی میں بھی یکساں دستگاہ تھی۔ اور ان زبانوں میں بھی ان کا مختصر دیوان موجود ہے۔

اردو اور فارسی کلام کا مختصر انتخاب درج ذیل ہے۔

قبضہ ہو دلوں پر کیا اور اس سے سوا تیرا — اک بندۂ نافرماں ہے حمد سرا تیرا

رونا نہ ہوگا، حالی، شاید یہ کم تمھارا — جب دیکھو آنسوؤں سے دامن ہے تر تمھارا

اسی میں ہے خیر حضرتِ دل! کہ یار بھولا ہوا ہے ہم کو — کرے وہ یاد اس کی بھول کر بھی کبھی تمنا نہ کیجیے گا

عشق سنتے تھے جسے ہم، وہ یہی ہے شاید — خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

ہم روزِ وداع اس سے ہنس ہنس کے ہوئے رخصت — رونا تھا بہت ہم کو، روتے بھی تو کیا ہوتا

گر صاحبِ دل ہوتے، سن کر مری بے تابی — تم کو بھی قلق ہوتا اور مجھ سے سوا ہوتا

ملتے ہی اُن کے بھول گئیں کلفتیں تمام — گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا

کچھ میری بے خودی سے تمھارا زیاں نہیں — تم جاننا، کہ بزم میں اک خستہ جاں نہ تھا

رنج اور رنج بھی تنہائی کا — وقت پہنچا مری رسوائی کا

عمر شاید کرے نہ آج وفا — کاٹنا ہے شبِ تنہائی کا

ہوں گے حالی سے بہت آوارہ — گھر ابھی دور ہے رسوائی کا

تم کو ہزار شرم سہی، مجھ کو لاکھ ضبط — اُلفت وہ راز ہے، کہ چھپایا نہ جائے گا

قلق اور دل کا سوا ہو گیا — دلاسا تمھارا بلا ہو گیا

دکھانا پڑے گا مجھے زخمِ دل — اگر تیر اس کا خطا ہو گیا

نہیں بھولتا اُس کی رخصت کا وقت — وہ رو رو کے ملنا بلا ہو گیا

آج امتحاں ہے نالۂ بے اختیار کا — کل ظرف دیکھنا ہے ترے راز دار کا

اک خُو سی ہو گئی ہے تحمل کی، ورنہ اب — وہ حوصلہ رہا نہیں، صبر و قرار کا
آؤ مٹا بھی دو خلشِ آرزوئے قتل — کیا اعتبار، زندگیِ مستعار کا

وہ دن گئے، کہ حوصلۂ ضبطِ راز تھا — چہرے سے اپنے شورشِ پنہاں عیاں ہے اب
آنے لگا جب اس کی محبت میں کچھ مزا — کہتے ہیں لوگ، جان کا اس میں زیاں ہے اب

وصل کے ہو ہو کے ساماں رہ گئے — مینھ نہ برسا اور گھٹا چھائی بہت

اس کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت — نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت
کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل — کل نہ پہچان سکے گی، گلِ تر کی صورت

تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب — بڑھتا ہے اور ذوقِ گناہ یاں سزا کے بعد
گو ہے تند و تلخ، پہ ساقی ہے دل رُبا — اے شیخ! بن پڑے گی نہ کچھ ہاں کہے بغیر

قیس سا پھر کوئی اُٹھا نہ بنی عامر میں — فخر ہوتا ہے گھرانے کا سدا ایک ہی شخص

دل سے خوشیاں ہو گئیں سب گوشہ گیر — نام تھا شاید جوانی کا نشاط
غنچہ چٹکا اور آ پہنچی خزاں — فصلِ گل کی تھی فقط اتنی بساط

خود رفتگیِ شب کا مزا، بھولتا نہیں — آئے ہیں آج آپ میں، یارب کہاں سے ہم
ہنستے ہیں، اس کے گریۂ بے اختیار پر — بھولے ہیں بات کہہ کے کوئی رازداں سے ہم
دردِ فراق و رشکِ عدو تک گراں نہیں — تنگ آ گئے ہیں اپنے دلِ شادماں سے ہم
اب بھاگتے ہیں سایۂ زلفِ بتاں سے ہم — کچھ دل ہی ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم

خوابِ راحت میں وہ لذت تیرے اے پیری نہیں — جو جوانی میں مزا دیتی تھیں شب بیداریاں

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں — اب ٹھہرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں
اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق — رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں
یارب، اس اختلاط کا انجام ہو بخیر — تھا اس کو ربط ہم سے، مگر اس قدر کہاں
ہم جس پہ مر رہے ہیں، وہ ہے بات ہی کچھ اور — عالم میں تم سے لاکھ سہی، تم مگر کہاں

اب وہ اگلا سا التفات نہیں — جس پہ بھولے تھے ہم، وہ بات نہیں
مجھ کو تم سے ہے اعتمادِ وفا! — تم کو مجھ سے پر التفات نہیں

قیس ہو، کوہکن ہو، یا حالیؔ — عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

بے قراری تھی سب اُمیدِ ملاقات کے ساتھ — اب وہ اگلی سی درازیٔ شبِ ہجراں میں نہیں
آدمی ہو تو کبھی پاسِ محبت کے نہ جائے — اب بھی کہتے ہیں، کہ ہم غیر کے نقصاں میں نہیں

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں — مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں
قفس میں جی نہیں لگتا کسی طرح — لگا دو آگ کوئی آشیاں میں
نیا ہے لیجیے جب نام اُس کا — بہت وسعت ہے میری داستاں میں
بہت جی خوش ہوا حالیؔ سے مل کر — ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

اس کے نالوں نے کیا بزم کو آخر بے لطف — ہم نہ کہتے تھے، کہ حالیؔ کو نہ محفل میں بلاؤ

مجھے ڈالا ہے سو وہم و گماں میں — بہت کیوں آج مجھ پر مہرباں ہو
وفا اغیار کی، اغیار سے پوچھ — مری اُلفت در و دیوار سے پوچھ
سخت مشکل ہے شیوۂ تسلیم — ہم بھی آخر کو جی چُرانے لگے
وقتِ رخصت تھا سخت حالیؔ پر — ہم بھی بیٹھے تھے جب وہ جانے لگے

حالیؔ اُٹھا ہلا کے محفل کو — آخر اپنا کہا کیا تو نے

یاد آؤ گے بہت، لطف مجھ پر کیجے — اس بھلائی کا ہے انجام بُرا، یاد رہے

کیوں بڑھاتے ہو اختلاط بہت! — ہم میں طاقت نہیں جدائی کی

کبک و قُمری میں ہے جھگڑا کہ چمن کس کا ہے — کل بتا دے گی خزاں یہ کہ وطن کس کا ہے

یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا — ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

فارسی کے چند شعر بھی ملاحظہ کیجیے:-

من زردویشِ حسنِ معنی دیدہ ام — آنچہ دل بُرد است، آنے دیگر است

چوں منِ غم زدہ ناکام چہ باید زیست — ہر کرا در شبِ راحت غمِ فردائے ہست

بہ طبیعم سازگار افتاد دردش — مرا پرہیز از درماں ضرورست

گر نگیرد، ہمہ عیب است، چہ عیب و چہ ہنر — در پذیرد، ہمہ زیباست، چہ زیبا و چہ زشت

عشق از خویش بریدن می خواست — حالیؔ! از خلق بریدیم عبث

روزِ محشر، کہ ز ہر شیخ و برہمن پرسند — سر دہم قصۂ شوقِ تو، چو از من پرسند
پارۂ بے خبری، نطق مرا در کار است — مے بیارند و ز من نکتۂ ہر فن پرسند
بندہ را نیست مجالِ سخن آنجا، حالی — ورنہ افسانہ دراز است، گر از من پرسند

لطفِ طاعت چہ بود، نیست اگر ذوقِ نظر — نہ پرستم صنمے را کہ خود آرا نبود
مجلسِ وعظ ملامت گہ ما غم زدگاں — کم نشینیم بہ بزمے، کہ مدارا نبود

سازند و بسوزند و گرایند و ربایند — زنہار ازیں قوم کہ پر فتنہ گرانند

آتش زنِ صد خرمن و ویراں کنِ صد کشت — برقے ست، کہ در نرگسِ شہلائے تو باشد
خرسندئے سازی و غم کیں نہ پسندی — ناکام کسے کش سرِ سودائے تو باشد

جاں گدازند بلطف و بغضب شاد کنند — ہر چہ خواہید ازیں عشوہ گراں می آید
بعد ازیں راز بصد پردہ نہاں نتواں داشت — عشق می آید و با طبل و نشاں می آید
دوش چیزے ز سخن ہائے محبت نگذاشت — بجز آں حرف، کہ از دل بزباں می آید
عجب از خود کنم و سوئے فلک می بینم — چوں خدنگِ تو بسویم زکماں می آید

آں گوش کہ پر ز حرف و صوت ست — گنجائیِ رازِ ما ندارد
کارم بہ کسے فتادہ، کز ناز — پروائے نیازِ ما ندارد

عشق اگر کیش ست، ملت ہا کہن خواہد شدن — منبرے ہر گوشہ از دار و رسن خواہد شدن
شکوہ گر بر لب نیاید، عاقبت کیں مے شود — زخم را درماں نباشد چوں کہن خواہد شدن

گر بازوئے ہمت ہست، دستے بگریباں زن — ور پائے ارادت ہست، لختے بہ بیاباں شو
ساقی بہ قدح بخشی گو توبۂ ما بشکن — مطرب بنوا سنجی گو رہزنِ ایماں شو
ہم بادہ دما دم خور، ہم بوسہ پیاپے دہ — بے پردہ تر از گل آ، چوں بوئے گل ارزاں شو

رباعی

سر نہ بدرے و خاک پائے ہمہ باش — دل دہ بہ یکے و دلربائے ہمہ باش
خواہی شوی آشنائے بیگانہ نما — بیگانۂ آشنا نمائے ہمہ باش

رباعی

از شعر و سخن گوشِ جہاں کر بادا — وین مشغلۂ بیہدہ کمتر بادا
بر ہر کہ دعائے بد کنم ، می گویم — یارب ! کہ گراں مایہ سخنور بادا

[مقالاتِ حالی (۱) : (ترجمہ حالی) ص ۲۶۱ - ۲۷۰ ؛
تذکرۂ حالی ؛ یادگارِ حالی ؛ چہنستانِ عصر ص ۱۳۲ - ۱۵۱ ؛
اردو (سہ ماہی) جلد ۳۱ و ۳۲]

حباب ــــــ پنڈت امراؤ سنگھ لاہوری

۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئے ۔ ۲۰ - ۲۵ برس تک رڑکی کالج میں ریاضی کے معلم رہے۔ ایک اخبار بھی جاری کیا تھا جس میں زیادہ تر اُن ہی کے مضامین ہوا کرتے تھے ۔ ۶۵ برس کی عمر تھی جب ۱۹۰۹ء میں لاہور میں انتقال کیا ۔ جہاں سکونت اختیار کرلی تھی ۔

گلشن میں گدگدی سے نسیم سحر کی آج — گل ہنس دیا ، تو غنچہ بھی کچھ مسکرا دیا
بہاے بحر جو ہے ، گو ہرِ خوش آب کی ہے — دُرِ سرا شک سے ہے ، آنکھ بے بہا دریا
نگاہِ دیدۂ بے ہوش ہیں ہم — صدائے نالۂ خاموش ہیں ہم
جنوں تعلیم تھی کیا بزمِ شب ! جو صبح ہوتے ہی — گریباں پھاڑتے گھر سے ، تمہارے ہم نشیں نکلے
ہے ساتھ جو توشۂ توکل بخدا — آزادِ غمِ جہاں جو فقیر آتا ہے
بیتابی و اضطراب کا نقش مٹا — اے موج ! حباب دستگیر آتا ہے

[بہارِ سخن ، ص ۱۳۶ - ۱۳۷ ؛ خم خانۂ جاوید (۲) ص ۳۸۰ -]

حزیں ——— میر بہادر علی دہلوی

ظفر کے ولی عہد مرزا فخرو کے مصاحب و مقرب، بڑے وضعدار اور سنجیدہ طبع بزرگ تھے۔ ۱۸۲۲ء میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد کا نام میر نجف علی تھا جن کے دادا مستقیم الدولہ میر علی بخش مشہور خوشنویس تھے۔ عارف اور غالب دونوں سے استفادہ کیا۔ ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۹ء) میں فوت ہوئے۔

نبھتی نہ حزیں اُن سے، اگر میں بھی بُرا ہوتا | سب ناز سہے میں نے بے جا اور بجا اُن کے

شگفتہ دل، سوختہ جاں، خستہ جگر اپنا سا | کر دیا شوق نے خوبانِ جہاں کو اُس کے

سامنے آئیں گے جب وہ تو سنبھل جاؤں گا | میرا احوالِ زبوں ان پہ کھلے گا کیوں کر

اللہ رے وسعتیں تری، اے تنگ نائے دل! | دنیا کی حسرتیں ترے گوشے میں آ گئیں

اور دیکھیے حزیں! ابھی کیا کیا دکھائے دل | دیکھا وہ اپنی آنکھ سے، جو کچھ سنا نہ تھا

کہ بھرے خُم سے مے شیشے میں اور شیشے سے ساغر میں | سبُو سے منھ لگائیں گے، اب اتنا صبر ہے کس کو

اس سے تو آگ تن میں لگا ایک بار دے | اے سوزِ عشق! روز نیا داغ تا بکے

[طبقات الشعرائے ہند، ص ۴۳۶؛ گلستانِ سخن، ص ۱۹۹ - ۲۰۰؛ گلستانِ بے خزاں، ص ۵۷؛ شمیمِ سخن، ص ۱۱۴؛ بزمِ سخن، ص ۳۹؛ خم خانۂ جاوید (۲) ص ۳۹۷ - ۳۹۸]

حسام ——— منشی خلیفہ حسام الدین احمد اُلدَنی

باپوڑ (ضلع میرٹھ) کے نواح میں اُلدن ایک قصبہ ہے۔ وہیں کے ایک شریف خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ شاعری گویا ورثے میں پائی تھی۔ ان کے والد مولوی شیخ

خدا بخش بھی شاعر تھے عاجز تخلص تھا۔ عاجز کے والد شیخ عبد الحکیم عرف میاں نھّن عاشق تخلص کرتے تھے۔ یہ میر تقی میر کے ہم عصر اور جلیس تھے۔ آپس میں خوب صحبتیں رہتی تھیں اور ایک ساتھ شعر و شاعری سے شوق کرتے تھے۔

حسام کے صاحبزادے مولوی عبد الباری آسی الدنی تھے جن کا انتقال چند برس اُدھر ہوا۔ افسوس کہ باوجود تلاش کلام نہیں مل سکا صرف "مشاطۂ سخن" میں ان کی آسی کے دو شعروں پر اصلاح ملتی ہے۔

[نگار (جنوری فروری ۱۹۴۱ء) ص ۱۶-۱۷؛ مشاطۂ سخن (۲) ص ۱۰۷]

حسینؔ ——— خورشید صاحب دہلوی

دلی کے باشندے تھے اور تالیف یادگار ضیغمؔ کے زمانے میں کلکتہ میں مقیم تھے۔ اس سے زیادہ حالات معلوم نہیں ہوئے۔

گرمیِ صحبت کا ہی اس رشکِ گل پر یہ اثر ہے تصور سے بھی صورت اس کی کمکلائی ہوئی
ان دنوں حد سے سوا ہی پردہ داری کا لحاظ یاد بھی جب اُن کو آتی ہے تو شرمائی ہوئی

[یادگار ضیغم، ص ۱۲۱-۱۲۲]

حقیرؔ ——— منشی نبی بخش اکبر آبادی

اگرچہ اصل میں یہ خاندان پنجاب کا رہنے والا تھا۔ لیکن بعد میں یہ لوگ نقل مکان کر کے دلی اور پھر آگرے چلے آئے۔ چنانچہ حقیرؔ کے والد شیخ حسین بخش آگرے میں پیدا ہوئے۔ یہ بھی شاعر تھے پہلے تخلص بخشی تھا بعد میں بدل کے عاصی کر لیا۔ نظیرؔ کے شاگرد تھے۔ آگرے کے محلہ تاج گنج میں رہتے تھے۔ حقیرؔ انگریزی عدالت فوجداری میں سر رشتہ دار تھے۔

اور اس علاقے سے مدتوں کول (علی گڑھ) میں مقیم رہے۔

غالب ان کے پایۂ سخن سنجی کے بے حد معترف تھے اور انھوں نے اپنے خطوں میں اُن کی بہت تعریف لکھی ہے۔ حقیر پہلے میاں نظیر اکبر آبادی کے صاحبزادے خلیفہ گلزار علی اسیر[1] سے اصلاح لیتے رہے۔ بعد میں غالب سے مشورہ کرنے لگے۔ اردو، فارسی دونوں زبانوں میں کہتے تھے۔

اکتوبر یا نومبر ۱۸۶۰ء میں انتقال کیا۔ اولادِ جسمانی میں دو لڑکے عبداللطیف اور نصیرالدین اور ایک لڑکی زکیہ بیگم یادگار چھوڑے۔

حقیر کی وفات پر غالب نے قطعۂ تاریخ کہا ہے

شیخ نبی بخش، کہ با حُسنِ خُلق — داشت مذاقِ سخن و فہم تیز
مرگِ ستم پیشہ، امانش نہ داد — کیست کہ با مرگ بسیچد ستیز
سالِ وفاتش، زپے یادگار — با دلِ زار و مژۂ دجلہ ریز
خواستم از غالبِ آشفتہ سر — گفت مدہ طول و بگو "رستخیز"
۱۲۷۶ھ

بیشتر کلام ضائع ہو گیا۔ مختلف جگہ سے جو کچھ ملا، اس میں سے چند شعر ہدیۂ ناظرین ہیں۔ ممکن ہے، غالب نے جو کچھ ان کی شعر فہمی سے متعلق کہا ہے، وہ درست

---

[1] خلیفہ گلزار علی اسیر ۱۸۰۲ء (۱۲۱۶ھ) میں پیدا ہوئے، علومِ رسمیہ کی تعلیم اپنے والد سے لی اور اس میں کوئی خاص دستگاہ بھی نہیں تھی۔ شروع میں مہاراجہ بلونت سنگھ (بنارس) کے پاس ملازم رہے بعد میں دھول پور چلے گئے۔ یہاں انھیں پانچ روپیہ یومیہ ملتا تھا۔ دورانِ قیام دھول پور میں ریاست کی تاریخ اردو نظم میں لکھی۔ مطبوعہ دیوانِ اردو اور ایک مثنوی سوزِ عشق بھی یادگار چھوڑی۔ ۱۲۹۵ھ (۱۸۷۹ء) میں انتقال کیا۔ ان کے ایک شاگرد غلام محمد خاں رہا نے چھ کے تخرجے سے تاریخ نکالی۔ "گفت اسیر دام ہی شد رہا" یہی قبر کے طاق پر کندہ ہے۔ آگرے کے اکثر شعرا اُن سے اصلاح لیتے تھے۔ اُن کے صاحبزادے نثار علی بھی شاعر تھے پذیر تخلص کرتے تھے۔

(شاعر آگرہ نمبر ص ۳۵-۳۶، خمخانۂ جاوید (۱) ص ۲۹۸)

ہو، لیکن جہاں تک شعر گوئی کا تعلق ہے، اُن کے کلام میں کوئی خاص قابلِ ذکر بات دکھائی نہیں دیتی۔

سایۂ قصر ترا یاد آیا — پھر ہمیں ظلِّ ہما یاد آیا
زخم کے منہ میں بھر آیا پانی — جب کہ پیکاں کا مزا یاد آیا
پھر گریباں کے اُڑیں گے ٹکڑے — پھر وہی چاکِ قبا یاد آیا
یدِ بیضا کا جو مذکور ہوا — اُن کا نقشِ کفِ پا یاد آیا
خط جو غیروں کو کیے اس نے رقم — ہم کو قسمت کا لکھا یاد آیا
بس کہ مصنوع ہو صانع کی صفت — بت کو دیکھا تو خدا یاد آیا

آج پھر اس بتِ کافر نے حقیر
وہ ادا کی، کہ خدا یاد آیا

دیر میں ذکر اپنا، کعبہ میں بیاں اپنا — ایک ہم ہیں اور چرچا ہے کہاں کہاں اپنا

بخت خفتہ بخت کا جو سنا ذکر سو گئے عم — احوالِ غم میں خواب کا افسانہ بن گیا

بڑھ گئی توقیر میری امتناعِ دخل سے — اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، مجھ کو اس کے درباں دیکھ کر

وہ نکاہیں، جن سے تھی مجھ کو تسلی کی اُمید — تشنۂ خوں، آفتِ دل، دشمنِ جاں ہو گئیں

شانے نے بل نکال دیے زلفِ یار کے — موذی کو اس نے زیر کیا مار مار کے
لاغر ہے قیس، پر نہ حقیر! اس قدر کہ ہیں — ہے کاہ کوہ آگے مرے جسمِ زار کے

پھر جنوں آکے ہوا دست و گریباں ہم سے — نہ گریباں ہی بچے اب کے، نہ داماں ہم سے
ہم تو چھوڑیں گے نہ اس کے رُخ و کاکل کا خیال — کوئی کافر کہے، یا کوئی مسلماں ہم سے
آتشِ دل نے تو سر تا بقدم پھونک دیا — دیکھیں، اب کرتے ہیں کیا دیدۂ گریاں ہم سے

کشمکش ہم سے شبِ ہجر کی مت پوچھ حقیر!
ہجر سے تنگ ہیں ہم، تنگ ہے ہجراں ہم سے

اب فارسی کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

زخوں فشانیِ چشم، ترا بجوں گیرند — کہ ہم زدست مرا، آنچہ در دل افتاد است

در گلستاں گذرش زاں افتد | کہ گل از چشمِ گلستاں افتد
افتد آں سر کہ در و ساماں است | سر ہماں بہ کہ ز ساماں افتد
خوں شد و کارِ دل افتاد بہ اشک | اشک را کار بداماں افتد

[گلستانِ بے خزاں، ص ۳۶، ۶۶؛ اردوئے معلیٰ، ص ۸۳؛
شمیم سخن، ص ۱۱۸؛ خم خانۂ جاوید (۲) ص ۴۹۰؛ شاعر
(آگرہ نمبر)، ص ۷۲؛ اسعد الاخبار، ۱۸۴۷-۱۸۴۸ء]

حیدرؔ ــــــــ آغا حیدر علی بیگ دہلوی

بزرگوں کا وطن مشہد تھا۔ ان کے والد آغا بندہ علی بیگ تھے۔ حیدرؔ نے بہت کم عمری میں شعر کہنا شروع کیا۔ اُس وقت عمر مشکل سے چودہ برس کی ہوگی۔ پیشے کے لحاظ سے اُوورسیر تھے۔ جن ایام میں دریائے گنگا سے نہر نکل رہی تھی، یہ مدتوں اٹاوہ میں مقیم رہے۔ شعر کی تمام اصناف پر قادر تھے۔ اس کے علاوہ نثر بھی لکھتے تھے۔ اُردو اور فارسی دونوں سے شوق تھا۔ تصانیف میں دیوان نوحہ جات۔ مختار نامہ (اُردو) مثنوی عزیز دل۔ فغانِ حیدر۔ رسالۂ قافیہ (منظوم)۔ افیون نامہ (منظوم) کارزار نامہ (فارسی) یادگار چھوڑے۔ چند اُردو شعر بطور نمونہ ملاحظہ ہوں ؎

مصحفِ رُخ پہ جو ہم آپ کے قربان رہے | اسی صورت سے سدا حافظِ قرآن رہے
ہوش و حواس دل کو ابھی آئے جاتے ہیں | صورت جو اپنی وہ مجھے دکھلائے جاتے ہیں
ہے دل میں اُلجھے دامِ بلا میں کوئی شکار | زلفوں کے بال اس لیے سُلجھائے جاتے ہیں
ہرگز نہ سونگھی بوئے وفا ہم نے آخرش | ہم گل رخوں کے ہاتھ سے گل کھلائے جاتے ہیں

[یادگارِ ضیغم، ص ۱۱۶-۱۱۷]

خاورؔ ـــــــــ مرزا محمد اکبر خاں قزلباش

والد کا نام مرزا محمد مہدی خاں تھا اور قوم کے قزلباش تھے۔ یہ خاندان اصل میں سیستان کا رہنے والا تھا مگر خاورؔ کے اسلاف ایک زمانے سے نقلِ مکان کر کے نواحِ کابل میں آ رہے تھے۔ خاورؔ یہیں ۱۸۴۲ء (۱۲۵۵ھ) میں پیدا ہوئے[1]۔ عنفوانِ شباب میں سیر و سیاحت کی ہوا سر میں سمائی تو واردِ ہندستان ہوئے، اور آخر دلی پہنچے۔ موزوں طبع تھے، شعر کہنے لگے۔ مرزا محمد حسین خراسانی سے مشورہ کرتے تھے۔ ہندستان آنے کے بعد اپنا کلام مرزا غالبؔ کی خدمت میں بہ نظر اصلاح پیش کیا۔ دلی سے لکھنؤ کی راہ لی۔ اور ذہن کی براقی سے تھوڑی مدت وہاں رہ کر اردو حاصل کر لی اور مشق سے اتنا ملکہ بہم پہنچایا کہ اہلِ زبان کی طرح گفتگو کرتے اور شعر کہتے تھے۔ اردو کلام پر میر وزیر صباؔ سے اصلاح لی۔

افغانستان کی پہلی لڑائی (۱۸۳۹ - ۱۸۴۲ء) کے دوران میں جب انگریزی فوج پر افغانستان میں مصیبت کا پہاڑ ٹوٹا ہے تو خاورؔ کے بزرگوں نے بعض انگریزوں کو پناہ دی اور ان کی جان بچائی تھی۔ انگریزوں نے اس خدمت اور ہمدردی کا یہ صلہ دیا کہ ایک خاص نشان مقرر کیا کہ اس خاندان کا جو فرد بھی یہ نشان دکھائے گا، ہر انگریز کا فرض ہو گا کہ اس کی حتی الامکان مدد کرے، چنانچہ خاورؔ بھی موردِ عنایت تھے۔ لکھنؤ میں ڈاکٹر لوگن ان اصحاب میں سے تھے جو خاورؔ کے والد اور چچا کی مدد سے بچ کر ہندستان واپس آئے تھے۔ اسی لیے وہ خاورؔ پر بہت مہربان تھے اور ہر طرح

---

[1] یہ بیان نگارستانِ سخن کا ہے۔ اس کے برعکس سخن شعرا (نساخ) سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے والد مقیم "اکبرآباد" تھے۔ اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ ہجرت مرزا محمد مہدی خاں نے کی اور وہ جن ایام میں اکبرآباد میں مقیم تھے۔ خاورؔ یہاں پیدا ہوئے۔ یا شاید باپ بیٹا دونوں ایک ساتھ ہندوستان آئے۔ اور مرزا محمد مہدی خاں اکبرآباد میں بس گئے۔ واللہ اعلم۔

ان کی تعظیم و توقیر کرتے تھے۔

یہ لکھنؤ سے نکلے تو جموں جاکر مہاراجہ کے متوسلین میں شامل ہو گئے۔ یہاں سے پٹیالہ پہنچے۔ ریاست کی طرف سے سو روپیہ ماہانہ مقرر ہو گیا۔ لاہور سے ڈاکٹر لائٹنر کی سرپرستی میں ایک عربی رسالہ "النفع العظیم" نکلا تھا۔ تھوڑے دن تک اس کے بھی ایڈیٹر رہے۔ علمی اور تاریخی معلومات بہت وسیع تھیں۔ اور اکثر فنون میں مہارت حاصل تھی۔ چنانچہ اپنے زمانے کے اخباروں میں مضمون لکھتے رہتے تھے۔

جس زمانہ میں مولانا محمد حسین آزاد نے لاہور میں جدید مشاعروں کی بنیاد ڈالی ہے، خاور بھی ان دنوں لاہور ہی میں تھے۔ یہ بھی ان مشاعروں میں حصہ لیتے رہے۔[1] ۱۸۸۱ء (۱۲۹۸ھ) میں وفات پائی۔[2] نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں نے تاریخ کہی ؎

صد حیف کہ مُرد خاورِ دانشور — آں شاعرِ خوش بیان، معنی پرور
یک سالِ دگر، کاش بماندے زندہ — تا سال شدے کہ "مرد مرزا خاور"
ا

۱۲۹۹ - ۱ = ۱۲۹۸

---

[1] گارسان دتاسی نے اپنے ۱۸۷۴ء کے سالانہ خطبے میں ایک عجیب بات کہی۔ فرماتے ہیں:۔
"انجمن کے اگلے مشاعرے کا موضوع حسن انصاف قرار پایا۔ یہ مجلس ۱۴۔ نومبر کو ہوئی۔ میجر ہالرائڈ اور متعدد ہندستانی اہل قلم اس میں شریک تھے۔ شاعروں میں مرزا محمد اکبر خان خاور بھی تھے جنہیں سلطان الشعراء کا خطاب ملا ہے۔" (مقالات گارساں دتاسی (۲) ص ۳۵) یوں معلوم ہوتا ہے کہ کسی اخبار نے اس مشاعرے کی روداد شائع کرتے وقت خاور کے نام کے پہلے اعزازاً "سلطان الشعرا" لکھ دیا ہوگا۔ اور دتاسی نے یہ اخبار دیکھ کر خیال کیا کہ خاور کو یہ خطاب عطا ہوا ہے۔ ورنہ اس زمانے میں خاور کو یہ خطاب دینے والا کون تھا۔

[2] تذکرہ اختر تاباں (ص ۴۹) میں لکھا ہے کہ وزیر النساء بیگم وزیر تخلص خاور کی بیوی تھی۔ یہ غلط ہے جیسا کہ منشی درگا پرشاد نادر نے اپنے تذکرے گلشن ناز (ص ۴۲) میں صراحت کی ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ وزیر ان کی شاگرد ہو، جیسا کہ صاحب صبح گلشن (ص ۴۹۰) کا بھی خیال ہے۔

فارسی کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

اُو در دلِ من ست و دلِ من بدستِ اُو　　چوں آئینہ بدستِ من و من در آئینہ

دم بادِ بہاری شمہ، چو روح القدس در گلشن　　وزاں شد مریم گلبن بعیسیٰ گل آبستن

نسیم باغ جاں پرور، شمیمِ بوستاں دلبر　　صبا را عُود در مجمر، ہوا را مشک در دامن

بنود سلسلہ جنباں کلامم کہ بدہر　　بستۂ بندِ وفایش، دلِ آزادِ من ست

غالبِ نامور، آں کش اسد اللہ خوانند　　شاہِ مُلکِ سخن و مرشد و استادِ من ست

رباعی

دی شب کہ بکوے مے فروشم بُردند　　دادند پیالہ وز ہوشم بُردند

ہر چند کہ گفتند حریفاں "برخیز"　　القصہ ز خُم دہد و شم بُردند

خاور بفلکِ نردِ ہنر می بازیم　　بیہودہ باین بوالہوسی می سازیم

نازد ہمہ کس بہ بخت دبر طالعِ خویش　　ما خود بنصیبِ دگراں می نازیم

اردو کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

معمور ہے داغوں سے سراپا مرے دل کا　　مثلِ شجرِ طور ہے نقشا مرے دل کا

جیتا ہوں نہ مرتا ہوں عجب دکھ میں پڑا ہوں　　کیا پوچھتے ہو حال ہے کیسا مرے دل کا

کیا آپ کی مانوں میں بھلا حضرتِ ناصح!　　کچھ حال بھی معلوم ہے قبلہ! مرے دل کا

نہ دیکھا ہو جس نے کبھی رقصِ بسمل　　وہ آج آکے دیکھے تماشا ہمارا

ہوے ہو تم اس بے مروت کے خاور!　　نہ ہے وہ کسی کا، نہ ہوگا ہمارا

مرنے کا لطف، دیکھ رہا ہوں میں زیست میں　　یہ بھی تو ایک موت ہے مرتا نہیں ہوں میں

کچھ حال دل کے کہنے کو ڈرتا نہیں ہوں میں　　اس میں بھی ایک بات ہے کہتا نہیں ہوں میں

[سخن شعرا، ص ۱۴۷-۱۴۸؛ نگارستانِ سخن ۲۶-۲۷؛
روز روشن، ص ۱۹۶؛ خم خانۂ جاوید (۳) ص ۱۰-۱۱؛
دو نایاب زمانہ بیاضیں، ص ۱۰۷-۱۰۸؛]

خلیلؔ و فوقؔ ــــــــــ محمد ابراہیم آروی

ان کے حالات معلوم نہیں ہو سکے غالباً آرہ (ضلع شاہ آباد) کے رہنے والے تھے۔ اور یہاں محلہ چوک مسجد میں قیام تھا۔ پیشہ کے لحاظ سے محرر عدالت تھے۔ ان کا کلیات نظم و نثر اردو و فارسی مطبع نور الانوار آرہ سے ۱۸۷۳ء (۱۲۹۰ھ) میں شائع ہوا تھا۔ بہت بے مزہ کلام ہے۔

یوں معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں یہ غالبؔ سے برابری کے دعوے دار تھے، جیسا کہ ان کے ایک مقطع سے ظاہر ہے ؎

خلیلؔ ایں غزل گفتم از روے دعویٰ ۔۔۔ جوابش دہد غالبؔ نکتہ آرا

لیکن ۱۸۶۷ء میں یہ اصلاح کی درخواست لے کر غالبؔ کی خدمت میں حاضر ہوے۔ معلوم نہیں کہ غالبؔ نے یہ درخواست قبول کی یا نہیں۔ غالبؔ نے ان کے خط کا جو جواب دیا تھا، وہ کلیاتِ فوقؔ میں شامل ہے۔ (ص ۱۴۵-۱۴۶)۔ اس سے یہ نہیں کھلتا کہ واقعی اُنھوں نے اصلاح دینا منظور کیا یا نہیں۔ میں نے بہر حال فوقؔ کا نام شاملِ تلامذہ کر لیا ہے، کیونکہ اس کا امکان ضرور ہے۔

چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

زنہار، اے خلیلؔ! بریں دہر دل مبند ۔۔۔ یک گوشۂ قناعت و یک بوریا بس است

گویم من از تو چوں، کہ ز شوقت چہا گزشت ۔۔۔ بر جانِ ناتواں چقدر رفتہا گزشت

بے روے تو گل بدیدہ خار است ۔۔۔ بدتر ز خزاں مرا بہار است

گویم ہمہ عالم بمرادِ دلِ ما باشد ۔۔۔ گر یار بکامِ منِ بیدل شدہ باشد

بسانِ غنچہ دلِ من چمن چمن بشگفت ۔۔۔ در آں زماں کہ نسیمے ازاں دیار آمد

مفتوں، دل! مباش زنیرنگیِ جہاں ۔۔۔ نرگس صفت بہ ہر سراپاے دیدہ باش

سخن تو کرد چناں محو کہ نتوانم گفت ۔۔۔ کہ چسانیم بذکرِ تو سراپا مشغول

ہم رہاں پیش و پسِ قافلہ رفتند و من ۔۔۔ رہ غلط کردم و ماندم بتماشا مشغول

کوئی کہتا ہے کعبہ رُخ کو تیرے کوئی بت خانہ — غرض جھگڑا رہا اے یار! ہر شیخ و برہمن میں

ہوتی فروتنی ہے تنک ظرف سے کہاں — ظاہر ہے دیکھ گردنِ مینا میں خم نہیں

شکوے کا کیا محل ہے، بہرحال شکر کر — دنیا میں کون ہے، جسے اندوہ و غم نہیں

اشک ہے سرخ، تمہارا رنگ ہے زرد — حالتِ دل کو بیاں کیا کیجے

بخدا! شکر کی جا ہے ہر طور — شکوۂ جورِ بتاں کیا کیجے

صبا کی طرح پھرتے ہیں وہی سرگشتہ جو اے دل! — زیادہ اس جہاں میں پاؤں پھیلاتے ہیں چادر سے

[کلیاتِ خلیق و ذوق]

خضرؔ ——— میرزا خضر سلطان دہلوی

بہادر شاہ ظفرؔ دہلوی کے بیٹے تھے۔ یہ وہی خضر سلطان ہیں۔ جن کی پیدائش پر غالب نے کہا تھا ؎

خضر سلطاں کو رکھے خالقِ اکبر[1] سرسبز
شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ فرو ہو جانے کے بعد خاندانِ شاہی کے دوسرے افراد کے

---

[1] اشارہ ہے اکبر شاہ ثانی کی طرف جو خضر سلطان کے دادا اور ظفرؔ کے والد تھے۔ یہ بھی شاعر تھے اور اپنے والدِ مکرم شاہ عالم ثانی کے تخلص آفتابؔ کی رعایت سے شعاعؔ تخلص کرتے تھے۔ ۱۷۵۹ء میں مکند پور ریوان میں پیدا ہوئے اور ۱۸۰۶ء میں تخت پر بیٹھے۔ ۳۱ برس کی حکمرانی کے بعد ۱۸۳۷ء میں رہ گرائے عالمِ جاودانی ہوئے۔ ظفر ان ہی کے جانشین ہوئے تھے۔ ظفرؔ نے تاریخ وفات کہی "عرش آرام گاہِ عالی قدر" آفتابؔ اور شعاعؔ دونوں باپ بیٹا موتی مسجد (دہلی) کے پاس شاہ عالم بہادر شاہ اوّل (خلف عالم گیر) کے مجر میں مدفون ہوئے۔ (خم خانہ جاوید (۴) ص ۵۵۲)

ساتھ یہ بھی ۲۳ ستمبر ۱۸۵۷ء کو مقبرۂ ہمایوں میں گرفتار ہوئے اور اسی دن خونی دروازے کے باہر، اپنے بڑے بھائی میرزا ظہور الدین عرف مرزا مغل اور بھتیجے میرزا ابوبکر (خلف میرزا فخرو) کے ساتھ میجر ہاڈسن کی گولی کا نشانہ بنے۔ دوسرے دن تینوں شاہزادوں کی لاشیں، چاندنی چوک کے کوتوالی کے چبوترے کے سامنے پھانسی پر لٹکائی گئی تھیں۔ وفات کے وقت عمر ۲۶ برس سے متجاوز نہیں تھی۔ ایک لڑکا میرزا محمد عثمان اور ایک لڑکی یادگار چھوڑی۔ یہ صاحبزادی ان کے بھتیجے میرزا مجاہد الدین شاہی (خلف میرزا مغل) سے منسوب تھیں۔ میرزا محمد عثمان بھی شعر کہتے تھے۔ افسر تخلص تھا اور میرزا قادر بخش قادر سے اصلاح لیتے تھے۔ لگ بھگ ۴۴ برس کی عمر تھی جب ۱۳۰۶ھ میں فوت ہوئے۔ میرزا خضر سلطان کے چند شعر ملے ہ

جو تیری خوشی، وہ ہی مرا مدعا ہوا	گالی سے کون خوش ہو مگر حسن اتفاق
غیروں پہ کرم ہو، یہ ستم بھی نہیں تھوڑا	مانا کہ ستم تم نہیں کرتے ہو کسی پر
خضر میں وہ ہوں کہ حصے میں مرے دل آیا	جام جمشید کو، آئینہ سکندر کو ملا
مجھ سے اک چھیڑ ہوئی شکوہ عدو کا نہ ہوا	کہتے ہو "وہ بھی ہوس پیشہ ہے جیا تو کہ"
پر یہ بھی تو اے شوخ ستم گر نہیں ہوتا	کہتے ہو کہ اک روز تجھے قتل کریں گے
ہمیں اس وقت میں اے بے وفا دیکھا تو کیا دیکھا	نہ کہہ سکتے ہیں کچھ اپنی نہ سن سکتے ہیں کچھ تیری

[خم خانۂ جاوید (۳) ص ۲۵-۲۶؛ نیئر (۱) ص ۲۴۳-۲۴۴]۔

خورشید ——— خورشید احمد دہلوی ثم لکھنوی

شاہ شکور احمد شکور کے بیٹے اور حضرت مجدد الف ثانی سرہندی کی اولاد میں سے تھے۔ ۱۸۴۹ء (۱۲۶۵ھ) میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ بہت سیلانی آدمی تھے۔ ماوراءالنہر

اور خراسان تک کی سیر کی تھی۔

اپنے عم زاد بھائی حضرت شاہ رؤف احمد رافت سے بیعت تھے۔ شاہ سعد اللہ حیدر آبادی سے بھی کسب فیض کیا۔ اُردو اور فارسی دونوں میں کہتے تھے۔ غالب کے علاوہ مومن سے بھی مشورہ کیا تھا۔

کہاں پہلو میں دل، خورشید! جس کو ہم تسلی دیں | جو کچھ تھا آنسوؤں کے ساتھ خوں ہو کر نکل آیا

پھاڑنے کو اور کیا باقی رہا! دستِ جنوں | چاک دامن ہو گیا، پرزے گریباں ہو گیا

لہ حضرت شاہ رؤف احمد رافت بھی حضرت مجدد الف ثانیؒ کی اولاد میں سے تھے۔ ان کے والد شاہ شعور احمد رامپوری تھے۔ رافت رام پور ہی میں ۶ نومبر ۱۷۸۶ء (۱۴ محرم ۱۲۰۱ھ) کو پیدا ہوئے۔ تاریخی نام "رحمان بخش" ہے۔ (مولد لکھنو۔ طبقات الشعرائے ہند) جید عالم اور حضرت شاہ غلام علی کے بزرگ خلفا میں سے تھے۔ بہت دن بھوپال میں مسندِ ارشاد و ہدایت کی زینت رہے۔ بھوپال کے سب حکمراں ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ ۴۸ برس کی عمر تھی جب ۵۔ اپریل ۱۸۳۴ء (۲۵۔ ذی قعدہ ۱۲۴۹ھ) کو عین سفرِ حج میں عرشہ جہاز پر انتقال فرمایا۔ ناسخ کی کہی ہوئی "قدرگہ جنت رافت" تاریخ وفات ہے۔ (انتخاب یادگار، اور شمیم سخن دونوں جگہ عمر اور تاریخ وفات غلط ہے)۔ شاعری میں جرأت کے شاگرد تھے۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں کا شوق تھا۔ جمیع اصنافِ سخن پر قادر تھے۔ عروض اور قوافی میں بھی بے نظیر مہارت تھی۔ اُردو میں چھ اور فارسی میں ایک دیوان اپنے پیچھے چھوڑے۔ ایک معراج نامہ نثر میں، اور مثنوی یوسف زلیخا بھی اُن سے یادگار ہے۔ اُردو میں تفسیر رؤفی لکھی۔ اپنے مرشد کے ملفوظات دار المعارف کے عنوان سے جمع کیے۔

رافت کے صاحبزادے جناب مولوی حبیب احمد بھی شاعر تھے۔ روبیت تخلص تھا اور اپنے والد ماجد ہی سے مشورہ کرتے تھے۔ نواب شاہجہاں بیگم والیۂ بھوپال کے استاد تھے۔ ۴۰ برس کی عمر میں ۲۲ مئی ۱۸۴۶ء (۲۵ رجمادی الاوّل ۱۲۶۲ھ) کو بھوپال میں ہیضے سے انتقال کیا۔ (طبقات الشعرائے ہند، ص ۲۶۱۔ ۲۶۲؛ انتخاب یادگار، ص ۱۴۳۔ ۱۴۴؛ شمیم سخن، ص ۱۲۵۔ ۱۲۶؛ نگارستان سخن، ص ۳۰؛ تذکرہ کاملانِ رامپور، ص ۱۴۳۔ ۱۴۷؛ تذکرہ علمائے ہند، ص ۶۶۔ ۶۷؛ آثار الشعرا، ص ۱۱۷۔ ۱۱۸؛ فرح بخش، ص ۴۴)۔

جاتا نہیں آنکھوں سے تصور کبھی، خورشید! موجود ہے ہر وقت، وہ گویا مرے آگے
نوید وصل یہ مانا کہ جھوٹ ہے، خورشید! کسی طرح کوئی تسکین اضطراب تو دے

[سخن شعرا، ص ۱۵۴-۱۵۵؛ انتخاب یادگار (۲)
ص ۱۲۶؛ خم خانۂ جاوید (۳) ص ۶۷-۶۸]

درد ـــــ منشی ہیرا سنگھ دہلوی

یہ منشی جواہر سنگھ جوہر تحصیلدار کے چھوٹے بھائی اور رائے چھج مل کے بیٹے تھے۔ دہلی میں مسجد فتحپوری اور سرائے احمد پائی کے درمیان گندی گلی میں رہا کرتے تھے۔ اپنے بڑے بھائی کی سفارش پر کچھ دن رہتک میں ملازم رہے تھے۔

افسوس مزید حالات اور کلام دستیاب نہ ہو سکا۔

ذکا ـــــ مولوی محمد حبیب اللہ مدراسی ثم حیدرآبادی

یہ خاندان دراصل بیجاپور کا رہنے والا تھا۔ وہاں سے ان کے اجداد میں سے کوئی کرناٹک چلے آئے اور یہاں مصطفیٰ علی خاں جاگیردار کے ملازموں میں شامل ہو گئے۔ ذکا کے والد حافظ محمد میراں نائطی تھے۔

ذکا ۱۸۳۰ء (۱۲۴۴ھ) میں ادوگیر (ضلع نیلور، مدراس) میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے "خاش و خماش" کے دیباچے میں خود اپنی تاریخ پیدائش "بے خود بدخوے" سے نکالی ہے۔ ابتدائی تعلیم اپنے بڑے بھائی محمد رحمت اللہ رسا سے حاصل کی۔ پھر علوم متداولہ دوسرے اساتذۂ وقت سے پڑھے۔ چنانچہ فارسی پر پوری قدرت حاصل تھی اور عربی

بھی بقدرِ ضرورت جانتے تھے۔ فارسی میں نظم و نثر دونوں خوب لکھتے تھے۔
شاعری کا شوق بہت چھوٹی عمر میں ہوا۔ شروع میں میر مہدی ثاقب سے اصلاح لیتے رہے۔ ان کے بعد سید میر مرتضیٰ بینش* سے مشورہ کیا۔ شعر و سخن سے قدرتی لگاؤ تھا، ان صاحبِ کمال استادوں کی تربیت سے بہت جلد ترقی کر گئے اور کرناٹک میں ان کے کلام کی دھوم مچ گئی۔ حاسدوں کی کمی نہیں تھی۔ اُنھوں نے اِنھیں زک دینے کے لیے جوڑ توڑ کرنا شروع کیے۔ ان ہی ایام میں وہاں ایک مشاعرۂ اعظم بڑے اہتمام سے ہوا، جس کے کرتا دھرتا نواب کرناٹک کے مصاحبِ خاص شیخ محمد حسین راقم المخاطب بہ شیریں سخن خاں تھے۔ خود نواب صاحب نے بھی اس مشاعرے میں بہت دل چسپی لی۔ وہ چاہتے تھے کہ جس شاعر کا کلام حاصلِ مشاعرہ ثابت ہو، اسے انعام اور خلعت سے نوازا جائے۔ میر مشاعرہ شیخ محمد حسین راقم بھی ذکا کے مخالفوں میں سے تھے۔ چونکہ ہر ایک شخص کا یہ خیال تھا کہ میدان ذکا کے ہاتھ رہے گا، اس لیے راقم نے اُنھیں انعام سے محروم کرنے کے لیے یہ چال چلی،

---

* سید مرتضیٰ بینش۔ ان کے والد میر صادق علی الحسینی سید تھے۔ خاندان کے جدِ اعلیٰ مشہد سے گلبرگہ آئے۔ شاہ ابراہیم مصطفیٰ ان کے بزرگوں میں تھے، جو حضرت خواجہ محمد بندہ نواز گیسو دراز کے ماموں تھے۔ بینش ۱۲۲۶ھ میں مدراس میں پیدا ہوئے۔ مادۂ تاریخ ولادت "آفتاب سپہر سیادت" ہے۔ عربی فارسی اور دیگر علوم دینیہ علمائے مدراس سے حاصل کیے۔ شاعری کا شوق ہوا تو پہلے اپنے والد اور بھائی سے اور پھر مولوی میراں محی الدین واقف سے اصلاح لی۔ اس کے بعد حیدرآباد آئے تو یہاں بھی بہت نام پیدا کیا۔ نواب والاجاہ محمد غوث خاں بہادر کے دربار سے بزمرۂ شعرا وابستہ تھے۔ ۱۲۶۵ھ میں عتباتِ عالیہ کی زیارت کے لیے اہل و عیال کو ساتھ لے کر کربلا اور نجف اشرف چلے گئے۔ کربلائے معلیٰ ہی میں واصلِ حق ہوئے۔ روضۂ مبارکہ کے صحن میں آسودۂ خواب ہیں۔ میر مہدی ثاقب، بینش کے بھائی عمر میں ان سے تین برس بڑے تھے۔ اُنھوں نے واقف کے علاوہ میر مبارک اللہ خاں راغب سے بھی مشورہ کیا۔ (صبح وطن، ص ۳۸، ۴۹؛ گلزارِ اعظم، ص ۱۲۱-۱۲۲؛ محبوب الزمن (۱) ص ۳۰۴-۳۰۵)۔

کو مشاعرہ سے ایک دن پہلے اعلان کرا دیا کہ ہر ایک شاعر اپنا کلام خود سنائے گا۔ ذکا کی زبان میں لکنت تھی اور وہ مجمع میں اپنا کلام خود نہیں پڑھا کرتے تھے۔ اس اعلان کا صاف مطلب یہ تھا کہ انھیں پڑھنے کا موقع نہ دیا جائے۔ یہ اس سے سخت بد دل ہوئے اور ۱۲۴۴ھ میں کرناٹک کا قیام ترک کر کے حیدر آباد چلے آئے۔

یہاں وہ سید محمد عباس (والد نواب مہدی نواز جنگ) اور عبدالوہاب صاحب کے ذریعے سے نواب مختار الملک کی سرکار تک پہنچے اور ان کے کاتبِ خصوصی مقرر ہو گئے۔ اُن دنوں حیدر آباد میں حافظ میر شمس الدین فیضؔ[1] کا طوطی بول رہا تھا۔ یہ بھی ان کے دامن سے وابستہ ہو گئے۔ لیکن جب ۱۸۶۲ء میں غالب کا شہرہ سُنا تو اُن سے اصلاح لینے لگے۔ ایک شعر میں ان کا ذکر کرتے ہیں ؎

آں کہ در حضرتِ اُو خامہ بعرضِ ادب است
شاہِ مردانِ سخن غالبِ عالی نسب است

---

[1] میر شمس الدین فیضؔ۔ یہ خاندان اصل میں دہلوی تھا سب سے پہلے ان کے دادا میر محمد رحمت اللہ خاں آصف جاہ ثانی کے عہد میں حیدر آباد آئے۔ فیضؔ کے والد میر امیر الدین تھے۔ فیضؔ ۱۱۹۵ھ میں حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ تاریخ ولادت "وجود مظہر کل" ہے۔ بارہ برس کی عمر میں قرآن حفظ کیا۔ عربی فارسی میں بہت اچھی دسترس تھی۔ ناخن سے نقش و نگار بنانے اور لکھنے کے فن میں اچھی مہارت تھی۔ کلام پر اصلاح حافظ تاج الدین مشتاق دہلوی (شاگرد خواجہ میر دردؔ) سے لی۔ روحانی فیض حضرت ابراہیم علی شاہ سے حاصل کیا۔ انھی کے خلیفہ بھی ہوئے۔ ۸۷ برس کی عمر میں ۲۱۔ نومبر ۱۸۶۶ء (۱۳۔ رجب ۱۲۸۳ھ) کو انتقال فرمایا۔ حیدر آباد میں لال دروازے کے باہر مزار ہے۔ یہاں ہر سال ۱۴۔ رجب کو عرس ہوتا ہے۔ ان کے شاگرد حکیم محمد مظفر الدین خاں معزؔ نے تاریخ وفات کہی ؎ شد سالِ اُو بوحت "باللہ وجود مظہر کل"۔ اردو فارسی کا مشترکہ مطبوعہ دیوان موجود ہے۔ کچھ نثری رسالے بھی لکھے تھے۔ جن میں سے کچھ چھپے باقی قلمی رہ گئے۔ دو صاحبزادے تھے "مولوی میر ضیاء الدین احمد" اور مولوی میر عماد الدین احمد متخلص بہ وصف۔

(محبوب الزمن (۲) ص ۹۱۳-۹۱۸؛ مرقع سخن (۱) ص ۱۳۵-۱۴۶)

مدتوں نواب مختار الملک کے میر منشی رہنے کے بعد تعلقدار درجہ سوم مقرر ہوئے۔ لیکن نواب صاحب نے ان کا حیدر آباد سے جانا گوارا نہ کیا اور ان سے کام اپنی پیشی ہی کا لیتے رہے۔ بعد میں ان کی جاگیر کی دیکھ بھال کے لیے علاقہ پر چلے گئے۔ وفات سے پہلے ناگر کرنول میں تعلقہ دار تھے۔ ۱۸۷۵ء (۱۲۹۱ھ) میں بعارضۂ فالج انتقال کیا۔ ۴۷ برس کی عمر پائی۔ حیدر آباد کے مشہور شاعر نواب حفیظ الدین خاں پاسؔ نے تاریخ کہی۔

"مات فی عشق رب حبیب اللہ"

حیدر آباد کے مشرقی محلہ پچپلی گوڑہ میں مدفون ہیں۔

ذکاؔ نے اپنی عمر میں دو نکاح کیے۔ پہلی بیوی سے ان کے ایک صاحبزادہ محمد میراں تہاؔ ہوئے اور دوسری سے محمد اسد اللہ۔ حیدر آباد کے مشہور شاعر حبیب اللہ وفاؔ موخر الذکر ہی کے بیٹے ہیں۔ ذکاؔ کا دیوان "خاش و خماش" محمد میراں تہاؔ ہی نے مرتب کر کے ۱۲۹۵ھ (۱۸۷۹ء) میں طبع کرایا تھا۔ اس پر جو مختصر تقریظ غالبؔ نے لکھی تھی، وہ اس کے شروع میں چھپی ہے۔ اور اردوئے معلیٰ میں بھی شامل ہے۔ اردو کلام بھی اُنھوں نے جمع کیا تھا لیکن اس کے چھپنے کی نوبت نہ آئی۔ اس کا قلمی نسخہ میرے پاس ہے۔ ان کی ایک اردو مثنوی بھی "جواہر الانسان" یعنی "پند نامۂ ذکاؔ" کے نام سے ۱۲۹۲ھ میں حیدر آباد دار الطبع سرکار عالی سے شائع ہوئی تھی۔ یہ نواب مختار الملک کے لیے لکھی گئی تھی اور اس میں ۳۲ صفاتِ کاملہ کا ذکر ہے۔

بہت پختہ اور زود گو شاعر تھے۔ ہجو پر بھی پوری قدرت حاصل تھی اور اس میں بیباکؔ تخلص کرتے تھے۔ یہ حصہ کلام چھپنے سے رہ گیا اور اب اس کے شائع ہونے کی کوئی اُمید بھی نہیں۔

مختصر انتخاب ملاحظہ فرمائیے۔

باغِ ہستی میں بہت میں کم رہا　　تو بھی روتا صورتِ شبنم رہا

طوفِ کعبہ سے غرض ہم کو بتوں کی دید ہے　　اے جنوں! رہنے دے پردہ جامۂ احرام کا

اے گل! دماغِ خندۂ بیجا نہیں مجھے　　آئی بہار، تو میں چمن سے نکل گیا

قایل ہوں میں غالب کے ذکاؔ! طرزِ سخن کا
ایسا کوئی دِلّی میں سخن ور نہ ہوا تھا

وہ مرے خون کا مشتاق، میں نظارے کا
میں اِدھر ہوں، تو اُدھر ہے مرا قاتل بیتاب

آئے ہیں بے بلائے، مرے گھر کو وہ، ذکاؔ!
بدلا ہے کچھ تو چرخِ ستم گار کا مزاج

بھری ہے سر میں مرے اس قدر ہوائے قدح
کہ اپنے نام پہ لکھتا ہوں "خاکِ پائے قدح"

پلادے ایسی ہی ساقی! شرابِ مرد افگن
کہ کوئی چل نہ سکے بزم میں سوائے قدح

قسمت کی بات ہے کہ ملیں زاہدوں کو حور
ہم پر حرام ہو رہے بنت العنب تلک

اتنا جنوں کو جوش ہے فصلِ بہار میں
دل اپنا ہاتھ میں ہے، نہ ہاتھ اختیار میں

جس قدر چاہو، ہوا خواہوں پہ بیداد کرو
پر تغافل کے سوا طرز اک ایجاد کرو

عشق میں اور بھی بہت ہیں کام
کیا کروں عمرِ تنگ فرصت کو

شیخ صاحب! مری بھی ہے اک عرض
آپ کرنا معاف جراَت کو

گر ذکاؔ کو لگا ہے عشق کا روگ
کیا اذیت ہے، کہیے حضرت کو؟

چھوڑ دوں نالہ، کچھ بھی بات ہے یہ
ناصحو! میرے دم کے ساتھ ہے یہ

عشق کا کب ہو زیست میں انجام!
وہ بڑا سانگ، چھوٹی رات ہے یہ

مایوس نہ کر ڈالے کہیں رنجشِ بے جا
ہم وصل کے وعدے پہ تقاضا نہ کریں گے

دل نشینی تمہارے قامت کی
مصرعِ انتخاب کیا جانے!

چشم بد دور! تری خوش نگہی
نرگسِ نیم خواب کیا جانے!

اس رُخ پہ خطِ سبز نکلنے کے دن آئے
کچھ رنگ زمانے کا بدلنے کے دن آئے

میں نے بازی میں عشق کی، اے زیست!
جیتے رہنے سے شرط ہاری ہے

اب فارسی کے چند شعر دیکھیے:۔

نادم کہ آخر از گِلِ من جام ساختند
صد شکر آبِ رفتہ در آمد بجُو مرا

جرمِ گناہ نیز بطاعت برابر است
باشد ذکاؔ! زتر شدن آخر وضو مرا

زکوے اُو بہمت قاصد التماسے چند | ہمی تپند بہر گوشہ، نیم جاے چند
نشستہ اند بکویت، بلاکشانے چند | کہ می کشند بجاے نفس، فغاے چند

ہجرانِ تو طاقت و تواں بُرد | فریاد کہ مایۂ فغاں بُرد
دستِ تو، زہر کہ خواست جاں بُرد | از دستِ تو جاں نمی تواں بُرد
صبر و دل و دیں، کہ جمع کردیم | عشقت آمد، یگاں یگاں بُرد

برخاستن بہ حشر ہم، آساں نبودہ است | با ایں فتادنی، کہ ذکا من فتادہ ام
خدا نکردہ، خدا گر شوی، چہ خواہی کرد | تو آں بتے، کہ ز قہرت حذر تواں کردن

[گلزارِ اعظم، ص ۱۹۷-۱۹۹؛ تزک محبوبیہ (۲)،
دفترِ ہفتم، ص ۶۳-۶۴؛ محبوب الزمن (۱) ص ۴۴۳-۴۴۴]

ذکی ـــــ حکیم اشفاق حسین مارہروی

۱۹۳۰ء میں انتقال ہوا۔ [زمانہ، جنوری ۱۹۴۹ء، ص ۸-۹]

رابط ـــــ میرزا حسن رضا خاں صاحب دہلوی

[تزک محبوبیہ (۲) دفترِ ہفتم، ص ۳۱]

راضی ـــــ دیوان جانی بہاری لال جی اکبر آبادی

جانی بیج ناتھ کے بیٹے اور قوم کے ناگر برہمن تھے۔ آگرے میں پیدا ہوئے اور

یہیں کالج میں تعلیم پائی۔ انگریزی خوب لکھتے تھے۔ فارسی کے علاوہ عربی اور سنسکرت میں بھی اچھی دستگاہ تھی۔ فارسی کا ذوق بہت پاکیزہ تھا۔ زندگی مدرسی سے شروع کی اور اسی سلسلے میں اعظم گڈھ اور بنارس میں قیام رہا۔ اس کے بعد فوجی انگریزوں کے پڑھانے کا پیشہ اختیار کیا اور سات برس تک پلٹنوں کے ساتھ شمالی ہند کے اکثر شہروں کا چکر کاٹ گئے۔ محکمے کی سفارش پر اوّل مہاراجہ سجن سنگھ رانا میواڑ کے اتالیق اور بعد میں راجہ جسونت سنگھ کے زمانے میں ریاست بھرت پور میں راجپوتانہ ریذیڈنسی کے وکیل رہے۔ مرنے سے پہلے ریاست کچھ (کاٹھیاواڑ) میں دیوان ہو گئے تھے۔ بہت لمبی عمر پائی۔ ۱۸۹۵ء میں فوت ہوئے۔ تمام عمر مجرد رہے۔ تاہل کے کھٹراگ میں پڑے ہی نہیں۔

دیوان ۱۸۶۲ء میں مطبع دربار بھاؤ نگر سے شائع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ گلستاں (نگار راقمی) بوستان (دلآرام راقمی) اور کلیلہ و دمنہ (اثر رنگ راقمی) کے اردو منظوم ترجمے اُن سے یادگار ہیں۔ نثر میں بھی تعریفِ زبانِ فارسی۔ یادگارِ راقمی۔ دستورِ تحریر وغیرہ ان کی تصنیفات میں سے ہیں۔

اخلاقی مضامین سے زیادہ شغف تھا۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

چشمِ بیمار نے، کیسا مجھے بیمار کیا
نہ دوا فائدہ کرتی ہے کسی کی، نہ دعا

ہم جسے سمجھے تھے اپنا، وہ بھی اپنا نہ ہوا
دل بھی دشمن ہوا، اس دشمنِ جاں کی خاطر

مکاں سے عیب چھپتا ہے، مکیں کا
چھپاتی ہے بدی سیرت کی، صورت

جی جان سے تجھ کو چاہتا ہوں
تو چاہ، نہ چاہ مجھ کو، میں تو!

صاحبِ ہمت ہمیشہ کرتے ہیں تدبیر کو
پست ہمت روتے رہتے ہیں صدا تقدیر کو

کچھ نہ ٹھہرے، نگاہ میں تیری
مفت رسوا ہیں، چاہ میں تیری

ہے جو صورت نگاہ میں تیری
کوئی چڑھتا نہیں ہے آنکھوں میں

ہے وہ جذبہ نگاہ میں تیری
کھینچ لیتا ہے دل کو آنکھوں میں

تو اچھا ہے، پھر کیوں ترا دل برا ہے
برائی سے اچھوں کو ہوتی ہے نفرت

کیوں، دلا! مفت خوار ہوتا ہے؟
بے وفاؤں سے، دوستی کر کے

چاہے کوئی دعا کرے، چاہے دوا کرے
مشکل ہے زندگی ترے بیمارِ عشق کی

عاقل کو یہاں ایک دم آرام نہیں ہے
آرام سے جاہل کی گذرتی ہے ہمیشہ

شیخ جی، آپ کی نصیحت سے — عشق اور استوار ہوتا ہے
بھول جاتا ہے آپ کو، کم اصل — کچھ بھی گر اقتدار ہوتا ہے
حسن تسخیر سے نہیں خالی — عشق بے اختیار ہوتا ہے

[تذکرہ آثار الشعرائے ہنود، ص ۶۳ - ۶۴ ؛
بہارِ سخن، ص ۱۶۶ ؛ خم خانۂ جاوید (۳) ص ۲۴۲ -
۲۴۶]

راقم ——— خواجہ میرزا قمر الدین خاں دہلوی

ان کے بزرگ 'غالب کے دادا میر قوقان بیگ خاں کے ساتھ وسطِ ایشیا سے ہندستان آئے تھے۔ بلکہ اگر مرزا فرحت اللہ بیگ کا بیان تسلیم کیا جائے تو راقم کے پردادا اور غالب کے دادا آپس میں بھائی بھائی تھے۔ اگرچہ یہ دعویٰ مشکوک اور محلِ نظر ہے، تاہم اس میں شک نہیں، کہ راقم اور غالب کے بزرگوں کے باہم بہت گہرے تعلقات تھے۔

غالب کی سوانح عمری میں خواجہ حاجی کا ذکر بہت نمایاں ہے۔ یہی خواجہ حاجی راقم کے دادا تھے۔ ان کے دو صاحبزادے تھے، بڑے خواجہ شمس الدین خاں عرف خواجہ جان (متوفی ۱۸۷۲ء) اور چھوٹے خواجہ بدر الدین خاں عرف خواجہ امان (متوفی ۱۸۷۹ء) خواجہ امان کا نام اردو ادب میں بوستانِ خیال کے مترجم کی حیثیت سے بہت مشہور ہے اس کی ایک جلد حدائق انظار یا معز نامہ پر غالب نے جو دیباچہ لکھا تھا، وہ اردوئے معلیٰ میں بھی شامل ہے۔

خواجہ قمر الدین خاں، ۱۸۳۲ء میں دہلی میں پیدا ہوئے، اور تعلیم ختم کرنے کے بعد سولہ برس کی عمر میں لال قلعہ میں ملازم ہوگئے۔ اسی زمانے میں بہادر شاہ ظفر سے تیر اندازی

سیکھی۔ چندے مرزا فخرو دلی عہد ظفر کے دامن سے بھی وابستہ رہے۔ جب ۱۸۵۶ء میں
ان کا انتقال ہوا تو یہ اپنے والد خواجہ امان کے پاس الور چلے گئے۔ جو اُن دنوں وہاں
مہاراجہ شیو دھیان سنگھ کے اتالیق تھے۔ ۱۸۵۸ء کے مقامی ہنگامے میں جب تمام
دلی والے الور سے نکالے گئے، تو راقم بھی ان کے ساتھ نکلے۔ یہاں سے یہ پہلے جے پور
گئے اور پھر وہاں سے دہلی چلے آئے۔ یہاں آ کے اپنے والد کا بوستانِ خیال کے
ترجمے میں ہاتھ بٹاتے رہے۔ جب ۱۸۷۹ء میں امان کا انتقال ہو گیا، تو انھوں نے
اس کی ساتویں جلد کی اشاعت کا انتظام کیا، جو خواجہ امان چھوڑ مرے تھے اور اس
کے بعد دو مزید جلدوں کا ترجمہ کر کے اُنھیں بھی شائع کیا۔

راقم کے دادا خواجہ حاجی انگریزی حکومت کے وظیفہ خوار تھے۔ چنانچہ اُنھیں
سالانہ دو ہزار روپیہ انگریزی خزانے سے ملتا تھا۔ کچھ دن کے لیے یہ پنشن ریاست لوہارو
کے خزانے سے ملتی رہی لیکن جب ۱۸۳۵ء میں نواب شمس الدین احمد خاں کو پھانسی
ہوئی تو ریاست سے متعلق تمام ایسے وظیفے دہلی کلکٹری سے ملنے لگے۔ خواجہ حاجی
۱۸۲۰ء میں فوت ہوئے۔ ان کے بعد یہ پنشن اُن کے دونوں بیٹوں کے نام منتقل ہو گئی
ور اُن کے بعد ان کی اولاد کو ملتی رہی۔ یہی وجہ ہے کہ راقم بھی اس پنشن میں حصہ دار
ان گئے۔ اس کے علاوہ اُنھیں سوائی مہاراجہ رام سنگھ حکمران جے پور کی سرکار سے بھی
معقول وظیفہ ملتا رہا۔ چنانچہ اسی تعلق کے باعث یہ دہلی چھوڑ کر مستقل طور پر جے پور
چلے گئے۔ اور اپنی عمر کے آخری ۲۱ برس یہاں مقیم رہے۔ اُن کی اولاد اب بھی وہاں ہے۔

خواجہ قمر الدین خاں کی شادی میرزا غالب کے بھانجے میرزا عاشور بیگ کی صاجزادی
بیگم سے ہوئی تھی۔ اس بیوی سے اُنھوں نے اپنی یادگار جسمانی تین اولادیں چھوڑیں۔
لڑکیاں احمد النساء بیگم اور شمس النساء بیگم اور ایک لڑکا خواجہ امیر الدین خاں۔ یہ
شعر کہتے تھے۔ آثم تخلص تھا۔ ان کا انتقال ۱۴۔ اگست ۱۹۲۱ء (۹۔ ذی الحجہ ۱۳۳۹ھ)
ہوا۔ اولادیں صرف پانچ لڑکیاں تھیں۔ فرزند نرینہ کوئی نہیں تھا۔

راقم نے جے پور ہی میں مارچ ۱۹۱۰ء میں اٹھتر (۷۸) برس کی عمر میں وفات پائی۔

مدفن بھی یہیں سانگانیر دروازہ کے باہر، رام نواس باغ کے قریب "قدم رسول" کے احاطے میں حکیم محمد سلیم خاں خستہ کے (جن کی کتاب تکشیف پر غالب نے قطعۂ تاریخ لکھا ہے) مزار کے جوار میں ہے۔ قبر پر کتبہ نہیں۔ عجیب اتفاق ہے کہ زندگی میں بھی دونوں دوستوں کے مکان دیوار بہ دیوار رہے، اور مرنے کے بعد قبریں بھی پاس پاس ہی ہیں۔

۱۹۰۱ء میں کلیات نغمۂ اُردو کے نام سے شائع ہوا تھا۔ (افضل المطابع دہلی) ایک اور کتاب سبعۂ سیارہ لکھی تھی جس میں سیّاروں وغیرہ کے حالات ہیں۔ یہ بھی چھپ چکی ہے۔ عقدِ ثریا کے نام سے عورتوں کی زبان میں ایک قصہ لکھا تھا۔ اس کا صرف پہلا حصہ چھپا۔ دیوانِ غالب کی ایک شرح بھی لکھی تھی۔ یہ نہیں چھپی، بلکہ غالباً اس کا مسودہ بھی ضائع ہو گیا۔ اگرچہ پختگی اور زبان پر قدرت لفظ لفظ سے ظاہر ہے۔ لیکن کلام میں کوئی ندرت نہیں۔ اپنے زمانے کے رسمی مضامین کے دائرے سے باہر نہیں نکلتے، بلکہ واقع یہ ہے کہ بیشتر کلام بے مزہ ہے۔

مختصر انتخابِ کلام درج کرتا ہوں۔

اللہ! میں ہوں اور یہ غمِ وصلِ یار کا — تو جانتا ہے دردِ دلِ بے قرار کا

آجاؤ پھرتے چلتے کبھی غم کدہ میں تم — آنکھوں سے ہم بھی دیکھ لیں آنا بہار کا

ہم نے اس ناز سے دیکھا ہے کسی کو آتے — آج راقمؔ بھی اگر دیکھتا، حیراں ہوتا

مجھ کو وہ یاد کرے، ہوش کی ہو! اے قاصد — جس کے لب پر نہ کبھی نام خدا کا آیا

پہلے ہی چشمِ مست تھی اس کی نظر فریب — میری نظر نے اور فسوں گر بنا دیا

اے ہجومِ نا امیدی! صبر کر — اب زمانہ ہو چکا اقرار کا

طعنِ احباب سہے، سرزنشِ غیر سہی — عشق میں ننگ نہیں چاک گریباں ہونا

یاں بھروسا ہی نہیں سانس کا، آیا آیا — واں ملاقات کا وعدہ ہے پسِ فردا بھی

کوئی ہوگا تمہاری خلوت میں — خوش گیا اور شادماں اٹھا

کیسا جنونِ عشق نے خود بیں کیا مجھے — انجام کا خیال نہ آغاز دیکھنا

جاں نذر میں نہ کر سکا، میری خطا سہی — خنجر گلے پہ رد کیا کس کا قصور تھا

دیکھ کر حضرتِ واعظ کو، خدا کی سوگند! | کفر اچھا ہے نہیں، ہم نے تو ایماں چھوڑا

ناصح! تمہاری بات تو میں مان لوں، مگر | سمجھا کے دل کو لاؤ، وہ نادان تو گیا

آئے تھے اگر ملنے، دم بھر تو ٹھکے ہوتے | کچھ میری سنی ہوتی، کچھ آپ کہا ہوتا

قیس و فرہاد کی شہرت ہو، خدا کی قدرت! | تو صلہ عشق کا، کس کس نے کیا میرے بعد

کہتے ہو، کسی غیر سے اب ربط نہیں ہے | اچھا، تمہیں سچے سہی، میں نے ہی سنا اور

مانا، کہ وفادار نہیں ہم، تمہیں سچے | تم سا بھی وفا شیوہ نہیں، نام خدا اور

اس کے وعدہ کی انتہا ہی نہ حد | عمر اپنی کرے وفا کب تک

جس بزم میں گئے ہیں، ہنسا کر اٹھے ہیں ہم | جب تم سے بات کی ہے، رلا کر رہے ہو تم

جینے کا لطف، مرنے کی لذت کسے نصیب | جو دیکھتے ہیں غم کی فراوانیوں میں ہم

کیوں ہم کو کوئی پوچھے! تعلق نہیں جسے | اچھے ہیں یا برے ہیں، کسی کی بلا سے ہم

کل کون جیے، کون مرے، کس کو بھروسا | مل جاؤ بس اب وعدۂ فردا نہ کرو تم

جفا کرلو، ستالو، دیکھنا محشر کے میداں میں | کہ دامن ہاتھ میں کس کے ہے، کس کا منہ گریباں میں

زاہد! نجات کے لیے طاعت نہیں ضرور | کچھ بندگی، ذریعۂ عفوِ خطا نہیں

کوچۂ یار ابھی دور ہے، دل بیٹھ گیا | دشت میں دیکھنے کو سایۂ دیوار نہیں

جوشِ مستی میں چلے آئے کہاں تم، راقم! | یہ تو مسجد ہے، جلوخانۂ خمار نہیں

کیا مستیاں ہیں ان کو غرورِ شباب میں | ڈوبے ہوئے ہیں حسن کی گویا شراب میں

تیرِ نظر میں اُس کے دونوں چھدے پڑے ہیں | دیوانہ رہ گذر میں، فرزانہ انجمن میں

جان پیاری ہے، تو الفت کے کبھی پاس نہ جائے | غیر ہو، کوئی ہو، ہم عام صدا دیتے ہیں

سنتے ہیں نالوں سے تسکین ہوا کرتی ہے | یاں تو کم بخت سوا آگ لگا دیتے ہیں

واں کل کا وعدہ وہ، کہ وفا کا گماں نہیں | یاں غم کی رات یہ، کہ سحر کا نشاں نہیں

منزل کی ہے تلاش، پتا کس سے پوچھیے | رہ رو نہیں، غبارِ پسِ کارواں نہیں

وہ کام نہیں یاں، کہ بے چارہ گروں سے | وہ درد نہیں یاں، کہ مسیحا سے دوا ہو

ہے اگر فرقت یہی اور ہجر کا آزار بھی | جان سے ہم بھی گئے، ہم سے دلِ بیمار بھی

یادگاروں میں اسدؔ کے ہے یہ بندہ راقمؔ — کیا ہوا بزمِ سخن میں نہیں شہرت میری

بلا سے اس کی، کسی جان کا زیاں ہو جائے — درازدستیِ قاتل کا امتحاں ہو جائے

بلا سے ہم سے نہیں، غیر سے کرو اُلفت — کسی کا دل تو کبھی تم سے شادماں ہو جائے

تم رہو، غیر رہے، تم کو مبارک عشرت — ہم چلے جائیں گے محفل سے، ہمارا کیا ہے

حسنِ زیبا لاکھ نظروں سے چھپاتے جائیے — اور کھلتا جائے گا، جتنا چھپاتے جائیے

رات سے مضطرب ہے دل، راقمؔ! — دیکھ آیا یہ بے قرار کسے!

ہونے کو ہے شاید کوئی سامانِ خدا ساز — جو شام سے ہے اور ہی رونق مرے گھر کی

دیر ہو، کعبہ ہو، عشرت کدہ ہو، کوئی ہو — ہم تو مشتاق نہ ہوں گے، ترے گھر کے ہوتے

ہم بھی سنتے ہی رہے، آپ بھی کہتے ہی رہے — روز وعدے ہی رہے شام و سحر کے ہوتے

ہائے راقمؔ نہ رہے حضرتِ غالبؔ سر پر — قدر فرزند کی ہوتی ہے پدر کے ہوتے

یک دو دن کا تماشا ہے گلستانِ جہاں — کون رہتا ہے یہاں، اور وطن کس کا ہے

درد کا ضبط نہ کرنا تو ہے میری تقصیر — خامشی شیوہ یہ ہنگامِ سخن کس کا ہے!

تم ہی سمجھو، کہ وفاخو ہے طبیعت کس کی — تم ہی جانو، کہ دلِ عہد شکن کس کا ہے

عشق کی ابتدا میں، اے ناصح! — سوجھتا ہے مآلِ کار کسے

وہ بات ہی گئی، تمھیں تھی جس کی احتیاط — مدت ہوئی، کہ عشق کی تشہیر ہو چکی

گردشِ بخت تو تھی ساتھ ازل سے، راقمؔ! — یہ بری ساتھ لگی گردشِ دوراں تیرے

تم کہو، دشمن کہیں، ناصح کہے اور ہم سنیں — جو خدا سنوائے ہم کو، بس وہ سننا چاہیے

ہم سے تم کو لاکھ ہوں گے، تم سا ہم کو ہے کہاں — تم اگر مل جاؤ ہم کو، پھر ہمیں کیا چاہیے

[مضامینِ فرحت (۵)، ص ۱۹۵ - ۲۰۵ ؛
احوالِ غالب، ص ۲۹۰ - ۲۹۴ ؛ خم خانۂ جاوید (۳)
ص ۳۵۵ - ۳۶۱ ؛]

رُسوا ــــــ شیخ محمد عبد الحمید غازی پوری

شیخ امداد علی کے بیٹے تھے۔ ۱۸۴۹ء میں غازی پور میں پیدا ہوئے۔ ان کے اکثر اعزہ و اہلِ خاندان سرکارِ انگریزی میں اعلیٰ عہدوں پر متمکن تھے۔ یہ خود چندے آگرے میں محرر رہے۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں کہتے تھے۔ اُردو میں مرزا حاتم علی مہر سے اور فارسی میں غالبؔ سے اصلاح لی۔ بہت پُرگو تھے۔ نمونۂ کلام یہ ہے :۔

اُردو :۔

کہا میں نے ذرا ٹھہرو، تو دل لے دلربا ٹھہرے ۔۔۔ کہا اُس گیسوؤں والے نے، اب کس کی بلا ٹھہرے

نہیں کچھ فصلِ گل بھی دُور گر ہے زندگی باقی ۔۔۔ خزاں کی یہ مصیبت جھیل لے بلبل، ذرا ٹھہرے

قدم پڑتا نہیں ہے، جب کہیں پر فرطِ مستی میں ۔۔۔ تو پھر روئے زمیں پر کیا برابر نقشِ پا ٹھہرے

فارسی :۔

یا گہر می جوشد، از لعلِ تبسم ریزِ تو ۔۔۔ یا بہ چرخِ حسنِ تاباں، شد ثریائے دگر

کردہ ام بسیار عصیاں، یا شفیع المذنبین! ۔۔۔ جُز جنابِ تو ندارم، ہیچ ملجائے دگر

فاش می گویم، میانِ عاشقاں، گر بشنوی ۔۔۔ ہمچو من لے جاں! نخواہی یافت رسوائے دگر

[شعر و سخن، ص ۴۵-۴۸]

شکیؔ ــــــ نواب محمد علی خان بہادر جہانگیر آبادی

نواب محمد مصطفیٰ خان شیفتہؔ کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے۔ ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والدِ عالی مقدار کی نگرانی میں گھر پر ہوئی۔ مفتی صدر الدین خاں آزردہ سے عربی پڑھی۔ بعد میں انگریزی کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور اس میں بھی اچھی دستگاہ پیدا کر لی تھی۔ جس زمانے میں حالیؔ جہانگیر آباد میں تھے۔ یہ بھی اُن کی

اتالیقی میں رہے۔ اپنے والدِ بزرگوار کی وفات کے بعد جاگیر کے وارث ہوئے سرکار انگریزی میں ان کی آؤ بھگت تھی۔ چنانچہ ضلع بلند شہر میں انھیں مجسٹریٹی کے اختیارات حاصل تھے۔ ۱۸۹۰ء میں صوبجات متحدہ کی طرف سے وائسرائے کی کونسل کے ممبر نامزد ہوئے۔ پانچ سال بعد ۱۸۹۵ء میں خان بہادری اور نوابی کے خطاب ملے۔ نواب سر حامد علی خاں والیِ رام پور کے زمانۂ نابالغی میں انھیں انتظام ریاست میں مدد دینے کے لیے ایک کونسل مقرر ہوئی تھی، جس میں محکمۂ مال (ریونیو) کے ممبر خان بہادر سید علی حسن تھے۔ انھوں نے بعارضۂ تپ دق اپریل ۱۸۹۵ء میں انتقال کیا، تو ان کی جگہ نواب صاحب موصوف نے سرکارِ انگریزی کی منظوری سے نواب محمد علی خاں رشکی کو اس کونسل کا ممبر مقرر کر دیا۔ اس عہدے کی تنخواہ بارہ سو روپیہ ماہانہ تھی۔ یہ ۲۴ مئی ۱۸۹۵ء کو اس عہدے پر متمکن ہوئے۔ یکم جون ۱۸۹۶ء کو یہ کونسل ٹوٹ گئی اور نواب صاحب برامور کو اختیاراتِ کاملہ حاصل ہوئے۔ چنانچہ رشکی بھی اس عہدے سے سبک دوش ہوگئے۔ اس کے بعد اُن کے چھوٹے سوتیلے بھائی نواب محمد اسحاق خاں، ریاست میں مدار المہام ہو کر تشریف لے گئے۔

رشکی ۲۰ - مئی ۱۸۹۹ء (۹ - محرم ۱۳۱۷ھ) کو کار بنکل سے لاولد فوت ہوئے۔ اپنے والدِ گرامی کے پہلو میں سلطان جی میں مدفون ہیں۔ میر مہدی مجروح نے قطعۂ تاریخ لکھا ہے

زہے امیرے محمد علی بخاں مشہور | کہ بد عقیل و فہیم و ذکی و خوش تقریر
رفیقِ بذل و عطا بود در زمانہ ثمر | بہ نظم و نثرِ سخن بود بے عدیل و نظیر
ہزار حیف! کہ آں قدر دانِ اہلِ ہنر | بسوے ملکِ بقا شد ازیں سرائے اثیر
پئے سنینِ وفاتش خرد بمن فرمود | بگرے "رفت زدنیائے امیر ابن امیر"

۱۳۱۷ھ

مولانا حالی کی کہی ہوئی تاریخ وفات میں مادۂ تاریخ "بخشش زحق" (۱۳۱۷ھ) ہے۔ انھوں نے ایک قطعہ بھی کہا تھا، جو اُن کے فارسی دیوان میں شامل ہے۔

تلامذۂ غالب

اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اُردو کے چند شعر ملاحظہ کیجیے:۔

بے وفا تجھ سے کیا نہیں ہوتا — ایک وعدہ وفا نہیں ہوتا
قیس کی دھوم مچ رہی ہے، مگر — عشق اس سے سوا نہیں ہوتا
شائبہ جور کا نہ ہو جب تک — لطف میں کچھ مزا نہیں ہوتا
چھیڑ دیتے ہیں اُن کو ہم بھی کبھی — گرچہ کچھ مدّعا نہیں ہوتا
ایک رشکیؔ، ہمیں نہیں ہوتے — ورنہ واں اور کیا نہیں ہوتا

کیا کیا بنا کے ہم نے سنایا، رقیب کو — مضمون تیرے نامۂ اُلفت طراز کا

رنجش کا گرچہ کوئی سبب درمیاں نہ تھا — لیکن وہ آپ صلح کریں، یہ گماں نہ تھا
مانگی جو اس نے جان، تو خیر دل پہ آبنی — حالانکہ اک ہنسی تھی فقط، امتحاں نہ تھا

چارہ گر! فکرِ علاجِ دلِ وحشی ہے غلط — کوچۂ یار ہی چھوٹا، تو گلستاں کس کا

شکوے ہمارے سارے غلط ہی سہی، مگر — لو، تم ہی اب بتاؤ، کہ کس کا قصور تھا

کیا نیا ظلم کوئی یاد آیا! — ہم پہ کیوں مہرباں ہیں آپ
لائقِ قتل، میں ہی ٹھہرا ہوں — سچ تو یہ ہے کہ قدرداں ہیں آپ

بے قراری ہے کم ہماری آج — کیا نظر بھر گئی تمہاری آج
وہ منانے کو آئے ہیں رشکیؔ — نبھ نہیں سکتی وضعداری آج

ہے دگرگوں ابتدائے عشق میں رشکیؔ کا حال — رحم آتا ہے مجھے اُس کی جوانی دیکھ کر

فرصت نہیں ہے اپنے ہی عالم کی سیر سے — فرصت بھی ہو تو رخصتِ سیرِ چمن کہاں
یہ منصبِ بلند، ملا جس کو مل گیا — ہر مدّعی کے واسطے دار و رسن کہاں

آئے تو اپنا حال، کچھ اُن سے نہ کہہ سکا — کیا جانے، ہو گیا مجھے کیا اضطراب میں

بیشتر وقت سے مرنا، سو وہ امکاں میں نہیں — اور جینا بھی کچھ آساں شبِ ہجراں میں نہیں
اہلِ دل سے نہ کبھی آپ سنیں گے نالہ — چاک دل میں ہے، مگر چاک گریباں میں نہیں

محبت ہے بہت مجھ کو، کسی سے — خوش آئے آپ کو بھی گر بیاں ہو
کریں کچھ چھیڑ اُن سے آج، رشکیؔ! — اگر تم بھی ہمارے ہم زباں ہو

تم سے گلہ نہیں ہے، ہمارا قصور ہے
اوپر اُٹھائیے نگہِ شرمسار کو

مزا اُلفت کا، جانِ زار سے پوچھ
یہ نکتہ واقفِ اسرار سے پوچھ

بھلا رشکی کو، قدرِ فصلِ گل، کیا
یہ کیفیت، کسی مے خوار سے پوچھ

وہ باتیں، جو کہ ان سے تھیں چھپاتی
غضب ہے، کہہ رہا ہوں میں انھیں سے

ہزاروں مہر و الفت کی ادائیں!
سمجھ لیتے ہیں ہم تیری نہیں سے

نہیں ہیں سب سے یہ برتاؤ اُس کے
مگر کچھ لاگ ہے رشکی تمھیں سے

ہر چند دل سے اس کو بھلاتا رہا مگر
یاد آگیا، کسی نہ کسی بات پر مجھے

ایسی کہانیاں کہیں رشکی نے درد خیز
کم بخت نے نہ سونے دیا رات بھر مجھے

[اخبار الصنادید (۲) ص ۳۶۱ و ۳۶۷؛
خم خانۂ جاوید (۳) ص ۴۲۲ - ۴۳۲]

رشکی ـــــ قاضی محمد عنایت حسین بدایونی

صدیقی شیخ تھے سلسلۂ نسب محمد بن ابوبکر صدیق رض (خلیفۂ اول) سے ملتا ہے۔ والد کا نام محمد نقی حمیدی تھا۔ ۱۸۔ مارچ ۱۸۳۲ء (۱۵۔ شوال ۱۲۴۷ھ) کو پیدا ہوئے۔ فارسی اپنے والد سے اور عربی قاضی عبد السلام سے پڑھی۔ پہلے سرکار انگریزی میں سررشتہ دار عدالت بدایوں رہے۔ پھر نواب محمد علی خاں رئیس ٹونک کی مصاحبت اختیار کی اور جب وہ معزول ہوئے تو بھی حقِ رفاقت ادا کیا۔ ان کی وفات کے بعد وکالت کرنے لگے اور اس سلسلہ میں مختلف مقامات خورجہ، جودھپور اور سب سے آخر حیدر آباد دکن میں مقیم رہے جب موسی ندی میں طغیانی آئی (۱۹۰۸ء) اور ان کا گھر بارنذرِ سیلاب ہوا تو ان کا کلام بھی ضائع ہو گیا۔

حضرت خواجہ اللہ بخش تونسوی رح سے بیعت تھے۔ طبیعت پر تصوف کا غلبہ تھا۔ یہ

کلام سے بھی ظاہر ہے۔ ۱۴۔ نومبر ۱۹۱۸ء (۹۔ صفر ۱۳۳۷ھ) کو بدایوں میں انتقال ہوا۔ اور حضرت سید احمدؒ (والدِ بزرگوار نظام الاولیاؒ) کی درگاہ میں دفن ہوئے۔ اولاد میں دو لڑکے تھے۔ عطا حسنین اور حبیب حسنین محمد اکبر۔ ثانی الذکر حیات ہیں۔ محلہ سوتھہ بدایوں میں سکونت ہے۔

صرف چند شعر لیے۔

دیکھ کر اغیار کو، کی آنکھ بند
پردے پردے میں اشارا ہو گیا

ہم گنہگار ہیں، مانا، واعظ!
لطفِ داور نہیں دیکھا جاتا

وقتِ آخر ہے، جو آنا ہے، تو آؤ، صاحب!
اب نہیں ہے نہیں جینے کا بھروسا دم بھر

مدینہ میں نہیں جو دل، وہ کیا دل!
مدینہ ہے چمن، دل ہیں عنادل

مٹے جو الفتِ خیر الورا میں
ہمیں ایسا کہیں دے دے خدا دل

دل دیا، جان بھی دی، وصل کا سائل نہ ہوا
اور بھی آپ نے کچھ میری خطائیں دیکھیں؟

وہ آئیں پس از مرگ، اُمید کیا ہے؟
ہم اپنے نصیب آزمائے ہوئے ہیں

یہ مانا، ہم نہ کریں شکوۂ ستم، لیکن
خدا کے سامنے ہونا کبھی حساب بھی ہے

دیس کے گانے کی اس محفل میں لے ہونے لگی
یاد ہم کو بھی وطن کی پے بہ پے ہونے لگی

روز گردش ہے نئی، جور کے انداز نئے
پیس ڈالے نہ یہ چرخِ ستم ایجاد مجھے

آگ سی آگ ہے، بیتاب ہوں، دیکھو خواجہ!
خاک کر دے نہ کہیں، اب مری فریاد مجھے

وہ آئیں بے بلائے میرے گھر، یوں ہو، تو بہتر ہو
ہماری آہ کا اُن پر اثر یوں ہو، تو بہتر ہے

کسی کی یاد دل میں ہو، کسی کا نام لب پر ہو
ترا، رشکی! اگر آخر سفر یوں ہو، تو بہتر ہے

پاؤں سے جاتے ہو کوئے یار میں
سر اُٹھا رکھا ہے کس دن کے لیے

[دیوان نظامی بدایونی (تجلیاتِ سخن)، ص ۲۹؛
مکتوب قاضی غلام سجاد بسمل بدایونی بنام مؤلف]

رضواںؔ ـــــ میرزا شمشاد علی بیگ خاں دہلوی ثم حیدرآبادی

نواب مرزا عالم بیگ خاں کے صاحبزادے اور مرزا قربان علی بیگ خاں سالکؔ کے چھوٹے بھائی تھے۔ ۱۸۳۷ء (۱۲۵۳ھ) میں پیدا ہوئے۔ غالبؔ سے فارسی پڑھی اور انھیں سے کلام پر اصلاح بھی لی۔ الور میں ملازم تھے۔ پہلے وکیل، پھر ڈپٹی مجسٹریٹ رہے۔ شطرنج کا بہت شوق تھا۔ اور کھیلتے بھی خوب تھے۔ نواب علاؤالدین احمد خاں علائیؔ نے ریورنڈ فینٹن صاحب بہادر کے ایما پر ایک سوسائٹی "جلسۂ شطرنج دہلی" کے نام سے قائم کی تھی جس کا مفصل ذکر علائیؔ کے ترجمے میں دیا گیا ہے) رضواںؔ بھی اس کے رکن تھے۔ اس سوسائٹی سے متعلق انھوں نے ایک مختصر رسالہ "بساطِ فرنگ" کے نام سے لکھا تھا، جو ۱۸۶۷ء میں اکمل المطابع دہلی سے شائع ہوا تھا۔ اور بھی چند رسالے نثر میں لکھے۔ چالیس برس کی عمر تھی، جب ۱۸۷۶ء (۱۲۹۳ھ) میں انتقال کیا۔ سالکؔ کا مرثیہ موجود ہے۔

طبیعت بہت دقّت پسند اور مضمون آفریں پائی تھی۔ معمولی بات کو بھی پیچ سے کہنے کا شوق تھا۔ چند شعر دیکھیے۔

آئینہ دارِ ذات ہے، آئینۂ صفات ـــ ہے ذرہ ذرہ آئینہ اس کے جمال کا

دیتے ہیں بے طلب بہ مقصد بقدرِ ظرف ـــ شرمندہ اے کلیم! ہوا کیوں سوال کا

رضواںؔ! خدا کو مان، یہ ظاہر پرستیاں ـــ کم بخت! کچھ بھی خوف ہے تجھ کو مآل کا

نظر آتی نہیں، چپ بیٹھ کے بھی تجھ سی نجات ـــ اب تو ناصح! نہیں یارائے تکلم مجھ کو

شرمِ ستم گری سے بن آتا نہیں انھیں ـــ اندازِ لطف کا، دلِ غم آشنا کے ساتھ

بے تابیاں نہ کیونکہ ہوں، آئینہ دارِ راز ـــ شوخی غضب ہے اس کی نگاہِ حیا کے ساتھ

ہم یاس وضع سو رہے، ناکام بیش تر ـــ نازک دماغیاں بھی ہیں یاں التجا کے ساتھ

ہم مر گئے خوشی میں، وہ یاں آئے اس طرح ـــ یہ ظلم کس سے کہیے، کہ مارا وفا کے ساتھ

کہہ چکے آپ، سن چکے ہم، پھر ـــ کہتے ہو، کہیے، ماجرا کیا ہے

خود تماشا ہے، خود تماشائی　　کون جانے وہ خود نما کیا ہے
میں تو موسیٰ نہیں، کہ ہوں محروم　　جلوہ پردے میں، اے خدا کیا ہے

[خم خانۂ جاوید (۳)، ص ۴۵۱-۴۵۴]

رضوانؔ —— نواب محمد رضوان علی خاں بہادر عرف محمود اختر مرادآبادی

مرادآباد کے رؤسا میں سے تھے۔ عضد الدولہ نواب محمد عظمت اللہ خاں بہادر ناظم روہیل کھنڈ ان کے جدِ اعلیٰ تھے۔ عربی اور فارسی کی تعلیم زمانے کے رواج کے مطابق گھر پر ہوئی۔ علومِ متداولہ میں اچھی خاصی دستگاہ تھی۔

جس زمانے میں غالبؔ رام پور گئے ہیں، یہ اُن کے شاگرد ہوئے۔ غزل کی طرف کم توجہ تھی اور نعت سے زیادہ شغف تھا۔ جب حج کے لیے گئے تو مدینہ منورہ میں روضۂ اقدس پر اپنی مشہور نعت پڑھی جس کا مطلع ہے ؎

اترائیں نگاہیں، جو پڑیں سوئے محمدؐ
دل لوٹ گیا دیکھتے ہی روئے محمدؐ

اس پر حاکمِ مدینہ خالد پاشا نے حسان الہند کا خطاب دیا۔ یہ نعت بہت مقبول ہوئی اور مدت تک طرح ہوتی رہی۔ امیر مینائی نے اُسے تضمین کیا ہے۔ مولوی فرید احمد وفا مرادآبادی نے بھی اُسے تضمین کیا۔ خود رضوانؔ نے اُسے مختلف ڈھنگ سے تضمین کیا یعنی مثلث، مخمس، معشر وغیرہ اور ان تمام تضمینوں کو "طغرائے کمال" کے تاریخی نام سے ۱۳۱۱ھ میں شائع کیا۔

اس نعت کی مقبولیت کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ مشہور مسیحی شاعر جارج پیش شورؔ[1] نے ردیف میں محمد کی جگہ مسیحا لکھ کر اُسے تضمین کیا۔ اس سے جناب رام بابو سکسینہ

---

[1] جارج پیش شور صاحب نے اوائل میں مرزا رحیم بیگ رحیم میرٹھی سے مشورہ کیا۔ پھر قطب الدین مشیر دہلوی

کو دھوکا ہوا ہے اور انھوں نے اپنی کتاب "یورپین اور انڈو یورپین شعرائے اردو و فارسی" (انتخابات، ص ۳۷۶) میں لکھ دیا ہے کہ اس کا مصنف رضواؔن مراد آبادی کوئی عیسائی شاعر تھا۔ حالانکہ اصلیت یہ ہے کہ شوؔر نے اپنے جوشِ عقیدت میں اصلی نعت کی ردیف بدل کر اُسے حضرت مسیح علیہ السلام سے منسوب کر دیا ہے۔

رضواؔن نے ۱۹۱۱ء (۱۳۲۹ھ) میں اس جہانِ فانی کو خیر باد کہا۔ علیم الدین علیم سُہنوی نے تاریخ کہی ؎

از جہاں رفت چوں رضوان علی خاں رضواؔن
در غمش اہلِ سخن زود بر فتند ز ہوش
بعلیم از پےِ تاریخِ وفاتش دمِ فکر
"جائے رضواؔن بارم باد ابدا" گفت سروش

۱۳۲۹ھ

ان کا کلیات "تصویرِ خوبی" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے (۱۳۲۵ھ۔ ۱۹۰۷ء)

پہلے اسی نعت کے چند شعر سن لیجیے۔

دل لوٹ گیا، دیکھتے ہی روئے محمدؐ	اترائیں نگاہیں جو پڑیں سوئے محمدؐ
ابروئے محمدؐ ہے کبھی روئے محمدؐ	ہر ماہ گھٹا، بڑھ کے فلک پر مہِ انور

(بقیہ صفحہ گزشتہ) اور ان کے صاحبزادے میاں غلام دستگیر سے اصلاح لی اور خود استادی کا درجہ حاصل کیا۔ بہت قادر الکلام شخص تھے۔ چھ دیوان چھپے ہوئے موجود ہیں۔ عربی اور ہندی بھی خوب جانتے تھے۔ بلکہ ہندی میں تو ان کی ٹھمریاں اور ہولیاں آج تک مشہور ہیں۔ عربی کی تعلیم میرٹھ کے ایک عالم رئیس قاضی رشید الدین سے لی تھی۔ تقریباً ۷۰ برس کی عمر تھی۔ جب ۲۲ فروری ۱۸۹۴ء کو انتقال کیا۔ داغؔ نے جو قطعہ تاریخ وفات لکھا تھا۔ اس کا آخری شعر ہے ؎

سالِ رحلتِ عیسوی بنوشت داغؔ "اہلِ عالم کرد ماتم شور شور"
(۱۸۹۴ء)

(خم خانۂ جاوید (۵) ص ۷۱-۷۳)

موسیٰ کی طرح، برقِ تجلّی کو بھی غش آئے | بے پردہ اگر ہو رخِ نیکوے محمدؐ
پژمردہ ہوں، یارب! نہ لگیں باغِ محبت | ان پھولوں سے آتی ہے مجھے بوے محمدؐ

بہت مشّاق اور پُرگو شاعر تھے، لیکن کلام میں کوئی خاص بات نہیں۔ نمونۂ کلام یہ ہے:-

ہو کوئی بات، تو کچھ اس کا تدارک کیجے | خود بخود وہ تو عبث چیں بہ جبیں رہتے ہیں
وہ معنی ہوں، کہ مضمونِ فنا ہے زندگی میری | وہ مطلب ہوں کہ ہستی کے ہر بہتر نیستی میری
ابھی فرشِ زمیں پر تھا، ابھی عرشِ بریں پر ہوں | کہاں سے لے اُڑی مجھ کو، کہاں تک بیخودی میری

تکلیف روا رکھ نہ پرِ کاہ کسی کی | ہاں تنکے نہ چن لے کہیں آہ کسی کی
عشّاق کو اتنا نہ ستا اے بتِ ظالم! | فریاد نہ سن لے کہیں اللہ کسی کی

[خم خانۂ جاوید (۳) ص ۴۵۶-۴۵۸؛
یادگارِ ضیغم، ص ۲۹۵-۲۹۶؛]

رفعت و سرور ـــــ مولانا ابوالفضل محمد عباس شروانی

ان کا خاندان ولایتی تھا۔ مذہباً شیعہ تھے۔ ان کے جدِ امجد جابر بن عبداللہ انصاریؓ تھے۔ آبائے کرام مدینہ منوّرہ سے بغداد چلے آئے اور یہاں بہت عزت اور احترام سے رہے۔ پھر آب و دانہ کی کشش سے ہمدان (ایران) میں جا بسے۔ ان کے جدِّ اعلیٰ مرزا محمد ابراہیم خاں ہمدانی، نادر شاہ درانی کے وزیر تھے۔ انھوں نے شاہِ مذکور کے ظلم و ستم سے دل برداشتہ ہو کر نوکری سے استعفیٰ دے دیا اور نجف اشرف میں روضۂ مبارکہ کے مجاور بن گئے۔ لیکن ان کے فرزندِ رشید مستوفی الملک مرزا محمد علی خاں کے ساتھ گئی۔ وہ قہرِ نادری کا شکار ہو گئے۔ نادر شاہ نے خود انھیں موت کے گھاٹ اتار دیا اور اُن کا گھر بار تاراج کر ڈالا... ان کی اولاد اور دوسرے رشتہ دار ڈر کے

مارے اِدھر اُدھر آوارہ اور منتشر ہوگئے۔ ان کے بھائی مرزا احمد حسن خاں ترکِ وطن کرکے ہندستان پہنچے اور بنارس میں رہنے لگے۔ مستوفی الملک کے بیٹے مرزا محمد تقی روپوش ہوگئے اور شیخ محمد کے نام سے شروان میں مقیم ہوگئے۔ پھر نجف اشرف پہنچے اور یہاں سید مہدی طباطبائی مجتہد العصر کے سامنے زانوے ادب تہ کیا اور اُن سے فقہ و حدیث و تفسیر میں دستگاہ حاصل کی۔ چندے بعد جب انھیں معلوم ہوا کہ اُن کے چچا مرزا احمد حسن خاں بنارس میں مقیم ہیں، تو یہ بھی یہاں آگئے۔ لیکن اُن کی آمد کے تھوڑے ہی دن بعد مرزا احمد حسن خاں کا انتقال ہوگیا، اور چونکہ شیخ محمد شروانی کی اُن کے ورثا سے بن نہ آئی، اس لیے یہ بنارس سے لکھنؤ چلے گئے۔ یہاں اُن دِنوں نواب آصف الدولہ کی حکومت تھی۔ انھوں نے ان کی خوب آؤ بھگت کی۔ اور یہ آرام و آسائش سے بسر کرنے لگے۔ کچھ مدت بعد انھوں نے یمن کی راہ لی۔ اور حدیدہ میں سکونت اختیار کی۔ یہیں ایک امیر تاجر سید محمد حیدر بغدادی کی دختر نیک اختر سے نکاح کیا جس کے بطن سے شیخ احمد شروانی پیدا ہوئے۔ یہی صاحب ترجمہ کے والد بزرگوار تھے۔

شیخ احمد کمالاتِ علمی و عملی کی تحصیل کے بعد عنفوانِ شباب میں یمن سے ہندستان آئے اور کلکتہ میں وارد ہوئے۔ یہاں حکامِ فرنگ کی قدر شناسی سے انھیں مدرسۂ عالیہ میں عربی زبان و علوم پڑھانے کی خدمت سپرد ہوئی۔ اسی زمانے میں انھوں نے الف لیلہ مرتب کی۔ اس کی اصل غالباً کوئی مصری نسخہ تھی۔ یہ پوری کتاب نہیں۔ انھوں نے صرف پہلی دو سو راتوں کو درست کیا اور انھیں دو جلدوں میں ۱۴-۱۸۱۸ء میں شائع کر دیا۔ یہ پہلا کلکتہ ایڈیشن ہے۔ سر رچرڈ برٹن نے جب پوری الف لیلہ انگریزی میں ترجمہ کی تو اپنے ترجمے میں اس نسخے سے بہت مدد لی تھی۔

تھوڑے دن بعد انھوں نے نوکری کو خیرباد کہی اور یہاں سے لکھنؤ چلے گئے۔ غازی الدین حیدر شاہ کا زمانہ تھا۔ اُن کے خاندان کے تعلقات دربارِ اودھ سے پہلے سے تھے ہی، چنانچہ انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ رکن الدولہ سید محمد اسمٰعیل خاں رضوی

مرشد آبادی نے اپنی صاحب زادی ان کے حبالۂ عقد میں دی۔ شیخ محمد عباس رفعت اسی ازدواج کا نتیجہ تھے۔ غازی الدین حیدر کی وفات کے بعد شیخ احمد شروانی کا دل لکھنؤ سے اچاٹ ہو گیا۔ وہ کان پور، بنارس، حیدر آباد، بھوپال، بمبئی وغیرہ کی سیر و سیاحت کرتے پونا پہنچے اور وہیں ۲۱۔ مئی ۱۸۴۰ء (۱۹۔ ربیع الاول ۱۲۵۶ھ) کو رہ گرائے عالم جاودانی ہوئے۔ شیخ احمد بڑے صاحبِ کمال شخص تھے۔ اپنے وقت کے متنبی اور حریری تسلیم کیے گئے۔ تمام تذکرہ نویس ان کے علم و فضل کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ متعدد تصانیف یادگار چھوڑیں جن میں سے انشائے عجب العجائب، نفحۃ الیمن، مناقب حیدریہ، حدیقۃ الافراح، تاج الاقبال فی تاریخ ملک بھوپال زیادہ مشہور ہیں۔

رفعت ۳۰۔ مئی ۱۸۲۶ء (۲۲ شوال ۱۲۴۱ھ) کو بنارس میں پیدا ہوئے۔ عربی اپنے والد ماجد اور فارسی شیخ علی حزیں کے شاگرد میر خیرات علی خان مشتاق فیض آبادی سے حاصل کی۔ چودہ برس کے تھے جب والد کا انتقال ہو گیا۔ چونکہ ان کی اپنے چچا سے نہ بنی اور انھوں نے اُنھیں جاید اد پدری سے محروم کر دیا اس لیے یہ بھی ایک زمانے تک ہندستان کے مختلف شہروں کی سیر کرتے رہے۔ طبیعت سپاہ گری کی طرف مائل تھی شہسواری اور نیزہ بازی اور تفنگ اندازی کی مشق کی اور فی الجملہ ان میں بہت مہارت بہم پہنچائی۔ قسمت آزمائی کے لیے دکن گئے لیکن قسمت میں ابھی اور گردش لکھی تھی۔ یہ دہلی آئے اور یہاں بہادر شاہ ظفر کے دربار میں رسائی حاصل کی۔ مرزائی، اور خانی اور ابوالفضل دوراں کے خطاب عطا ہوئے۔ ان ہی ایام میں غالب سے ملاقات ہوئی اور انھوں نے اپنے فارسی کلام اور قصاید پر بالخصوص اُن سے اصلاح لی۔ اس زمانے کا دہلی دربار کسی صاحبِ کمال کی صحیح قدر دانی نہیں کر سکتا تھا۔ اُنھیں یہاں بھی کوئی خاص مالی منفعت حاصل نہ ہوئی۔ اب کے نکلے تو بھوپال پہنچے اور نواب جہانگیر محمد خاں بہادر شمشیر جنگ (نواب شاہجہان بیگم والیۂ بھوپال کے والد ماجد) کی سرکار سے وابستہ ہو گئے۔ اُن کی وفات کے بعد کچھ مدت کے لیے نواب قدسیہ بیگم کے متوسلین میں شامل رہے، پھر ملازمت چھوڑ کر تجارت کا پیشہ اختیار کیا۔ جب نواب والا جاہ سید محمد صدیق حسن خاں

بہادر کا نکاح نواب شاہجہان بیگم سے ہوا تو انھوں نے ازراہِ قدر دانی انھیں اپنے پاس بلا لیا اور یہ ریاست کے ملازموں میں شامل ہو گئے۔ محکمۂ تنظیماتِ شاہجہانی (یعنی قانون اور تاریخ نویسی) ان کے سپرد ہوا۔ سو روپیہ ماہانہ مشاہرہ مقرر ہوا۔ اس کے بعد بقیہ عمر یہیں بھوپال میں بسر کر دی۔

عربی اور فارسی کی استعداد بہت اچھی تھی۔ ادب، علم کلام اور تاریخ میں وحیدِ عصر تھے۔ اور فارسی نظم و نثر پر کما حقہ قادر تھے۔ چھوٹی بڑی چالیس کتابیں تصنیف کیں۔ معلوم نہیں کس بات سے دل برداشتہ ہو کے اپنی بیاض بھوپال کے تالاب میں ڈال دی۔ اور شعر گوئی سے توبہ کر لی۔ اگرچہ دو ایک شعر اردو کے بھی ملتے ہیں، لیکن معلوم ہوتا ہے یہ محض بطور تفنن کہے گئے تھے۔ دراصل فارسی ہی میں کہتے تھے۔ جو کلام منتشر حالت میں ملتا ہے۔ اُسی سے یہ انتخاب درج ہے۔ ان کے بہت سے قصیدے نواب محمد صدیق حسن خان بہادر اور نواب شاہجہان بیگم والیہ بھوپال کی مدح میں موجود ہیں۔

۱۳۱۵ھ (۱۸۹۷ء-۱۸۹۸ء) میں بھوپال ہی میں انتقال کیا۔ میرزا کمال الدین سنجر طہرانی نے قطعۂ تاریخِ وفات لکھا، جس کا مصرعِ تاریخ ہے ع آہ "مرگِ ابو الفضل کمال" (۱۳۱۵ھ)۔ دوسری تاریخ بھی انھی کی ہے۔ "صد وائے بو الفضائل مُرد" (۱۳۱۵ھ) بھوپال میں احمد آباد روڈ پر "کربلا" میں مدفون ہیں۔

اولاد میں دو صاحبزادے یادگار چھوڑے۔ ابو القاسم محتشم اور ابو الحسن محترم۔ دونوں علم و فضل میں اپنے اسلاف کے جانشین تھے۔ مدت العمر ریاست بھوپال کی ملازمت میں بسر کر دی۔

تا چشمِ تو آموخت، فن فتنہ گری را	در فتنہ گری، داد سبق چشمِ پری را
دردِ سرِ من، بہ شد نی نیست، مسیحا!	بیہودہ، مخور دراہ مدہ، دردِ سری را
مہر و مہ و انجم، ہمہ با گرم گزاف اند	دقت ست، کہ آغاز کنی جلوہ گری را

امشب از شمعِ رخِ جانانہ بزمم روشن ست	بر بساطم از پرِ پروانہ خرمن خرمن ست
سوزِ من، از گریہ، ہرگز کم نگردد، مثلِ شمع	آبِ اشکم، بر سرِ آتش، مثالِ روغن ست
یافت بازارِ محبت رونقے، از داغِ من	دودمانِ عشق، از نورِ چراغم روشن ست

تُرکِ خونخوار، بکفِ تیغ، سرافشاں برخاست	خوب شد، بارِ سر از دوشِ عزیزاں برخاست
تا کجا، راز ز اغیار، توانم پوشید	یادِ یار آمد و آہ از دلِ نالاں برخاست
دیدہ چوں جوہرِ خوں نابہ چشم رفعت	موجِ خوں، از جگرِ لعلِ بدخشاں برخاست

حالِ من آشفتہ، بجاناں کہ کند عرض درد من رنجور، بدرماں کہ کند عرض

بے نیازم کرد از کون و مکاں تاثیرِ عشق سیم شد از زیرِ من، تا یافتم اکسیرِ عشق

من چگویم، حالِ من چونست از مہرِ تباں دردمنداں نیک می دانند دار و گیرِ عشق

رادقِ شیراز دماء الورد میباید کشید ایں مرکب در اوانِ برد میباید کشید

با بتِ گلفامِ نورس غنچہ لب پستہ دہن جامِ بادہ در ہوائے سرد میباید کشید

در فراقِ دلبرِ شیریں دہن، رُخ ناردن آہ سرد از سینۂ پُر درد میباید کشید

الحذر از صحبتِ بدگوہرانِ تیرہ دل مے بیاد روئے جاناں فرد میباید کشید

مقطع صائب خوش ست ای سرورِ والا گہر بر سر لوحِ طلائے زرد میباید کشید

"ہرچہ میخواہی طلب کن صائب از شاہِ نجف مفتے گر میکشی از مرد میباید کشید"

دُور از بندِ کمندِ سُبحہ و زُنّار باش مست "یا قدوس" گویاں بر درِ خمّار باش

مشربِ رنداں خوش است و عیشِ ایناں بےگزند نغمۂ یاہو چو قُمری خوان و در گلزار باش

بزمِ رند الست، پاسِ عزت اینجا لازم است جائے خفتن نیست ایں دارِ فنا بیدار باش

ہمّیم رہ ترا ای راہ جو از راہِ صدق سالکِ راہِ قویمِ حیدرِ کرّار باش

[تاریخ دلچسپ (قلمی)، ص ۵۷ - ۵۹؛
جلوۂ خضر (۲) ص ۱۹۷-۱۹۸؛ صبحِ گلشن، ص ۱۸۰-
۱۸۲؛ شمع انجمن، ص ۱۸۲-۱۸۳؛ آثار الشعرا، ر،
ص ۱۱۱-۱۱۶؛ راحِ روح (قلمی)، ص ۴۷-۴۸؛
فرح بخش، ص ۲۳-۲۸؛ اُردو کی نثری داستانیں،
ص ۸۲-۸۴؛ مکتوب جناب ناظم سیتاپوری بنام مولف]

رمز — میرزا فتح الملک بہادر غلام فخر الدین عرف مرزا فخرو دہلوی،

خاندان تیموری کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کے سولہ بیٹے تھے۔ مرزا فخرو،

ان میں سے چوتھے تھے۔ ان سے تین بھائی بڑے مرزا محمد دارا بخت میراں شاہ عرف مرزا شبّو اور مرزا شاہ رخ اور مرزا کیومرث تھے۔ مرزا فخرو ۱۸۱۲ء (۱۲۳۳ھ) میں پیدا ہوئے۔ سورۂ فتح کی آیت "انا فتحنا لک فتحاً مبینا" سے بطرز بجمع تاریخ ولادت (۱۲۳۳ھ) برآمد ہوتی ہے۔ جب ۱۱ جنوری ۱۸۴۹ء کو مرزا دارا بخت ولی عہد کا انتقال ہوا[1] تو لارڈ ڈلہوزی گورنر جنرل نے یہ مسئلہ اٹھایا کہ اب کسے ولی عہد تسلیم کیا جائے۔ ایک کمیٹی مقرر کی گئی اور بڑی ردّ و کد کے بعد مرزا فخرو ولی عہد منظور کیے گئے۔ لیکن شرط یہ ٹھہری کہ یہ برائے نام بادشاہ ہوں گے اور قلعۂ معلی سے اٹھ کر مہرولی جا رہیں گے۔ چنانچہ ۱۸۵۲ء میں اس معاہدے پر دستخط ہو گئے اور مرزا فخرو کی ولی عہدی کا اعلان ہو گیا۔ بہادر شاہ کی چہیتی بیگم ملکہ زینت محل اس انتظام سے خوش نہیں تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ میرا اکلوتا بیٹا جواں بخت ظفر کا جانشین تسلیم کیا جائے۔ انھوں نے بہادر شاہ کو ہموار کر لیا تھا۔ اور ان کی طرف سے ایک لمبی چوڑی عرضی ملکہ وکٹوریہ کے نام لکھوائی گئی کہ وہ جواں بخت کی ولی عہدی کا اعلان کر دیں لیکن انگریزی سیاست کے سامنے ان کی ایک نہ چلی اور یہ منہ دیکھتی کی دیکھتی رہ گئیں۔ جتنے منہ اتنی باتیں بعض لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ بیگم نے انگریز ریذیڈنٹ سر ٹامس مٹکاف کو زہر دلوا دیا کیونکہ وہ ان کے رستے میں حائل تھے چنانچہ صاحب موصوف ۳ نومبر ۱۸۵۳ء کو جاں بحق ہوئے۔ اس کے بعد مرزا فخرو کا کانٹا تھا۔ یہ بھی ۱۰ جولائی ۱۸۵۶ء کی شام کو ہیضہ سے فوت ہو کے اپنے مولائے حقیقی سے جا ملے اگرچہ بعض لوگوں کا یہ خیال تھا کہ انھیں بھی زینت محل نے زہر دلوا دیا ہے۔ مرزا فخرو درگاہ قطب صاحب میں شاہ عالم بہادر شاہ (خلف اورنگ زیب عالمگیرؒ) کے حجرے میں دفن ہیں۔

---

[1] وفات کے وقت عمر ۵۰ برس تھی۔ ظفر نے تاریخ کہی ؎

آں ولی عہدے کہ دارا بخت بود	کرد چوں رحلت ازیں دنیائے دوں
شد درونِ خلق داغ از سوزِ غم	گشت سالِ رحلتش "داغِ دروں" ۱۲۶۵ھ

مرزا فخرو نے اپنی عمر میں تین نکاح کیے۔ پہلا مرزا جہانگیر (اکبر شاہ ثانی کے دوسرے بیٹے اور ظفر کے چھوٹے بھائی) کی اکلوتی صاحبزادی سے ہوا۔ مرزا ابوبکر اسی بیوی کے بطن سے تھے، جو ۱۸۵۷ء میں اپنے دونوں چچاؤں مرزا مغل اور مرزا خضر سلطان کے ساتھ میجر ہاڈسن کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ اس بیوی کی وفات کے بعد دوسرا نکاح مرزا الٰہی بخش[1] کی صاحبزادی حاتم زمانی بیگم سے ہوا۔ اور تیسرا وزیر بیگم[2] عرف چھوٹی بیگم سے۔ شوکت محل ان کا خطاب تھا۔ ان کے بطن سے مرزا خورشید عالم خورشید پیدا ہوئے۔

---

[1] یہ وہی مرزا الٰہی بخش ہیں، جن سے متعلق مشہور ہے کہ وہ انگریزوں کے یارِ غار اور ان کے جاسوس تھے۔ بہادر شاہ کے مقدمے میں یہ بھی گواہ کی حیثیت سے پیش ہوئے تھے۔ ان کا اصلی نام مرزا ہدایت افزا تھا۔ اور یہ شاہ عالم بہادر شاہ اول کی چھٹی پشت میں تھے۔ انگریزوں اور مرزا فخرو سے جو معاہدہ ہوا تھا، وہ بہت حد تک انہی کا کیا دھرا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں نے انھیں خاندانِ شاہی کا سرپرست تسلیم کر لیا اور جاگیر عطا کی۔ ۲۱۔ مارچ ۱۸۷۸ء کو وفات پائی۔ مرزا جہانگیر کے حجرے میں دفن ہیں۔

[2] خدا کی شان کہ اس عورت کی جتنی اولاد ہوئی سب شعر کہنے والی۔ یہ محمد یوسف سادہ کار کشمیری کی بیٹی تھی۔ دجی بیگم اور عمدہ خانم اس کی دوسری دو بہنیں تھیں۔ سب سے پہلے یہ ایک انگریز کے گھر میں رہی جس کے نام میں اختلاف ہے۔ کوئی اسے بلاک (BLACK) لکھتا ہے (بادہ درخشاں، ص ۲۱) اور کوئی مارٹن (کارنامۂ سروری، ص ۶۵) یقین ممکن ہے کہ نام مرکب بلیک مارٹن یا مارٹن بلیک ہو۔ اس سے چھوٹی بیگم کے ایک لڑکا امیر مرزا اور ایک لڑکی ہوئی۔ اس کا نام بیج جان عرف بادشاہ بیگم اور تخلص خفی تھا۔ اس کے بعد یہ نواب شمس الدین احمد خاں والی فیروز پور جھرکہ کے پاس پہنچی یہاں داغ پیدا ہوئے۔ نواب کے پھانسی پا جانے (۱۸۳۵ء) کے بعد یہ آغا مولوی تراب علی کے یہاں گئی۔ ان سے شاہ محمد آغا پیدا ہوئے، جو پہلے شاقی (فغانِ دہلی، ص ۱۷۲) اور بعد میں شاغل تخلص کرتے رہے۔ (خم خانۂ جاوید (۴)، ص ۱۹۴) اس کے بعد یہ چندے میر رخشاں کے پاس بھی رہی ہے۔ جن کا ان دنوں عنفوانِ شباب تھا۔ ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ ۱۸۴۴ء میں یہ قلعے میں آئی۔ یہاں مرزا فخرو سے شاہزادہ خورشید عالم خورشید ہوئے۔ مولانا آزاد نے دیوانِ ذوق (ص ۱۴۱-۴۳) میں جو لطیفہ چھوٹی بیگم کا لکھا ہے وہ اسی سے متعلق ہے اس کا انتقال سنہ ۱۸۷۹ء میں ہوا۔

(اردو ادب، ستمبر ۱۹۵۶ء، ص ۱۱ (حاشیہ ۳)

ہمارے مشہور شاعر نواب مرزا خاں داغ بھی اسی چھوٹی بیگم کے بیٹے تھے۔ اور وہ اسی واسطے سے قلعۂ معلیٰ میں پہنچے۔ اس لحاظ سے داغ مرزا فخرو کے گیلڑ بیٹے تھے۔ داغ نے مرزا فخرو کی وفات کی تاریخ لکھی ؎

غم فتح ملک سلطاں، چہ بلائے جان و دل شد | دہدش مقام جنت، زکرم، کریم غفار
چو زداغ سال رحلت، دل دردمند پرسید | بکشید "آہ حسرت" "دو صد دوازدہ بار"

۶ × ۲۱۲ = ۱۲۷۲ھ

مرزا فخرو بھی ذوق کی زندگی تک انھیں سے اصلاح لیتے رہے، لیکن جب نومبر ۱۸۵۴ء میں ذوق کا انتقال ہو گیا تو ظفر کی طرح یہ بھی غالب سے مشورہ کرنے لگے۔ غالب سے ان کے بہت دوستانہ تعلقات تھے۔ غالب نے لکھا ہے کہ انھوں نے ان کا چار سو روپیہ سالانہ وظیفہ بھی مقرر کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ میرزا زین العابدین خان عارف کے دونوں کم سن صاحبزادوں، باقر علی خاں اور حسین علی خاں کے لیے بھی دس روپیہ ماہانہ پھلوں کے لیے دیتے تھے۔ غالب کے فارسی کلام میں مرزا فخرو کی مدح میں تین قصیدے موجود ہیں۔ غالب کی اردو مثنوی "در صفت انبہ" بھی مرزا فخرو ہی کے آموں کے تحفے کے شکریہ میں لکھی گئی تھی۔

رمزؔ کو شعر گوئی کے علاوہ موسیقی اور رقص کا بھی بہت شوق تھا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ یہ شوق خاندانِ تیموریہ کی گھٹی میں پڑا تھا۔

مرزا فخرو کا دیوان ۱۸۵۷ء کی افتاد میں ضائع ہو گیا۔ جو کچھ بچ گیا، اس سے اندازہ ہوتا ہے، کہ بہت پختہ کلام ہے۔ زبان کی تعریف تحصیلِ حاصل، کہ وہ واقعی ان کے گھر کی لونڈی تھی۔ معاملہ خوب لکھتے ہیں۔ مختلف تذکروں میں سے، اس کا مختصر انتخاب درجِ ذیل ہے۔

رن دیکھے دل تڑپنے لگا، اس کو کیا ہوا | آنکھیں تو اس کو دیکھ کے ہوئی ہیں بے قرار
ایک مشکل، مری مشکل کا ہے آساں کرنا | سب کچھ آساں ہے تجھے، گردشِ دوراں کرنا
پر دل کی تسلی کو، وعدہ تو کیا ہوتا | مانا، کہ نہ دل لے کے تو مجھ سے وفا کرتا

وہ لے گئے ہیں، خدا جانے، کس طرح دل کو
دیا ہے میں نے اُنھیں، اپنے اختیار سے کیا

غم وہ کیا ہے، جو جاں گزا نہ ہوا
درد وہ کیا، جو لا دوا نہ ہُوا

درد کیا، جس میں کچھ نہ ہو تاثیر
بات کیا، جس میں کچھ مزا نہ ہُوا

وہ تو ملتا، پر اے دلِ کم ظرف!
تجھ کو ملنے کا حوصلہ نہ ہُوا

تم رہو اور مجمعِ اغیار
میرا کیا ہے، ہُوا، ہُوا، نہ ہُوا

پھر تمھارے ستم اُٹھانے کو
رمزؔ اچھا ہوا، بُرا نہ ہُوا

ڈھونڈو گے جان کو بھی، محبت کی راہ میں
پھرتے ہو رمزؔ! دل کی ابھی جستجو میں کیا

دلِ بیتاب! ہو کیا تجھ سے رفاقت کی اُمید
کون ہوتا ہے بُرے وقت میں جو تو ہو گا

میں جو رُسوائے زمانہ ہو گیا
اس کی شہرت کا بہانا ہو گیا

جا پڑے ہم کوچۂ جاناں میں، رمزؔ!
بارے اپنا بھی ٹھکانا ہو گیا

حال سُن سُن کے عشق میں تیرا
رمزؔ اکرتے ہیں خاص و عام افسوس

دردِ فراق، فکرِ عدو، طعنِ دوستاں
اِس ایک جان پر مری، کیا کیا بلا نہیں

نہ حرم میں جگہ، نہ دیر میں جائے
ہم کہنے جائیں، اے خدا! کس میں

اے دلِ بیتاب! اتنا اضطراب
صبر تجھ پر، اور تو میں کیا کہوں

یاں یہ حالت، کہ دم لبوں پر ہے
واں یہ غفلت، کہ کچھ خیال نہیں

تم نہ تھے، غیر کے گھر، شب کو
بس چلو، یونہی سہی، جانے دو

منہ دکھانا ہے خدا کو، اک دن
اے بُتو! اتنی خودی جانے دو

شکر و شکوہ سے تعلق نہ رکھو
نبھ سکے جیسے، نبھی جانے دو

رمزؔ! اُلفت میں جو چاہو آرام
تو یہ راحت طلبی جانے دو

الٰہی یا غمِ فرقت میں یہ کم بخت دم نکلے
تمنا کوئی تو دل کی ہمارے، اے صنم نکلے

رسیدھی کہوں ان سے، تو یہ اُلٹی سمجھتے ہیں
مگر یہ حضرتِ ناصح بھی کوئی اک رقم نکلے

ہم نے تو غمِ یار میں، یوں عمر بسر کی
مر مر کے جو کی شام، تو رو رو کے سحر کی

[طبقات الشعرائے ہند، ص ۴۱۶ ؛
گلستانِ سخن، ص ۲۴۰-۲۵۰ ؛ اردوئے معلیٰ
ص ۱۰۵ ؛ نادراتِ غالب، ص ۸۵ ؛
خم خانۂ جاوید (۳)، ص ۴۹۷-۵۰۲]

رنجؔ و طبیب ——— حکیم محمد فصیح الدین میرٹھی

میرٹھ کے سربرآوردہ اور باوجاہت خاندان کے فرد اور قوم کے بنی اسرائیل تھے۔ یہ خاندان اصل میں سکندر آباد (ضلع بلند شہر) کا رہنے والا تھا، جہاں سے رنجؔ کے آباؤ اجداد نقلِ مکان کر کے میرٹھ چلے آئے تھے۔ میرٹھ کا محلہ بنی سرائے (مخففِ بنی اسرائیل) اسی خاندان کا آباد کردہ ہے اور آج بھی ان کے باقیاتِ صالحات یہیں مقیم ہیں۔

رنجؔ کے والد حکیم مولوی قمر الدین اپنے فن میں ماہر اور اسی سلسلے میں مہاراجہ سیندھیا کے دربار سے منسلک تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں یہ رخصت پر وطن چلے آئے تھے۔ جب ہنگامہ فرد ہوا تو مہاراجہ بہادر نے انھیں طلب فرمایا، لیکن خدا معلوم کیوں یہ پاؤں توڑ کے یہیں کے ہو رہے اور واپس نہ گئے۔ اس کے بعد کہیں ملازمت نہیں کی۔ موسیقی کا بھی شوق تھا۔ ۱۸۸۲ء میں انتقال فرمایا۔ رنجؔ نے تاریخ کہی: بود حیف از خسوف قمر الدین (۱۲۹۹ھ)

رنجؔ نے عربی اور فارسی اور طب کی تعلیم اپنے حقیقی ماموں (اور خسر) مولوی نصیر اللہ سے پائی۔ جو ریاست دتیا کی ملازمت ترک کر کے اپنے مکان پر مقیم ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ طب میں حکیم سعادت خاں میرٹھی سے بھی استفادہ کیا۔ ماموں کی زندگی بھر رنجؔ انھیں کے ساتھ کام کرتے رہے اور ان کے انتقال کے بعد اپنا مطب شروع کیا۔ بہت حاذق طبیب تھے۔ خصوصاً اپنے ماموں مرحوم کی طرح نسائی امراض کے علاج میں بہت شہرت حاصل کی۔ ۴۹ برس کی عمر میں استسقائے لحمی کے مرض سے آٹھ مہینے بیمار رہ کر ۲۱ ستمبر ۱۸۸۵ء کو دوشنبہ کے دن وفات پائی۔ میرٹھ کے قبرستان شاہ سلطان میں دفن ہوئے۔

ان کے صاحبزادے حکیم محمد فخر الدین فخر و شاد نے از لب بکار (یعنی دو) کے تعمیہ سے "آہ رنج درگذشت" سے تاریخ (۱۸۸۵ء) نکالی۔ ہجری تاریخ ان کے دوست جارج پیش شور نے لکھی۔

خوشی شور کی لے گئے اپنے ساتھ — نصیب اس کو ہے "اب غم رنج آہ"

۱۳۰۲ھ

شاعری میں رنج کے علاوہ اپنے پیشے کی مناسبت سے کبھی کبھی طبیب تخلص بھی کرتے تھے۔ نعت سے بھی شغف تھا چنانچہ ایک مختصر مجموعہ گلشنِ نعت کے عنوان سے موجود ہے۔ دیوان بھی زندگی میں مرتب نہیں ہوا۔ یہ اُن کی وفات کے بعد اُن کے صاحبزادے حکیم محمد فخر الدین نے مخزنِ فصاحت کے تاریخی نام سے ۱۳۰۷ھ (۱۸۹۱ء) میں مطبع ہاشمی میرٹھ سے شائع کیا۔ اس کے علاوہ ان کی تالیف شاعرات کا ایک تذکرہ بہارستانِ ناز بھی یادگار ہے۔

حکیم محمد فخر الدین کی وفات بعمر ۵۵ برس ۱۹۱۵ء (۲۹۔ نومبر) میں ہوئی۔ اُن کے صاحبزادے حکیم محمد محمود الحق بھی طبابت پیشہ تھے۔ ان کا انتقال ۲۲۔ مئی ۱۹۱۰ء کو ہوا۔ یہ دونوں باپ بیٹا بھی قبرستان شاہ سلطان (میرٹھ) میں آسودۂ خواب ہیں۔ اب اس خاندان کے نام لیوا حکیم محمود الحق کے خلف الصدق حکیم سیف الدین احمد سلمہ (میونسپل کمشنر) میرٹھ میں مطب کرتے ہیں۔

انتخاب ملاحظہ ہوں:-

دیکھتا تھا میں نگاہوں سے ہر اک جا تجھ کو — اور انھیں میں تو نہاں تھا، مجھے معلوم نہ تھا

عجب وہ لوگ ہیں جو اپنے دل کو تھام لیتے ہیں — ہمیں تو تھامنا مشکل ہے آنسو چشمِ گریاں کا

اغیار اور خلوت، ایسا نہ جانتے تھے — دربارِ خاص ان کا، دربارِ عام نکلا

پر تو فگن جو ساقیِ گلفام ہو گیا — گلرنگ شیشۂ دلِ ناکام ہو گیا

یا رب! مرے گناہ کی تعزیر اور کیوں — بس ہے یہی، کہ لطف نہ پایا گناہ کا

رنج اُن سے صلح ہوتے ہوتے پھر کل پر رہی — سہل ہو کر کام مجھ ناکام کا مشکل ہوا

مرے خط میں لکھا عدو کو سلام — آگے آیا لکھا مقدّر کا

عشق میں، ہم نے کیا اپنوں کو غیر — تم نے کیوں کر، غیر کو اپنا کیا

بُت خانے سے گھبرائے تو کعبے کی بندھا دھیان — بُت ظلم جو کرتے ہیں، تو آتا ہے خدا یاد

حوروں کی مرے آگے صفت کرتا ہے ناصح — اس بت کی دلاتا ہے یہی مردِ خدا یاد

ناچار دل سے تنگ بتوں کی جفا سے ہم — فریاد ایک ہو، تو کریں بھی خدا سے ہم

لاکھوں بناؤ، ایک تغافل میں آپ کی — لاکھوں بگاڑ، ایک مرے اضطراب میں

معلوم نہیں کچھ، کہ میں آیا ہوں کہاں سے — جاؤں گا کہاں، آیا تھا کیوں، کون ہوں کیا ہوں

بہار آئی ہے پھر وحشت کے ساماں ہوتے جاتے ہیں — بڑھیں کیوں ہاتھ، خود ٹکڑے گریباں ہوتے جاتے ہیں

دن کاٹنے کو خوب تو ہے دل لگی کی راہ — اچھا ہے، جی لگا جو کسی سے بُرا نہیں

تمنّا جس کی خود محتاج ہو، یارب وہ دل دے دے — نہ دے ایسا مجھے تو دل، کہ محتاجِ تمنّا ہو

کب کیا کرتے تھے، اس طرح سے پامال مجھے — کب چلا کرتے تھے تم، ایسی ادا سے پہلے

قاصد گیا، ہر طرح سے تسکین ہوئی لیکن — اب دل کو یہ دھڑکا ہے کہ کیسی خبر آئے

(خم خانۂ جاوید (۳) ص ۵۰۷؛ دیباچہ وخاتمہ
مخزنِ فصاحت؛ مکاتیب غالب (حواشی) ص ۲۰۰)

رند ——— جانی بانکے لال

غالب کے اپنے خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دربار بھرت پور میں وکیل تھے، اور ان ہی کے واسطے سے منشی ہرگوپال تفتہ کو بھی وہاں کسی طرح کی ملازمت مل گئی تھی یا کوئی اور سلسلہ روزگار کا ہو گیا تھا۔

۱۲۷۲ھ (۱۸۵۵-۱۸۵۶ء) میں انتقال ہوا۔ ان کا ایک طویل مرثیہ تفتہ کے دیوان دوم (۱۸۵۷ء۔ کوہِ نور پریس لاہور) میں موجود ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ

رند اپنے والد کے اکلوتے بیٹے تھے اور پچاس برس کی عمر میں لاولد فوت ہوئے۔
[اُردوئے معلّیٰ، ص ۴۴، ۵۶]

زکی ــــــ نواب سید محمد زکریا خاں دہلوی

دہلی کے ایک معزز خاندانِ سادات کے چشم و چراغ تھے۔ اصل میں یہ خاندان کشمیری تھا۔ ان کے ایک بزرگ نواب مختار الدولہ ابوالقاسم خان بہادر، شاہ عالم ثانی کے وزیر مجد الدولہ عبدالاحد خاں کے قریبی عزیز تھے۔ زکی نے وجاہتِ دنیوی کے علاوہ شاعری بھی گویا وراثت میں پائی۔ ان کے والد ماجد سید محمود خاں بھی شعر کہتے اور محمود تخلص کرتے تھے۔ اُردو شعراء کے مشہور تذکرے "عمدۂ منتخبہ" کے مولف اعظم الدولہ نواب میر محمد خاں سرور (شاگرد محمد جان بیگ سامی) ان کے نانا (اور دادا کے بھائی) تھے۔ بزرگوں کا مسکن دہلی کا مشہور محلہ زینت باڑی تھا۔ لیکن یہ خاندانی جاہ و جلال زکی کی قسمت میں نہیں تھا۔ سب جایداد کچھ ان سے پہلے اور باقی ۱۸۵۷ء کے بعد خالصے لگ گئی۔

زکی ۱۸۳۹ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ فارسی، عربی، منطق، ریاضی کی تعلیم غالب، صہبائی اور پنڈت رام کشن بسمل سے لی۔ اس کے علاوہ طب میں بھی واقفیت بہم پہنچائی۔ قرآن بھی حفظ کیا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں یہ بھی دلی چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ آخر کار محکمۂ تعلیم میں ملازم ہو گئے۔ اور بتدریج ترقی کر کے صوبہ یوپی کے مدارس کی ڈپٹی انسپکٹری کے عہدے تک پہنچے۔ اس تعلق سے مدتوں میرٹھ، گورکھپور، بریلی، الہ آباد اور بدایوں میں رہے۔ جب ملازمت کی میعاد ختم ہوئی تو بدایوں ہی میں مقیم ہو گئے تھے۔ یہیں ۱۹۰۳ء (۱۳۲۱ھ) میں اللہ کو پیارے ہوئے۔ اور یہیں حضرت نظام الدین اولیاؒ

کے والد ماجد حضرت سید احمدؒ کی درگاہ کے احاطے کی جنوبی دیوار کے باہر جانب شرق آسودۂ خواب ہیں۔

بڑے قادر الکلام شخص تھے مولوی حشمت اللہ حشمتؔ، پنڈت جواہر ناتھ کول ساقیؔ، امیرؔ بدایونی، سید احمد دہلوی (مولف فرہنگ آصفیہ) وغیرہ ان کے شاگردوں میں سے تھے۔ اُن کا دیوان غزلیات (دیوانِ زکی) ان کی زندگی ہی میں چھپ گیا تھا۔ غالب نے چند سطریں بطور سند لکھ دی تھیں، وہ اس کے ساتھ موجود ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ بہت پختہ اور نازک خیال شاعر تھے۔ استاد کے کلام کی بعض خصوصیات مثلاً مضمون آفرینی، دقت پسندی، فارسی تراکیب وغیرہ کو اُنھوں نے نبھانے کی کوشش کی ہے۔ اور اس میں بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ بہت سا کلام غیر مطبوعہ رہ گیا جو اُن کے خاندان میں موجود ہے۔

اب مختصر انتخاب ملاحظہ ہو:

وضعِ بالیدگیِ شوق جو رہبر ہوتی — اے زکی! قطرۂ ناچیز بھی دریا ہوتا

تمکینِ وضع و طرزِ تبسم میں دیکھیے — انداز اس کی شوخیِ طبعِ سلیم کا

حیف صد حیف زکی! زندگیِ تلخ اپنی — بے کسی کا اگر انجام یہ ہو، مرجانا!

کس نے حیا سے نیچی نظر کی، کہ ہو گیا — آساں نہ دیکھنا مجھے، دشوار دیکھنا

وہ دیکھتے ہیں بزم میں یہ ہے دیکھتا ہے کون — بارے ہوا مجھے بھی سزاوار دیکھنا

بیداد میں لطف کیوں نہاں تھا — کیا یہ بھی عدو کا امتحاں تھا

جب عشق مرا سنا، تو ہنس کر — کہنے لگے، "ہم کو بھی گماں تھا"

عجب کیا ہے، وہاں رحمت سے زاہد کی ہو آمرزش — عذاب اس پر یہاں کچھ کم نہ تھا زہد ریائی کا

تری راہ کس نے بتائی، نہ پوچھ — دلِ مضطرب، راہ بر ہو گیا

آج کیا جانیں، کہا کیا وہ بھی سن کر رو دیے — ورنہ اظہارِ تمنا بیشتر کرتے ہیں ہم

بے تکلف عشق ہے غارت گرِ ایماں، مگر — حضرتِ ناصح کو کیا، یہ بھی اگر کرتے ہیں ہم

بھرے ہیں زخم کے ہیں وہ گل افشانیاں کہاں — جی میں ہے دل کو چھیڑ دیں پھر نیشتر سے ہم

رسوا کنِ جہاں، نگہِ ناز ہی نہیں — پنہاں رہے، یہ عشق کا انداز ہی نہیں
دشمن کا وصل دوست کو یوں سازگار ہو — گویا وہ چرخ تفرقہ پرداز ہی نہیں
وحشت میں تھک کے بیٹھ رہے مثلِ نقشِ پا — وہ جوش ہی نہیں، وہ تگ و تاز ہی نہیں

یہ شرمگیں نگہ، یہ تبسم نقاب میں — کیا بے حجابیاں ہیں تمہارے حجاب میں

وہ بھلا کیا جانیں، کیا ہوتا ہے جان و دل کا حال — ان کی شرمِ صلح جو میں، غمزۂ بے باک میں

اس تکلف میں وہ لطفِ مے گلفام کہاں — میرا انکار کہاں، آپ کا ابرام کہاں

کچھ ایسے تنگ ہیں، غمِ دل سے کہ جی میں ہم — کہتے ہیں، دل کو دے کے غمِ روزگار لیں
ناصح! قمارِ عشق کو ہم چھوڑ دیں گے آپ — باقی ہے ایک جان، ذرا اس کو ہار لیں

روبرو جلوہ فزا ہے چمنستانِ شہود — نگہِ شوق کبھی دید میں معذور نہیں
کر دیا خوئے خموشی کو، وفا میں داخل — بے وفائی میں بھی فریاد کا مقدور نہیں

وہی سبزہ، وہی وحشت، وہی ویرانی ہے — اور کیا دشت میں ہوگا، جو مرے گھر میں نہیں

بدگمانی یار کے حق میں، دلِ مجبور، حیف! — وہ خدا ناکردہ کیوں اغیار کی محفل میں ہو

کبھی نہ چھوڑیں گے، اس وضعِ التفات کو ہم — تمہاری طرزِ تغافل سے گو ملال بھی ہو
زگی! شباب گیا، اب کہاں، کہ خاطر میں — امنگ بھی ہو، عناصر میں اعتدال بھی ہو

جاں ستاں ہے، حرفِ مطلب کا جوابِ ناتمام — ہائے اس کا شرم سے کہنا کہ "اچھا دیکھیے"

نفس نفس ہے نسیمِ وفا، محرکِ شوق — یہ وہ مزہ ہے جسے ذوقِ جاوداں کہیے
وہاں یہ فکر، کہ رازِ دل آشکار نہ ہو! — یہاں یہ شوق، کہ کچھ حسرتِ نہاں کہیے
وہ سادگی ہے، تغافل کو ناز کہتے ہیں — مگر سکھائی ہے شوخی کہ امتحاں کہیے

زرا وہ ظلم، کہ ہو جائیں دوست بیگانے — مرا یہ حال، کہ دشمن بھی مہرباں ہو جائے
نہ پوچھو مجمعِ اعدا میں کون ہے جانباز — تمہیں نہ کھینچ لو خنجر، کہ امتحاں ہو جائے
ہمارا ذکر نہ ہو، رودادِ شوق نہ ہو — تو یہ ہی کیوں نہ کہو، کوئی بے زباں ہو جائے

دشمن سے ارتباط ہے، اس کا جواب کیا — یہ خو سہی تمہاری، کہ میری خبر نہ لی
عدو کے پاس سے کہتے ہو، امتحاں نہ سہی — تمہیں کو شوق نہیں ہے، تو مہرباں! نہ سہی

وہ میرا غم ہی سُنیں، پوری داستاں نہ سہی — حکایتِ دلِ بے تاب درمیاں نہ سہی
اگر نہیں ستمِ دہرِ جاوداں، نہ سہی — جفا پسند وہ کیا کم ہیں، آسماں نہ سہی
نہیں ہے عشق کی سرگشتگی میں ساتھ ضرور — ہمیں تو خاک اُڑانی ہے، کارواں نہ سہی
زہے! مقامِ سعادت سمجھ کے، بیٹھ رہو — حریمِ کعبہ نہیں ہے درِ مغاں، نہ سہی
خموشی میری ہم دم ہے، کہا کس نے! سنا کس نے! — ترا رازِ محبت، بدگماں! میری زباں تک ہے
چاکِ داماں کیجیے، ٹکڑے گریباں کیجیے — کچھ تو آخر چارۂ طبعِ پریشاں کیجیے

[خم خانۂ جاوید (۳) ص ۶۲۵ - ۶۲۷؛
ادیب (الہ آباد) فروری و مارچ ۱۹۱۳ء؛
انتخابِ زریں، ص ۱۴۸ - ۱۵۰ -]

سالک ـــــــ میرزا قربان علی بیگ خاں حیدر آبادی ثم دہلوی

ان کے والد نواب مرزا عالم بیگ خاں خلف عاشور علی بیگ خاں غالب جنگ تھے۔ بہ قوم کے اُوزبک ترک تھے۔ باپ دادا کا وطن دہلی تھا، لیکن جب زمانے میں مرزا عالم بیگ خاں اپنے روزگار کے سلسلے میں حیدر آباد میں مقیم تھے، سالک کی پیدایش یہاں ہوئی۔ یہ ۶ برس کے تھے، جب ان کے والد، ملازمت کے اختتام پر واپس اپنے وطنِ مالوف دہلی آئے۔ چنانچہ سالک کی نشو و نما اور تعلیم و تربیت یہیں ہوئی اور وہ مدتوں اِسی دیار میں رہے۔ تعلیم سے فراغت حاصل کر کے کچھ دن مہاراجہ شیو دھیان سنگھ والیِ الور کی ملازمت میں خدمتِ وکالت پر مامور رہے۔ یہاں سے الگ ہوئے تو حیدر آباد چلے گئے۔ حیدر آباد میں ان کے عمِ بزرگوار رن بہادر خاں، نواب بہادر تاڑبن کے یہاں ملازم تھے اور بعد میں انھیں کی دخترِ بلند اختر سے شادی کر کے خانہ داماد ہو گئے تھے۔ سالک انہی چچا کے پاس رہنے لگے۔

اوّل اوّل یہ حیدرآباد میں صیغۂ تعلیمات میں سررشتہ دار مقرر ہوئے اور اُسی زمانے میں ناظم تعلیمات نواب عماد الملک بہادر مولوی سید حسین بلگرامی کی سرپرستی میں ایک رسالہ "مخزن الفواید" جاری کیا۔ یہ رسالہ مدتوں اُردو علم و ادب کی خدمت کرتا رہا۔

سالک نے ۱۵ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا۔ آغاز میں تھوڑے دن حکیم مومن خاں کو اپنا کلام دکھایا۔ لیکن جلد ہی اُنھیں چھوڑ کر غالب سے مشورہ کرنے لگے۔ ابتدائے مشق میں اپنے نام کی رعایت سے تخلص بھی قربان کرتے رہے۔ لیکن غالب نے اسے بدل کر سالک کر دیا۔ اُنھیں یہ مزید فخر حاصل ہے کہ غالب کی وفات کے بعد اُن کے بیشتر مبتدی اور کم مشق شاگردوں نے اِن سے اصلاح لی۔ ۵۷ برس کی عمر میں ۱۸۸۰ء (۱۲۹۷ھ) میں حیدرآباد میں وفات پائی۔ ان کے استاد بھائی قدر بلگرامی نے تاریخ کہی "نواب قربان علی سالک ہزار افسوس مرد"۔ دو بیٹے تھے۔ بڑے محمد مرزا خاں عابد، یہ مدتوں ریاست حیدرآباد میں ملازم رہے۔ چھوٹے حیدر مرزا، یہ بھی شاعر تھے۔ قلندر تخلص تھا۔

سالک شطرنج بھی خوب کھیلتے تھے۔ یہ بھی اس "جلسۂ شطرنج دہلی" کے رکن تھے، جو نواب علاؤ الدین احمد خاں نے ۱۸۶۶ء میں قایم کیا تھا۔ شمشاد علی بیگ خاں رضوان ان کے چھوٹے بھائی تھے جن کا ذکر گزر چکا ہے۔

اُردو فارسی دونوں میں کہتے تھے۔ دو دیوان تھے، ہنجار سالک اور میخانۂ سالک۔ اب دونوں نہیں ملتے۔ نہایت قادر الکلام اور نغز گو شاعر تھے۔ طبیعت بہت مضمون آفریں پائی تھی۔ اس پر استاد دونوں ایسے ملے جو اپنے اپنے رنگ میں بے نظیر تھے۔ مومن اگر حسن و عشق کی واردات کے بیان میں اپنا جواب نہیں رکھتے، تو غالب کلام کی گہرائی اور معمولی بات کو بھی ایک خاص انوٹھے سے کہنے میں مشہور ہیں۔ سالک کے کلام میں دونوں رنگ کی کامیاب مثالیں ملتی ہیں۔

تم غیر کے ہوئے، تو رہا کیا جہان میں ۔۔۔ گویا ہمارے واسطے، کچھ بھی بنا نہ تھا

میرا ہو آشیانہ، اور آدھا جلا ہوا ۔۔۔ بجھ بھی گئی تھی آگ، تو بجلی کو کیا ہوا

کہلاتے ہو کیوں وعدہ فراموش جہان میں ۔۔۔ آجاؤ کہیں آپ میں اکثر نہیں ہوتا

نہیں اک بار بھی اب سُننے کی طاقت دل میں
پہلے سو بار، ترا نام لیا کرتا تھا!

سالکؔ! صنم کدہ سے نکالے گئے کہیں
حضرت ارادہ رکھتے ہو کیوں خانقاہ کا

سالکؔ! جو کوئی عشق میں، مجھ کو بُرا کہے
تکتا ہوں منہ کو اور یہ کہتا ہوں ہاں درست

کیوں چلا آتا ہے، ہر بات پہ رونا سالکؔ!
آج اُس کوچے سے آتا ہے، مگر تو ہو کر

کس کو دل دیتے ہو، کیا کرتے ہو، دیکھو سالکؔ!
ہائے نادان بنے جاتے ہو، دانا ہو کر

اب تک بھی میرے ہوش ٹھکانے نہیں ہوئے
سالکؔ کا حال رات کو ایسا سُنا کہ بس

تم بھی وہی کہو، تو کہیں سب بجا، درست
میں بھی وہی کہوں، تو کہے اک جہاں، غلط

آخر تو لائیں گے کوئی آفت فغاں سے ہم
حجت تمام کرتے ہیں آج آسماں سے ہم

تم آ گئے تو ہوش کہاں، میزباں ہو کون
آج آپ اپنے گھر میں ہیں کچھ میہماں سے ہم

چپ چپ پڑے ہوئے تھے، ابھی خانقاہ میں
کچھ کچھ کھُلے ہیں، بیعتِ پیرِ مغاں سے ہم

مایوس، نا اُمید ہیں، کیا مدعا سے ہم
کہتے ہیں، اور کہتے ہیں کس التجا سے ہم

کاش! اے سپہر! تجھ سے ہی رکھتے توسّل، جتنیں
وہ خواہشیں کہ رکھتے ہیں اُس بے وفا سے ہم

کہے گا غیر کے، تو کسی کو یقیں نہیں
پر تیری آنکھ، راز کی تیرے امیں نہیں

کب دیکھیے قفس سے رہائی نصیب ہو
کیا آمدِ بہار کی، ہم آرزو کریں

پھرتے ہیں داد خواہ ترے حشر میں خراب
تو پوچھتا نہیں، تو کوئی پوچھتا نہیں

خدا کرے کہ سمجھ جائیں یہ کنایہ وہ
ابھی تو چرخِ بریں کا گلہ کیے جاؤں

نقاب چہرے سے اُلٹو، کہ میں کب تک
شکایتِ نگہِ نارسا کیے جاؤں

وہ دشمن، دوست ہو یا آسماں ہو
اجل بن کر ہی کوئی مہرباں ہو

شکر کیجیے، کہ نہیں تابِ تکلّم مجھ کو
ورنہ اس طرح بھی، جو چاہو، کہو تم مجھ کو

غصۂ قاتل کا بڑھایا ہے یہ طعنہ دے کر
زندہ گویا کہ نہیں چھوڑنے کے تم مجھ کو

رگ رگ میں نیشِ عشق ہے، اے چارہ گر مرے
یہ درد وہ نہیں، کہ کہیں ہو کہیں نہ ہو

گرچہ ہے آمدِ جاناں کی خبر بازاری
ہے مگر سالکؔ مضطر کے سُنا دینے کی

زباں کٹ جائے گر لب سے تمہارا کچھ گلہ نکلے
مگر یہ تو کہوں گا، تم کو کیا سمجھا تھا کیا نکلے

اُس کے آنسو ٹپک پڑے سالکؔ!	حال اس درد سے کہا تو نے
جو پاس ہیں میرے، وہ خدا جانے کہاں ہیں	تم دور ہو، پر بیٹھے ہو گویا مرے آگے
ہم سے بھی مِل کر گیا، روتا ہوا سالکؔ ابھی	کیا ارادہ ہے؟ خدا جانے، کدھر جانے کو ہے
جان ہی دے کے عشق میں ہوئی خیر	آ گیا کچھ لیا دیا آگے

فارسی کا رنگ یہ ہے ؎

افروختم ز آتشِ دل شمعِ آہ را	در سینہ سوختم، نفسِ صبح گاہ را
تا نظر کردم بروبیت، از نگاہم خوں چکید	تا سخن گفتم ز خوبیت، از لبم بتخالہ ریخت
پنہاں ز ہمہ، او نظرے جانبِ ما داشت	رفتیم گر از جائے، مخندید کہ جا داشت
سوے عاشق، نگہِ مہر فزا، نتواں کرد	می کنی ہر چہ با اغیار، بما نتواں کرد
گر زندہ ام بہ ہجرِ تو، اے بے وفا، مرنج	مُردن بہ اختیارِ منِ سخت جاں نبود
در بہ بندم بشبِ وصل و چناں رقص کنم	راہ نا یافتہ مردم ہمہ دیوار آیند
جادہ پیمایاں کہ عزمِ کعبۂ دل کردہ اند	رفتہ اند از خویش و ہم در خویش منزل کردہ اند
شبِ وصال بہ غفلت گذشت، سالکؔ حیف	مثالِ عمر کہ در عالمِ شباب رود
در گفتگوے عشق، لب را ز بستہ ایم	از دل گرہ کشودہ، بر آواز بستہ ایم
روزِ وصلِ غیر و من اندر دعا	تا شود امروزِ اُو، فردائے من
اے بے خبر ز رنجِ فراق و نشاطِ وصل	دیر آمدی بسوے من و زود می روی

[روزِ روشن، ص ۵۵۴، ۵۵۵؛ بزمِ خانۂ جاوید (۴) ص ۳۷-۴۹؛ محبوب الزمن (۱)، ص ۵۱۰-۵۱۲؛ تزکِ محبوبیہ (۲) دفترِ ہفتم ص ۷۹-۸۰]

سالمؔ ـــــــ میر احمد حسین

اُٹھائے کوئی نہ فتنہ نیا قیامت میں
ٹٹولتا ہوں دلِ مبتلا کو تربت میں

[از خط منشی مہیش پرشاد مرحوم بنام مؤلف]

سجّادؔ ـــــــ نواب سیّد سجاد مرزا دہلوی

بہت نامی گرامی خاندان کے نام لیوا تھے۔ اودھ کے شاہی خاندان اور اِن کے اجداد ایک ہی تھے پدری سلسلہ برہان الملک سعادت علی خاں، میر محمد امین نیشاپوری نواب وزیر اودھ کے واسطے سے حضرت امام موسیٰ کاظم سے ملتا ہے اور مادری بخشی الملک نواب مرزا نجف خاں بہادر سے۔ یہ خاندان دہلی، لکھنؤ اور فیض آباد میں مقیم رہا۔ سب سے اوّل سجّاد مرزا کے دادا نواب مبارز الدولہ، ممتاز الملک حسام الدین حیدر خاں بہادر حسام جنگ لکھنؤ سے دہلی آئے۔ یہ بیٹے تھے نواب سراج الدولہ غیاث محمد خاں نیشاپوری کے جو فارسی میں شعر کہتے اور قیامت تخلص کرتے تھے (متوفی ۱۲۲۰ھ۔ درزیر پنہاں شدی اے آفتاب)۔ نواب حسام الدین حیدر خاں بہادر خود بھی شاعر تھے ناؔمی تخلص تھا۔ میر مستحسن خلیقؔ (والد میر انیسؔ) اور میر تقی میرؔ دونوں سے مشورۂ سخن کیا۔ یہی وہ بزرگ ہیں، جنھوں نے غالبؔ کی شاعری کے آغاز میں اُن کا کلام لکھنؤ میں اپنے اُستاد میرؔ کو دکھایا تھا جس پر اُنھوں نے وہ مشہور فقرہ کہا کہ "اگر اس لڑکے کو کوئی کامل اُستاد مل گیا تو بے نظیر شاعر بن جائے گا، ورنہ مہمل بکنے لگے گا۔" ان کے بیٹے ناظر حسین مرزا نے اُن کا اُردو کلام جمع کر کے شائع کیا۔ اس دیوان پر غالبؔ نے ایک دیباچہ فارسی زبان میں لکھا تھا جو اُن کے کلیاتِ فارسی میں موجود ہے۔ ناؔمی نے ۳ اکتوبر ۱۸۴۶ء (۲۲ شوال

۱۲۶۲ھ) کو بعارضۂ فالج وفات پائی۔ مدفن علی گنج (دہلی) میں درگاہ قدم مبارک کے بیرونی چبوترے پر ہے۔ اُردو کے مشہور شاعر نواب سید محمد خاں رند لکھنوی حضرتِ نامیؔ کے علاتی بھائی تھے۔

نامیؔ کی تین اولادیں تھیں۔ مظفر الدولہ ناصر الملک مرزا سیف الدین حیدر خاں بہادر سیف جنگ۔ یہ ۱۸۵۷ء میں انگریزی گولی کا شکار ہوئے۔ اُن سے چھوٹی ایک لڑکی تھی قدسیہ بیگم (عرف حسینی صاحبہ) یوسف مرزا جن کے نام غالبؔ کے خط ہیں انھیں کے بیٹے تھے۔ سب سے چھوٹے ذوالفقار الدین حیدر (عرف ناظر حسین مرزا) تھے۔ ناظر حسین مرزا اپنے بھائی سے ۱۴ سال اور بہن سے ۴ سال چھوٹے تھے۔ یہی سجادؔ کے والد تھے۔

ناظر حسین مرزا کی شادی ۲۷ برس کی عمر میں جہاں آرا بیگم بنت نواب حیدر خاں بہادر سے ہوئی، جو قلعہ میں ملازم تھے۔ ناظر حسین مرزا اپنے خُسر کی جگہ تعینات ہوئے اور بعد میں ترقی کر کے خواصی ہو گئے۔ یہ عہدہ شاہزادوں کے لیے مخصوص تھا۔ ان کی بھی تین اولادیں تھیں۔ سجاد مرزا، اکبر مرزا، اور ایک صاحبزادی۔ یہ سید افضل حسین کو منسوب تھیں ان ہی کی بیٹی مولانا محمد حسین آزاد مرحوم کے بیٹے آغا محمد ابراہیم کے عقدِ نکاح میں آئیں۔

سجادؔ مرزا کے والد نواب معین الدولہ صفدر الملک، ذوالفقار الدین حیدر بہادر ذوالفقار جنگ المعروف بہ ناظر حسین مرزا، غالبؔ کے نہایت گہرے دوست تھے۔ بلکہ فارسی میں ان کے شاگرد بھی تھے۔ اگرچہ شعر نہیں کہتے تھے لیکن بلا کے سخن فہم، اور سخن سنج تھے۔ غالبؔ کا اُردو کلام انہی کے ہاں جمع ہو رہا تھا جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں دقفِ تاراج ہو گیا۔ یہ شاہی میں ناظر خاصہ تھے اور بہادر شاہ کی سرکار سے انھیں نظارت خاں بہادر کا خطاب ملا تھا۔ ۶۔ رمضان ۱۳۰۶ھ (۶۔ مئی ۱۸۸۹ء) کو ۷۳ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ علی گنج ہی میں مجلس خانے کی چار دیواری کے اندر پہلے دالان میں قبر ہے۔ قبر پر مندرجہ ذیل کتبہ کندہ ہے ؎

حسین میرزا چوں مرد در شش رمضان

ازاں کہ بود ز نسلِ امیر خیبر گیر

پے شمارۂ سالِ وفات رضواں گفت
"بیا بکارِ جناں اے امیر ابنِ امیر!"
۱۳۰۶ھ

سجاد مرزا کو گویا امارت کے ساتھ شاعری بھی ورثے میں ملی تھی۔ اوایل میں غالب سے اصلاح لی اور ان کی وفات کے بعد ان کے متعدد دوسرے شاگردوں کی طرح سالک سے مشورہ کرتے رہے۔ غزل کے علاوہ مرثیہ بھی خوب لکھتے تھے۔ ۱۸۷۷ء (۱۲۹۳ھ) میں گھوڑے سے گر کر وفات پائی۔ میرزا عبدالغنی نے تاریخ کہی۔ ع

بیٹھ کر "رنج و غم" سے کھینچوں "آہ"

("رنج و غم" کے اعداد (۱۳۰۰) سے آہ (۷) کا تخرجہ ہے جس سے ۱۲۹۳ھ برآمد ہوتے ہیں) دوسری تاریخ میر شاہجہاں کامل نے کہی۔ ع

ہے ہے، ز پشتِ اسپ افتادہ"

دراصل یہی جوان بیٹے کی ناگہانی موت ناظر مرزا کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی۔ ۱۸۵۷ء کی افتاد کے بعد سے وہ بہت پریشان حال تھے۔ رہی سہی کسر سجاد مرزا کی جوانا مرگی نے پوری کر دی۔ اس سے اُن کے دماغ کا توازن بگڑ گیا اور وہ اس کے بعد اپنی موت تک ٹھیک نہیں ہوئے۔

سجاد مرزا بھی علی گنج ہی میں اسی دالان میں دفن ہیں، جہاں ان کے والد ماجد کی قبر ہے۔

سجاد کے چھوٹے بھائی سید اکبر مرزا بھی شاعر تھے۔ سید تخلص تھا۔ پہلے سالک سے اصلاح لی، بعد میں حالی سے مشورہ کرتے رہے۔

سجاد کی غزل کا نمونہ یہ ہے:-

غیر کا کوچہ ہے، اور گرد ہے لڑکوں کا ہجوم
ہے محبت میں یہ ساماں، ترے سودائی کا

آپ کے پند و نصائح ہیں بجا سب واعظ!
عقل اس وقت میں اک نام ہے بن آئی کا

انگلیاں شہر میں اٹھتی ہیں، جدھر جاتا ہوں
اور ابھی دور ہے، عالم مری رسوائی کا

یہ جو دیوانہ سا پھرتا ہے، وہی ہے سجّاد شہر میں شور تھا، جس شخص کی دانائی کا؟

[خاندانی حالات (قلمی)؛ خمخانۂ جاوید (۴)
ص ۸۲-۸۴؛ ایضاً، ص ۳۱۰-۳۱۱؛
خطوطِ غالب (۲)، ص ۸۶-۹۰؛ واقعات
دارالحکومت دہلی (۳)، ص ۶۷-۷۲]

سخن ـــــ خواجہ میر فخرالدین حسین خاں دہلوی

ان کے والد خواجہ جلال الدین حسین عرف حضرت صاحب تھے جو بیٹے تھے ابوالقاسم نظام الدین احمدؒ رضوی المعروف بہ خواجہ فقیر چشتی مودودی کے۔ اگرچہ یہ خاندان ایک زمانے سے دہلی میں مقیم تھا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اصل میں ان لوگوں کا وطن سندھ تھا کیونکہ ان کا سلسلۂ نسب حضرت شاہ خواجہ حسین مودودی لکھاری چشتی سے ملتا ہے (لکھاری سندھ میں ایک قصبہ ہے)۔

سخنؔ ۱۲۵۸ھ کے لگ بھگ دہلی میں پیدا ہوئے اور سنِ شعور تک یہیں رہے۔ ان کے والد اور خاندان کے دوسرے بزرگ لکھنؤ میں تھے۔ شاہی میں یہ لوگ ممتاز عہدوں پر متمکن رہے۔ ۱۸۵۴ء (۱۲۶۹ھ) میں سخنؔ بھی نقلِ مکان کر کے لکھنؤ چلے آئے اور اپنے چچا خواجہ محمد بشیر کے پاس مقیم رہے جو عہدِ واجد شاہی میں ممالکِ محروسہ کی فوجداری کے مہتمم تھے۔ کچھ عرصہ بعد (۱۸۶۰ء) ان کے پھوپھا مرزا احمد ابراہیم خلف الصدق مرزا محمد صدیق صاحب بہادر صدر امین سارن (ضلع شاہ آباد۔ بہار) انھیں اپنے وطن آرہ لے آئے اور اپنی دخترِ نیک اختر ان کے حبالۂ عقد میں دے دی۔

سخنؔ نے ۱۸۶۱ء میں درجۂ اوّل کی سند حاصل کی تھی چنانچہ آرہ میں وہ مدتوں وکالت ہی کا پیشہ کرتے رہے۔ پھر حکام کی سفارش سے منصفی کے عہدے پر مقرر ہوئے۔

اسی دوران میں انگریزی سیکھ لی اور بالآخر صدر اعلیٰ (سب جج) ہو گئے۔

تصوف میں بھی کچھ دخل تھا اور آرہ کے قیام کے دوران میں حضرت شاہ قیام اصدق چشتی کے مرید ہو گئے تھے۔

بچپن میں اردو فارسی غالب سے پڑھی۔ بعد میں جب شاعری کا شوق ہوا تو انھیں سے اصلاح بھی لینے لگے۔ غالباً ان کی غالب سے کچھ رشتہ داری بھی تھی۔ یہ انھیں اپنا "جدِ فاسد" یعنی نانا لکھتے تھے لیکن صحیح رشتہ متعین نہیں ہو سکا۔ غالب کے صفِ اول کے شاگردوں میں سے تھے۔ اگرچہ سیّد فرزند احمد صفیر بلگرامی نے بھی انھیں اپنا شاگرد لکھا ہے، لیکن یہ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اردو نثر بھی خوب لکھتے تھے۔ مرزا رجب علی بیگ سرور نے اپنے مشہورِ زمانہ فسانۂ عجائب میں دہلی کی زبان پر تعریض کی تھی۔ سخن نے سروشِ سخن کے تاریخی نام سے ایک افسانہ اس کے جواب میں لکھا۔ اور حب الوطنی کا حق ادا کر دیا۔

اسی طرح جب قاطع برہان کے قضیے میں مختلف اطراف سے غالب پر نظم و نثر میں بوچھاڑ ہوئی، تو یہ بھی اپنے استاد کی طرف سے سینہ سپر ہو کر میدان میں نکل آئے۔ ہنگامۂ دل آشوب میں ان کے تین قطعے شامل ہیں۔ ۱۹۰۰ء (۱۳۱۸ھ) میں کلکتے میں انتقال کیا۔ مولوی محمد وزیر، مالکِ مطبع گوہر آصفی کلکتہ نے تاریخ کہی:۔

سال رحلت آں، وزیرا دلِ حزیں گفت "دردا، آہ فخر الدین حسین"

۱۳۱۸ھ

سخن نے فسانۂ سروشِ سخن کے علاوہ ایک اور نثری کتاب "تہذیب النفوس" بھی اپنے صاحبزادے خواجہ سید محمد محی الدین حسین کی تعلیم و تربیت کے لیے لکھی تھی۔ یہ بھی چھپ چکی ہے۔ اردو دیوان ۱۳۰۳ھ (۱۸۸۶ء) میں مطبع نولکشور لکھنؤ سے نکلا تھا۔ اس کے شروع میں غالب کی لکھی ہوئی ایک نثری تقریظ بھی شامل ہے۔ فارسی کلام غالباً غیر مطبوعہ رہ گیا۔

سخن بڑے قادر الکلام اور صاحبِ فن شاعر تھے۔ زبان اور محاورے کے مالک تھے۔ معاملہ خوب لکھتے تھے۔ ان کا دیوان سادگی اور رنگینی کا اچھا خوش نما مرقع ہے۔ اردو کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

جلوہ فرما ہے تو ہر رنگ میں اے جانِ جہاں
تو نے جس جامے کو پہنا ہوا زیبا کیسا

مجھ کو دیوانہ بنایا ہے، تری اُلفت نے
لوگ سمجھاتے ہیں آ کر مجھے کیسا کیسا

نہ منہ کھلواؤ سب کے سامنے، جانے دو کیا حاصل!
سبب تم جانتے ہو میری رنجش ہائے پنہاں کا

اُس کے آنے کی مسرت ہے، مگر فکر یہ ہے
کیا کہوں گا، جو مرے حال کا پرساں ہوگا

خوش و ناخوش بسر ہو جائے گی یہ زندگی لیکن
جسے آرام کہتے ہیں، نہ یاں ہوگا نہ واں ہوگا

اب آپ جا کے کسی اور کو یہ دم دیجے
یہاں تو آپ کے وعدوں کو بس سلام کیا

ہے بدی عدو سے، تو اُس کی طرف نہ دیکھ
چڑھ جائے اس کو زہر نہ تیری نگاہ کا

وہ ناز ہیں، کہ اُٹھانے ہر اک کو مشکل ہیں
وہ جَور ہیں، کہ نہیں جن کی آسماں کو خبر

کسی کو کیا نظر آئے، نگاہِ ناز تری
یہ تیر وہ ہے، کہ جس کی نہیں کماں کو خبر

دم بھر میں، ایک تیری "نہیں" نے مٹا دیے
کیا کیا خیال تھے دلِ اُمیدوار میں

دیکھا مجھے، تو غیر سے آنکھیں چرا گئے
کیا اس نگاہِ لطف میں پنہاں تم نہیں

ر وہ اُلفت ہی سہی، بغض و عداوت ہی سہی
پھر مجھے دیکھتے تم کیوں ہو، اگر کچھ بھی نہیں

اک یقیں میرا کہ کچھ بھی نہیں، اور سب کچھ ہے
اک ترا وعدہ کہ سب کچھ ہے مگر کچھ بھی نہیں

یوں ناز تو ہر ایک ترا قہر ہے لیکن
اک بات نئی ہے ترے بے ساختہ پن میں

اپنے گھر وہ بلا گئے ہیں، غضب کا مژدہ سنا گئے ہیں
پھر ان کے دم میں ہم آ گئے ہیں کہ جن سے دھوکا اٹھا چکے ہیں

چاہتا ہوں، نہ بولوں اُس سے، مگر
دل تو کم بخت مانتا ہی نہیں

ی طرح کوئی پیماں شکن جہاں میں نہیں
کہ جس کے قول میں انکار جس کی ہاں میں نہیں

جو کچھ ہے، مجھ پر ہے، فقط تیرے تغافل سے
اگر تو دوست ہے میرا، تو دشمن آسماں کیوں ہو

ی تو میں بھی زندہ ہوں تمہارے ظلم سہنے کو
ستم کا حوصلہ غیروں پہ صرفِ امتحاں کیوں ہو

عدۂ حشر پہ تسکین ہو کیوں کر دیکھو
تم وہاں بھی تو یہ کہہ دو گے "نہیں یاد مجھے"

[خم خانۂ جاوید (۴)، ص ۱۳۹ - ۱۴۳؛
نوائے ادب (سہ ماہی) جولائی ۱۹۵۰ء؛
سروش سخن (خاتمہ)؛ نگار (اپریل ۱۹۵۳ء)
ص ۴۳ - ۴۴؛ ذکرِ غالب، ص ۱۸۰ - ۱۸۲ -]

سرور ـــــــ دیبی پرشاد دہلوی

ان کا ایک قطعۂ تاریخ نواب محمد احمد علی خان بہادر رونق ٹونکی کے دیوان (رونقِ سخن) کے آخر میں نظر سے گزرا۔

چو شد دیوانِ رونق طبع امسال	کہ از روے بقاے نام گردد
سرور امشب بفکرِ سالِ او بود	کہ از غیبم چہا الہام گردد
بگفتا ہاتفِ غیب از سرِ داد	کہ تا کارِ منِ ناکام گردد
زہے دیوانِ رونق طبع گردید	"الٰہی دل پذیرِ عام گردد"

۱۳۳۱ھ + ۴ = ۱۳۳۵ھ

سرور ـــــــ چودھری عبد الغفور مارہروی

افسوس کہ ان کے حالات زیادہ معلوم نہیں ہو سکے؛ سوائے اس کے کہ یہ غالب۔ دوست سجادہ نشین مارہرہ جناب سید شاہ صاحب عالم صاحب کے ملنے والے بلکہ ہم مشرب اور ہمراز تھے۔ غالب کے خطوط کے مجموعہ عود ہندی کی ترتیب انھیں کے ذمے ہوئی تھی۔ چنانچہ سب سے پہلے سرور ہی نے منشی محمد ممتاز علی خاں رئیسِ میرٹھ کی فرمائش پہنچنے

نام کے خطوط مرتب کیے، ان کا نام مہرِ غالب رکھا اور اُن پر ایک دیباچہ لکھا۔ لیکن بعد میں خان بہادر ذوالقدر منشی غلام غوث بیخبر نے اِدھر اُدھر کے دوسرے اصحاب سے خطوط وغیرہ لے کر ان میں اضافہ کیا اور یہی مجموعہ عودِ ہندی کے نام سے پہلی بار غالب کی وفات سے چار ماہ پہلے اکتوبر ۱۸۶۸ء میں شائع ہوا۔

سرورؔ نے اپنے نوشتہ دیباچہ کے آخر میں یہ قطعہ تاریخ لکھا تھا ۔

انشا، مملو بصد مطالب لکھی — یعنی ہے عاشقانِ طالب لکھی

موسوم کیا جو مہرِ غالبؔ سے سرورؔ — تاریخ بھی اسکی "مہرِ غالبؔ" لکھی

۱۲۷۸ھ

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنا کام ۱۲۷۸ھ (۱۸۶۲ء) میں ختم کرلیا تھا اور بقیہ خطوط اور نثر و ل وغیرہ کو جمع کرنے میں مزید چھ برس صرف ہوئے۔

ان کا کلام نہیں ملتا۔ حسنِ اتفاق سے ان کے چند قطعات محفوظ رہ گئے ہیں جو انھوں نے سید فرزند احمد صفیر بلگرامی کے ہاں بیٹا پیدا ہونے کی تقریب پر لکھے تھے۔

اس کے علاوہ ایک قصیدہ نعتیہ ملا ہے وغیرہ ۔

مرے فرزند احمدؐ کا وہ فرزند — دعا گو جس کا ہر فردِ بشر ہے

الٰہی اس کو تو رکھیو سلامت — کہ نخلِ زندگانی کا ثمر ہے

نویدِ فرحتِ میلادِ مولود — سرورِ سینہ و نورِ نظر ہے

سرورؔ خوش دل شاداں نے تاریخ — لکھی فی الفور "یہ لختِ جگر ہے"

۱۲۸۳ھ

صد شکر خدائے پاک فرزند — دادہ بہ شفیقِ قدر دانم

زیں مژدۂ دل فزائے جاں بخش — شاداں شدہ روح وہم روانم

ہر صبح دعائے عمر و جاہش — بر ذروۂ عرش می رسانم

تاریخش یافتم مسیحی — "نورِ نظر و نشاطِ عالم" ۱۸۶۶ء

[عودِ ہندی (دیباچہ)؛ آج کل؛ فروری ۱۹۵۵ء]

سرورؔ ـــــ شیخ محمد امیر اللہ اکبرآبادی

یہ بیٹے تھے شیخ عبداللہ کے۔ ۱۲۴۳ھ میں دہلی میں تھے۔ غالب کے علاوہ شیخ رحمت اللہ مجرمؔ اکبرآبادی سے بھی اصلاح لی۔

[شاعر آگرہ نمبر]

سروشؔ ـــــ صاحبزادہ عبدالوہاب خاں بہادر رام پوری

رام پور کے حکمران خاندان سے تھے۔ اُن کے والد صاحبزادہ عبدالرحمٰن خاں بہادر اور دادا نواب غلام محمد خاں بہادر غفراں مآب تھے۔ جو نواب یوسف علی خاں بہادر فردوس مکان کے بھی دادا ہوتے تھے (خاندان کا مفصل حال نواب یوسف علی خاں بہادر ناظم کے ترجمہ میں لکھا گیا ہے)۔

سروشؔ ۱۲۳۸ھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدا میں مومنؔ سے مشورہ کرتے رہے۔ پھر غالب سے اصلاح لی۔ اور اُن کی وفات کے بعد خوش وقت علی خاں خورشید سے استفادہ کیا۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

تھامتا دل کو، کہ آنکھوں کو نہ رونے دیتا — ایک ہی جھگڑے ہزاروں، کہو کیا کیا کرتا

قتلِ عالم کو کیا، ایک نظر میں تو نے — کون باقی ہے ستم گار جو پُرساں ہوگا

سچ تو یہ ہے، لاکھ سر مارا کرو، ماتھا گھسو — کچھ کرو، لکھا نہیں مٹتا کبھی تقدیر کا

[انتخاب یادگار (۲)، ص ۱۷۲-۱۷۳؛
خم خانۂ جاوید (۴)، ص ۱۸۹-۱۹۰۔]

سوزاںؔ —— حبیب الدین احمد انصاری سہارنپوری

ان کے والد کا نام خواجہ معین الدین انصاری تھا۔ سلسلۂ نسب مشہور صحابی ابو ایوب انصاری تک پہنچتا ہے۔ ۱۸۲۴ء میں پیدا ہوئے۔ فارسی کی تعلیم بہت معقول تھی۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد سہارنپور سے دہلی آ گئے۔ عاشق تن آدمی تھے۔ یہاں دہلی میں کوٹھوں کی سیر کرنے لگے۔ شاعری کا شوق پہلے سے تھا۔ اس رند مشی نے گویا سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ غالبؔ کی اصلاح نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ نظم و نثر دونوں خوب لکھتے تھے۔ چنانچہ قیامِ دہلی کے دوران میں اخبار الاخیار کے ایڈیٹر بھی ہو گئے تھے۔ بہت سی کتابیں نثر میں یادگار چھوڑیں۔ جن میں سے تاریخ عجیب در حالات حکمائے یونان، تریاق مسموم، تاثیر القلوب، گنج شایگاں (قافیہ میں) قابلِ ذکر ہیں۔

استاد کے عاشق تھے۔ جب تک غالبؔ زندہ رہے، انھوں نے دہلی چھوڑ کر کہیں جانے کا نام تک نہیں لیا۔ لیکن ان کی وفات کے بعد یہاں سے دل اچاٹ ہو گیا اور واپس سہارنپور چلے گئے۔ چنانچہ لکھتے ہیں ؎

غالبؔ سے کام تھا، سو وہ سوزاںؔ گذر گئے
دہلی میں اب جناب کا کیا کام رہ گیا

اگرچہ معاش کا کوئی خاص ذریعہ نہیں تھا اور تنگی ترشی سے بسر ہوتی تھی۔ لیکن عجیب قانع طبیعت پائی تھی۔ کبھی ماتھے پر بل نہیں لائے۔ اور ہنستے کھیلتے زندگی کے دن گذار دیے۔ ۶۵ برس کی عمر میں ۱۸۸۹ء میں جاں بحق ہوئے۔

ایک مختصر دیوان ان کی زندگی میں شائع ہوا تھا۔ کلام کا بہت بڑا حصہ غیر مطبوعہ رہ گیا جس کے تنگ دستی کے باعث چھپنے کی نوبت نہ آئی۔ کلام سے بھی زندہ دلی و رشوخی ٹپکتی ہے۔

...میں بھول اور یہ غم وصلِ یار کا
تو جانتا ہے درد، دلِ بے قرار کا

...ری نگاہِ مست، اثر دل میں کر گئی
ساقی، یہ جام لے، کہ مرا کام ہو گیا

...وس، کہ دل خوش نہ ہوا، مل کے کسی سے
ماتم کدۂ دہر میں، جو تھا، سو حزیں تھا

شیخ، منہ کو ہر گھڑی دھوتا ہے کیا — دھو سکے، تو اپنے دل کا داغ دھو

توبہ کا ارادہ تو ہمارا ابھی ہے، اے شیخ! — لیکن ذرا آ جائے بڑھاپا، ابھی کچھ اور

لطف کم کیجے کہ اس بندہ کے حق میں آپ کا — اب ستم اچھا ہے اور لطف و کرم اچھا نہیں

حق تعالیٰ غم کسی کو دے، تو سوزاں عشق کا — ورنہ دنیا کا ہو یا دیں کا ہو، غم اچھا نہیں

جاتے ہیں، پر افسوس، یہ ہم کو نہیں معلوم — جائیں گے کہاں اور ہم آئے ہیں کدھر سے

آتی ہے تجھے دیکھ کے کیا کیا مرے دل میں — پر کہہ نہیں سکتا ہوں میں ظالم ترے ڈر سے

بس اب عشقِ بتاں کر ترک، سوزاں! — خدا کا خوف کر، بندے خدا کے

جانے کس وقت سے الفت کی ہوں فارغ سوزاں — جامِ مے، ساقیِ گلفام! لگا رہنے دے

[خم خانۂ جاوید (۴)، ص ۲۸۸ — ۲۸۹؛
یادگارِ ضیغم، ص ۱۷۵ - ۱۷۶۔]

سوزاں و مداح — شیخ محمد صادق علی گڈھ مکتیسری

اگرچہ گڈھ مکتیسر وطن تھا، لیکن سکندرہ (ضلع علی گڈھ) میں رہتے تھے۔ سرکاری ملازم اور پرمٹ کے محکمے میں درجہ اول کے انسپکٹر تھے۔ عالم اور گھر کے کھاتے پیتے خوش حال آدمی تھے۔ سوزاں اور مداح دونوں تخلص کرتے تھے، نعت کہنے کا بھی شوق تھا اور التزام یہ تھا کہ عام عاشقانہ کلام میں تخلص سوزاں تھا اور نعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں مداح۔ چنانچہ نعتیہ دیوان میں جو ۱۲۸۴ھ (۱۸۶۸ء) میں چھپا تھا، تخلص شروع سے آخر تک مداح ہی استعمال کیا ہے۔ ایک تذکرہ بھی لکھا تھا۔ جواب نہیں ملتا۔

ان کے صاحبزادے نثار علی شہرت کسی زمانے میں نامی پریس میرٹھ میں ملازم تھے۔

نمونۂ کلام یہ ہے:-

اس کو بلوایا تو ہے، لطف تب اے دل آئے — ساتھ تلوار بھی لائے، جو وہ قاتل آئے

ایسا نہ ہو کہ ظلم سے بھی ہاتھ اٹھائے یار کیوں کہیے، ناز اٹھانے کی طاقت نہیں رہی

ایک نعت کے دو شعر ہیں ۔

نگینِ دل ہمارا ہے مزین نقوشِ نامِ ختم المرسلیں سے

صلہ مدحت کا لو سیاح چل کر حضورِ خسروِ دنیا و دیں سے

[سخن شعرا، ص ۴۲۶؛ یادگار ضیغم، ص ۳۸۰؛
اردو ادب، اکتوبر/ دسمبر ۱۹۵۴ء، ص ۱۱۲-۱۱۳۔]

سیاح ــــــ منشی میاں داد خاں اورنگ آبادی

ان کے والد منشی عبداللہ خاں کا اورنگ آباد کے امیر لوگوں میں شمار تھا۔ اس لیے سیاح کا بچپن نہایت عیش و عشرت اور آرام و آسایش میں بسر ہوا۔ لیکن جب یہ سن رشد کو پہنچے، تو سب جاید اد ٹھکانے لگ چکی تھی۔ یار باش اور زندہ دل آدمی تھے۔ مزاج میں بہت نفاست تھی۔ خوش لباس ایسے کہ کپڑے دہلی میں سلواتے۔ عطر کا شوق اس درجہ کہ جس گلی کوچے سے نکل جاتے وہ مہک اٹھتا اور لوگ محض فضا کی خوشبو سے کہہ دیتے کہ سیاح اس طرف سے گذرے ہیں۔

فارسی زبان بے تکان بولتے تھے۔ طبیعت میں تیزی اور بذلہ سنجی اور ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ جہاں جاتے لوگوں سے بے تکلف دوستی پیدا کر لیتے۔ اپنے اہتمام سے مشاعرے کرتے۔ پڑھنے کا انداز بھی بہت دلکش تھا۔ انھیں باتوں سے لوگوں کو ان پر انگریزوں کا جاسوس ہونے کا شبہ ہوا۔ آخر یہی روشنیِ طبع بلائے جان ثابت ہوئی۔ ۱۸۷۰ء میں ان پر جعلی سکے بنانے کا مقدمہ قائم ہوا، اور یہ ماخوذ ہو کر قید کر دیے گئے۔

واقعہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ اچھے خطاط اور فن مصوری کے ماہر تھے اس لیے

انھیں قلب سازی سے دل چسپی پیدا ہو گئی۔ تا بکے؟ ۱۸۷۰ء میں یہ بمبئی سے حیدر آباد گئے۔ ریل کے اسٹیشن سے ٹکٹ خریدا اور سَو روپے کا نوٹ بھنایا۔ اتفاق دیکھیے کہ اُن کے بعد جو دوسرا مسافر آیا۔ اُس نے بھی ٹکٹ کے لیے سَو ہی کا نوٹ پیش کیا اور ستم یہ ہوا کہ اس دوسرے نوٹ کا نمبر بھی وہی تھا جو سیاحؔ کے نوٹ کا تھا۔ فوراً تفتیش شروع ہوئی اور آخر سیاحؔ حیدر آباد سے پکڑے آئے۔ مقدمہ چلا اور چودہ سال قید کی سزا ہو گئی۔ لیکن خوش قسمتی سے پوری مدت قید خانے میں نہیں رہے۔ قید خانے کا منتظم ایک پارسی شخص تھا۔ اس نے قید کے ایام ہی میں اپنے لڑکوں کی تعلیم اِن کے سپرد کر دی۔ پھر جب ۱۸۸۷ء میں ملکہ وکٹوریہ کی جوبلی کا دربار ہوا، تو اِن سے قصیدہ لکھوا کر اپنی سفارش کے ساتھ اوپر بھیج دیا جس سے سزا میں تخفیف ہو گئی اور یہ قبل از وقت قید سے رہا ہو گئے۔

شروع میں تخلص عاشق تھا۔ جب غالبؔ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے زاے بڑھا کر سیاحؔ کر دیا۔ چوں کہ انھوں نے ہندستان کے طول و عرض بلکہ عرب و عجم میں بہت سفر کیے تھے۔ اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا۔ اس لیے یہ تخلص ان پر خوب صادق آتا تھا۔ غالبؔ نے انھیں سیف الحق خطاب بھی دیا تھا اور اپنی اُردو کتاب لطائفِ غیبی ان ہی کے نام سے چھاپی تھی۔

۱۸۶۲ء میں نواب میر غلام بابا خاںؒ سی، آئی، ای (C.I.E) رئیس سورت کی

۱؎ نواب غلام بابا خاں ۲۰۔ دسمبر ۱۸۳۴ء (۴۔ شعبان، ۱۲۵۰ھ) کو سورت میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید اپنی قاضیِ شہر اور درگاہِ سید جمال الدینؒ کے سجادہ نشین تھے۔ جب ۸۔ مارچ ۱۸۴۸ء (۲۔ ربیع الثانی ۱۲۶۴ھ) کو اُن کا انتقال ہو گیا، تو اس کے بعد غلام بابا خاں کی تعلیم و تربیت ان کے بڑے بھائی سید جمال الدین نے کی۔ اگرچہ خود شعر نہیں کہتے تھے، لیکن شاعروں اور ادیبوں کے قدر دان اور متکفل تھے۔ غالبؔ سے بھی خط و کتابت رہی اور گاہے ماہے اُن سے سلوک بھی کرتے رہے۔

۱۹۔ اپریل ۱۸۹۳ء (۲۔ شوال ۱۳۱۰ھ) کو انتقال کیا۔ اور اپنے خاندانی قبرستان درگاہ حضرت سید جمال الدین عرف خواجہ دیوانہ ("دانا") میں مدفون ہوئے۔

مصاحبت اختیار کرلی۔ نواب صاحب کی زندگی بھر تو یہ بہت عافیت سے رہے۔ لیکن جب ۱۸۹۳ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ تو ان کا ستارہ بھی گردش میں آ گیا۔ اس کے بعد کے دس بارہ برس بہت تنگی کی حالت میں بسر کیے۔ ان ایام میں اُن کے ایک دوست اور مداح حکیم شیخ محمد (یا محمود) میاں صاحب نے دست گیری کی اور اُن کے کفیل رہے۔

تقریباً ۸۵ برس کی عمر تھی جب ۱۹۰۷ء میں سورت میں وفات ہوئی۔ وہیں محلہ "بڑے خان کا چکلہ" میں خواجہ دیوانہ صاحب (یعنی خواجہ سید جمال الدین؟) کی خانقاہ میں مدفون ہیں۔

سورت ہی کے ایک معزز خاندان میں شادی کرلی تھی۔ اس سے متعدد اولادیں ہوئیں۔ لیکن مشیئت ایزدی کہ اُن میں سے کوئی بچہ زندہ نہیں رہا۔ آخر عمر میں محلہ سید واڑہ (سورت) کے ایک شریف خاندان کی لڑکی کو گود لے لیا تھا اس کی پرورش کی اور اپنے سامنے اس کی شادی کردی۔ اُسی کی اولاد موجود ہے۔

دیوان اگرچہ مرتب کرلیا تھا، لیکن اس کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔ ایک مختصر رسالہ "سیر سیاح" ۱۸۷۲ء میں شائع کیا تھا جس میں شمالی ہندستان میں اپنی سیاحت کا مختصر حال اور دو مشاعروں کی روداد درج کی ہے۔ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی نے کچھ مختصر کلام شائع کر دیا ہے، یہ بھی غنیمت ہے۔

چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

لیا بوسہ جو ابرو کا، تو کیا کیا غیظ میں آ کر
کبھی دیکھی مری صورت، کبھی تلوار کی صورت

سندِ فقراء پر زاہد نہ کرے کیوں کر تکیہ
ہم فقیروں کو ہوا، فضلِ خدا پر تکیہ

لطفِ املاک و امارت ہو امیروں کو نصیب
فضلِ خالق سے فقیروں کا ہوا گھر، تکیہ

عجب گر ہو گئی رونے سے چشمِ تر سفید
ابر کالے، بعد بارش ہوتے ہیں اکثر سفید

نمک تھا یہ ناتوانی سے لہو اس جسم کا
ذبح قاتل کر چکا، لیکن رہا خنجر سفید

بے کسی میں، میری رفاقت جو تم نے کی
جان اپنی تم پہ کرتا ہوں، رنج و محن! نثار

بلے جس نے غم سیاحؔ! راحت بھی وہی دیگا
ترقی ہوتی ہے دنیا میں، کہتے ہیں، تنزل سے

عجز بربادیٔ عشاق ہے آرائشِ حسن
اور اُلجھاتے ہیں خاطر کو سلجھ کر گیسو

آئے ہیں عیادت کے لیے غیر کے ہمراہ ساتھ اپنے، مری موت کو بھی لائے ہوئے ہیں
کہہ دو سنبھل کے میکدے میں آئے محتسب ٹوٹیں گے خم ضرور، مگر اس کے سر کے ساتھ
قفس میں سیرِ گلشن کی اگر مانگے دعا دل سے صدائے خندۂ گل آئے، فریادِ عنادل سے
کہو گر جان، تو سمجھے کہ ہم کو بے وفا سمجھا سمجھ اس بدگماں کی سارے عالم سے نرالی ہے

[میاں دادخاں سیاح اور ان کا کلام؛ سیر سیاح؛
سخن شعرا، ص ۲۳۰-۲۳۱؛ خم خانۂ جاوید دوم، ص ۳۰۰،
۳۰۲؛ معاصر (د)، ص ۱۲۳ - ۱۳۸؛ گلدستۂ سخن،
ص ۴۷- ۴۸۔]

شاداں دخیالی ــــــ میرزا حسین علی خاں دہلوی

میرزا زین العابدین خاں عارف کے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ جب عارف ۱۸۵۲ء میں واصلِ حق ہوئے، تو یہ صرف دو برس کے تھے۔ چونکہ اِن کی والدہ کا اس سے چند ماہ پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ اس لیے غالب کی بیوی امراؤ بیگم انھیں اپنے پاس لے آئیں۔ عارف کی والدہ بنیادی بیگم (جیسا کہ عارف کے ترجمے میں بیان ہوا ہے) امراؤ بیگم کی بڑی بہن تھیں۔ حسین علی خاں کے بڑے بھائی باقر علی خاں جو عمر میں ان سے تین برس بڑے تھے، عارف کی وفات کے بعد اپنی دادی بنیادی بیگم کے پاس رہے اور اُن کی وفات کے بعد یہ بھی غالب کے پاس آ گئے۔

حسین علی خاں کی تعلیم و تربیت شروع سے غالب کی نگرانی میں ہوئی۔ چونکہ ان کی اپنی صُلبی اولاد کوئی نہیں تھی، اس لیے انھوں نے ان دونوں بچوں کو نہایت دل سوزی اور محبت سے پالا پوسا اور ان کے ہر طرح کے لاڈ چاؤ برداشت کیے۔ یہ ہر وقت ان کے گلے کا ہار بنے پھرتے تھے۔ میرزا جہاں کہیں جاتے، یہ اُن کے ساتھ ہوتے۔ رام پور کے

دونوں سفروں میں بھی ساتھ رہے۔

میرزا حسین علی خاں اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں فکرِ سخن کرتے تھے۔ اُردو میں تخلص شاداںؔ تھا اور فارسی میں خیالیؔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں تخلص راقمؔ تھا۔ بہت کم سنی میں لکھنا شروع کیا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے خونی ہنگامے کے بعد ایک معرکے کا مشاعرہ ہوا تھا، جس میں بیشتر مشہور حاضر الوقت شعرائے حصہ لیا تھا۔ یہ مجموعہ فغانِ دہلی کے نام سے اکمل المطابع دہلی سے شائع ہوا تھا (۱۸۶۳ء)۔ اس مشاعرے کے وقت ان کی عمر ۹۔۱۰ برس سے زیادہ نہیں تھی۔ اس مجموعہ میں ان کا فقط یہ ایک شعر شامل ہے ؎

مٹ گیا، خوب ہوا، نام و نشانِ دہلی کس کی پاپوش ہے مرثیہ خوانِ دہلی

غالب کی زندگی تک انھیں سے مشورہ کرتے رہے اور اُن کے بعد کم تر حالیؔ سے اور بیشتر سالکؔ سے اصلاح لی۔ اُسی زمانے میں بزمرۂ شعرا ملازم ہو کے رام پور چلے گئے۔ یہ خلد آشیاں نواب کلب علی خاں بہادر کا زمانہ تھا اور اس قدر دانِ کمال کا شہرہ سُن کر ہر طرح کے علوم و فنون کے ماہر رام پور میں جمع ہو گئے تھے۔ لیکن نواب خلد آشیاں نے ان تمام اصحاب کو ریاست کے کسی نہ کسی کام پر لگایا ہوا تھا۔ تاکہ یہ لوگ احدیوں کی طرح مفت کی تنخواہ نہ کھائیں۔ شاداںؔ بھی شروع میں تیس روپے کے ملازم ہو کے گئے بعد میں اضافہ ہوا تو ساٹھ ملنے لگے۔

مئی ۱۸۷۶ء میں شاداںؔ کے بڑے بھائی کا عین جوانی میں انتقال ہو گیا۔ محبوب بھائی کی دائمی جدائی نے ان کا دماغی توازن بگاڑ دیا اور یہ نوکری چھوڑ کے دلی چلے آئے، بلکہ ایک طرح کے مالیخولیا میں مبتلا ہو گئے تھے۔ انھیں یہ توہم ہو گیا تھا کہ شاعر کے لیے دُبلا پتلا ہونا لازم ہے اور موٹا آدمی شاعر نہیں ہو سکتا۔ چونکہ داغؔ ماشاء اللہ خاصے تن و توش کے مالک تھے، اس لیے لالہ سری رام کی روایت کے مطابق شاداںؔ کہا کرتے تھے کہ داغؔ کو کبھی شعر کہنا نہیں آئے گا، کیونکہ شاعری اور فربہی میں بہت بُعد ہے، آخری ایام میں ان کا یہ وہم اس حد تک بڑھ گیا تھا، کہ کھانا پینا بالکل ترک ہو گیا۔

سیپیوں میں پانی پیتے تھے۔ قدرتاً تندرستی بالکل تباہ اور کمزوری حد سے سوا ہو گئی۔ آخر اسی حالت میں ۷ ستمبر ۱۸۸۰ء (یکم شوال ۱۲۹۶ھ) کو انتقال کیا۔ نساخ نے تاریخ لکھی ؎

برفت آہ شاداں ز دنیائے دوں
خدایا مقامش بفردوس باد
برائے سن رحلتش، خامہ ام
رقم کرد، "شادانِ فرخ نہاد"

۱۲۹۶ھ

سلطان جی میں حضرت محبوب الٰہی کی پائنتی اپنی خاندانی ہڑواڑ میں بڑے بھائی کے پہلو میں دفن ہوئے۔ کلام مرتب نہیں ہوا۔ پختگی، محاورہ اور روزمرہ، شوخی اور تازگی اس کے نمایاں وصف ہیں۔ افسوس عمر نے وفا نہ کی ورنہ بہت ترقی کی صلاحیت تھی۔

تیری ہر ادا پہ مرتا، ترے ہر سخن پہ جیتا — مجھے موت زندگی پر، اگر اختیار ہوتا
مری خاک ہو تسلی، ترے وعدۂ غلط پر — تجھے گر ہنسی نہ آتی، مجھے اعتبار ہوتا

غیروں پہ ہیں وہ لطف کہ بڑھتے ہیں ہمیشہ — ہم پر یہ ستم ہے، کہ سوا ہو نہیں سکتا

شاداںؔ نے دل لگا کے بتوں سے، برا کیا — اس سے یہ رازِ عشق چھپایا نہ جائے گا

پردہ اٹھا ہوا ہے رخِ پُر جمال کا — اڑتا ہے آج رنگ، ہمارے خیال کا
کیا اس پہ پڑ گئی، کوئی اس شوخ کی نگاہ — بدلا ہوا جو طور ہے قاصد کی چال کا
عالم نہ مجھ سے پوچھیے میرے خیال کا — آئینہ بن گیا ہوں، کسی کے جمال کا
بھڑکے اگر چراغ، تو ہستی تمام ہو — ہر چیز کا کمال ہے، باعث زوال کا

بھول جاؤ گے سب خوشی، شاداںؔ! — کسی غمگیں سے جب ملیں گے آپ

کل ہو کے دو چار، اس نگہِ شوخ سے یارب! — آنکھوں میں ٹھہرتی ہی نہیں میری نظر آج
دیکھا ہے میری بے خودیِ شوق کو تو نے — قاصد! نہ رہے گی تجھے اپنی بھی خبر آج

تم تو آتے ہی رہے بہرِ عیادت، اور ہم — مر گئے چارۂ آزارِ جگر ہوتے تک

دیکھیں وہ اچھے ہیں یا شمع ہے بہتر اُن سے
رنگ کھل جائے گا اس کا بھی سحر ہونے تک

دیکھا ہے ہیں نے خوب مریدوں کو شیخ کے
اچھے وہی ہیں یار جو پیرِ مغاں کے ہیں

پہلو میں میرے اور یہ پیدا ہوا رقیب
آثارِ عشق رخ پہ مرے رازداں کے ہیں

شاداں چھپائے لاکھ پہ چھپتے بھی ہیں کہیں
آثار اس کے چہرے پہ عشقِ بُتاں کے ہیں

بے خودی کام آ گئی آخر
کہ انھیں مجھ سے کچھ حجاب نہیں

خیر ہو آج بزم کی شاداں!
کہ وہ آتے ہیں اور نقاب نہیں

شرماتے ہو کہ نیند کا آنکھوں میں ہے خمار
کل کی سی بات ہی نہیں طرزِ نگاہ میں

ہو چکی شیشے میں مے مجھ تک جو آیا دورِ جام
گردشِ قسمت تھی اپنی گردشِ ساغر کے ساتھ

اُٹھ کر درِ جاناں سے کہو کوئی کدھر جائے
جی سے نہ گذر جائے تو دنیا سے گذر جائے

ساغر کشِ میخانۂ توحید ہوں ناصح!
وہ نشہ نہیں مجھ کو جو ہاتوں سے اُتر جائے

رنجوریِ اُلفت کا مری پوچھیے نہ انجام
آغاز میں وہ درد ہے جو حد سے گذر جائے

فارسی کا کلام کہیں سے نہیں ملا۔ تذکرۂ انتخابِ یادگار میں یہ پانچ شعر ہیں۔ پہلے دو غزل کے اور آخری دو قصیدوں میں سے جو خلد آشیاں نواب کلب علی خاں کی مدح میں کہے گئے تھے۔

آغوشِ گور تنگ شد از بے قراریم
اے دل! ز پہلوے کہ جدا گشتہ ایم ما

شرم می آید خیالی را بجنگِ آسماں
کایں جوانے ہست و او یک پیرِ دیریں سالہ است

چہ احتیاجِ نگہباں بعہدِ دولتِ او
کہ پاسبانِ جہان است طالعِ بیدار

اگر غلط نکنم نا وکش خطا نکند
رہا کند سوے عنقا اگر بعزمِ شکار

غم نیز در خوشی ست کہ فارغ شدہ زکار
بر جاے خود بہ بسترِ خواب آرمیدہ است

[انتخابِ یادگار (۲) ص ۱۲۷؛ خم خانۂ جاوید (۳)
ص ۳۷۹-۳۸۰؛ ذکرِ غالب، ص ۱۴۰-۱۴۲؛
فغانِ دلی، ص ۱۵۵۔]

شاکر ـــــــ سید محمد عبدالرزاق مچھلی شہری

ان کا خاندان عربی الاصل تھا۔ ان کے آبا و اجداد جزیرۃ العرب سے پہلے غزنی آئے۔ جہاں اب تک اُن کے سلسلے کی ایک خانقاہ موجود ہے۔ غزنی سے اُن کے مورث قاضی سنا الدین نام شاہانِ شرقی (جونپور) کے زمانے میں واردِ ہندستان ہوئے اور یہاں حکومت کے مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ بعد میں اس خاندان کی دو شاخیں ہو گئیں۔ ایک پھلواری شریف جائسی اور دوسری مچھلی شہر میں۔ شاکر کا تعلق اِسی موخر الذکر شاخ سے ہے۔ ان کے والد کا اسمِ گرامی سید عبدالوہاب تھا۔

شاکر عربی فارسی کے زبردست فاضل تھے، جیسا کہ غالب کے اُن کے نام کے خطوط سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ دونوں زبانوں میں بے تکان لکھتے اور گفتگو کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ علمِ انساب کے بھی بہت بڑے عالم تھے۔ انھیں اپنے نسب کے تحفظ کا بے حد خیال تھا۔ اپنا نسب نامہ بڑی کاوش سے جمع کیا۔ اس سلسلے میں خاص طور پر عراق اور عرب اور افغانستان آدمی بھیج کر بہ صرفِ زرِ کثیر معلومات فراہم کیں۔ اس موضوع پر کچھ رسالے بھی مرتب کیے تھے۔ چونکہ حضرت جعفر طیارؓ اور حضرت فاطمۃ الزہراؓ بنت رسول اللہ صلعم کی بڑی صاحبزادی حضرت زینبؓ کی نسل سے تھے، اِس لیے کبھی کبھی اپنے نام کے ساتھ جعفری الحیدری یا جعفری الزینبی لکھا کرتے تھے۔ اپنی غزلوں کے بعض مقطعوں میں بھی اِس نسب کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

اُڑ کے میں پہنچوں گا شاکر خلد میں — نسل سے ہوں جعفرِ طیار کی

خاندانِ شاکرِ بیکس نہ کیوں مظلوم ہو — آلِ زینبؓ ہے اِسے میراثِ زینبؓ چاہیے

اس کے علاوہ حضرت غوثِ اعظم سید عبدالقادر جیلانیؓ سے بہت عقیدت تھی۔ ایک شعر میں کہتے ہیں ؎

محو بودم در تلاشِ کعبۂ امن و اماں — وحش اللہ آستانِ شاہِ جیلاں یافتم

اِسی غلو کا نتیجہ تھا کہ وہ اپنی وصیت میں لکھ گئے کہ میری اولاد میں سے کوئی فرد

کسی غیر ہاشمی خاندان میں رشتۂ ازدواج قائم نہ کرے۔

ابتدا میں وکالت کا امتحان دیا۔ اور اس میں کامیابی کے بعد وکالت شروع کی۔ اسی لیے غالب نے ایک خط میں انھیں اشرف الوکلاء کہہ کے خطاب کیا ہے۔ پھر ۱۸۷۲ء میں سرکاری ملازمت قبول کر کے منصف بن گئے اور ترقی کر کے پہلے سب ججی اور پھر عدالت خفیفہ کی ججی کے عہدوں پر مامور رہے۔ دورانِ ملازمت میں بہت دن تک الہ آباد میں قیام رہا۔ یہیں غالب کے دوست اور مہربان خواجہ غلام غوث خان بہادر بے خبر[1] سے ملاقات ہوئی۔ ۱۸۹۴ء میں ملازمت سے سبکدوش ہو کر علی گڑھ میں سکونت اختیار کر لی۔ اسی برس کی عمر تھی

---

[1] خواجہ غلام غوث خاں بے خبر نجیب الطرفین خواجہ حضور اللہ بن خواجہ خیر الدین کشمیری کے بیٹے تھے۔ دادھیالی سلسلۂ نسب سلطان زین العابدین والیِ کشمیر تک پہنچتا ہے۔ نانھیال کی طرف سے خواجہ داؤد خاکی اُن کے اجداد میں تھے۔ ان کے بزرگ خاندانِ مغلیہ کے زمانے میں بالعموم قضا کے عہدوں پر فائز رہے۔ جب ملازمت کا سلسلہ ہاتھ سے جاتا رہا تو تجارت کو ذریعۂ معاش بنایا۔

بے خبر ۱۸۲۵ء (۱۲۴۰ھ) میں نیپال میں پیدا ہوئے۔ چار برس کے تھے جب ان کے والد نقل مکان کر کے ہندستان آئے اور بنارس میں سکونت اختیار کی۔ چنانچہ بے خبر کی نشو و نما اور تعلیم و تربیت اسی شہر میں ہوئی۔ پہلے لفٹنٹ گورنر غرب و شمال کے نائب میر منشی اور بعد میں میر منشی ہو گئے۔ ۴۴ برس تک نیک نامی سے ملازمت کر کے ۱۸۸۵ء میں پنشن پائی۔ "خان بہادر" اور "ذو القدر" خطاب ملے۔ اُردو سے کم اور فارسی سے زیادہ شغف تھا۔ فارسی نظم و نثر کا ایک مجموعہ خونابۂ جگر کے نام سے اور اُردو خطوط فغانِ بے خبر کے نام سے ان کی زندگی میں چھپے۔ بقیہ کلام نظم و نثر اُن کی وفات کے بعد ان کے ایک عزیز مولوی خواجہ حسین الدین بنارسی نے ۱۹۰۸ء (۱۳۲۶ھ) میں شائع کیا تھا۔ ۱۸۔ شوال ۱۳۲۲ھ (۲۶ دسمبر ۱۹۰۴ء) کو الہ آباد میں انتقال فرمایا۔ وہیں دائرہ شاہ محمدی میں دفن ہوئے۔ لوحِ مزار پر جو قطعہ تاریخ ہے، اس کا آخری شعر ہے ؎

رضوانش دیدہ گفت کہ ایں نور دیدہ کیست
گفتند حوریانِ جناں "خواجۂ بہشت"
۱۳۲۲ھ

(صحیفۂ زریں (آگرہ و اودھ) ص ۱۰۳-۱۰۵؛ خم خانۂ جاوید (۱) ص ۶۴۷-۶۴۸؛ انشائے بے خبر (دیباچہ)؛)۔

جب جون ۱۹۱۴ء میں اپنے وطن مچھلی شہر میں انتقال کیا۔ طلب علم اور علم دوست احباب سے استفادہ کا شوق اخیر تک نہیں چھوٹا۔ آخری ایام میں جب کہ کان آنکھ بالکل جواب دے چکے تھے۔ کتابیں پڑھوا کے سننے اور احباب کی خاطرداری میں مشغول رہتے۔ جسمانی یادگار تین صاحبزادے چھوڑے۔ سب سے بڑے سید محمد تقی تھے۔ یہ بھی تعلیم پوری کر کے سرکاری ملازم ہو گئے تھے۔ آخر عمر میں ریاست جے پور میں نو برس تک وزیر مال رہے۔ اور وہیں ۱۹۲۲ء میں انتقال فرمایا۔ اُن سے چھوٹے سید علی نقی علی گڑھ میں ایڈووکیٹ اور مسلم یونیورسٹی میں قانون کے پروفیسر تھے۔ یہ ۱۹۳۲ء میں جنت سدھارے۔ سب سے چھوٹے سید محمد ہادی (ہادی مچھلی شہری) بفضلہ زندہ موجود ہیں۔ یہ بھی شاعر ہیں۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں کہتے ہیں۔ اُردو مجموعہ کلام نوائے دل کے عنوان سے چھپ چکا ہے۔ آج کل کراچی میں مقیم ہیں۔

شاکر اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ لیکن کبھی دیوان مرتب کرنے کا خیال نہیں کیا۔ اس لیے چند غزلوں کے سوائے سارا کلام ضائع گیا۔ ان ہی کا انتخاب درج ذیل ہے پہلے فارسی سُنیے جس میں نمک زیادہ ہے۔

غالبؔ کی مشہور غزل ہے ؎

دُودِ سودائی تتق بست آسماں نامید مش | دیدہ بر خواب پریشاں زد جہاں نامید مش

اِسی زمین میں شاکرؔ کی ایک غزل ہے۔ اس کے چند شعر ہیں ؎

سر من داد ند و من بارِ گراں نامید مش | سُود ایں عالم نمود ندم، زیاں نامید مش
من سرودم نغمۂ وصفت ہزار آوا شدم | غیر در مدحِ تو دم زد، باد خواں نامید مش
روز یم صدرہ بہ یُمن میہماں چوں دست داد | خویش را مہماں نوشتم، میزباں نامید مش
حضرتِ دلّی مقامِ حضرتِ غالبؔ چو شد | غیرتِ شیراز و رشکِ اصفہاں نامید مش

مولوی غلام امام شہید کا ایک شعر بہت مشہور ہے ؎

ہر کجا تخمِ محبت کاشتیم | خاک ہم بر باد رفت و دانہ ہم

اسی زمین میں شاکرؔ کی غزل کے چند شعر ملاحظہ کیجیے ؎

بادہ ہست و شیشہ و پیمانہ ہم | کاش بودے ساقیِ مستانہ ہم
ہر یکے در دورِ چشمش شد خراب | مے فروش و مے کش و پیمانہ ہم

درشبِ ہجرِ تو داغِ دل گم است　　شد خموش امشب چراغِ خانہ ہم

ہر کسے در عشقِ تو، از من برید　　آشنا ہم، خویش ہم، بیگانہ ہم

دید شاکر ابروے خمدارِ یار

شکر کرد و سجدۂ شکرانہ ہم

قدسی کی مشہور نعت کی تضمین لکھی تھی جس کی تعریف غالب نے اپنی اور آزردہ کی طرف سے لکھی ہے۔ یہ مجموعہ "حدیثِ قدسی" میں بھی شامل ہے۔ اور چند شعر سنیئے۔

جبہہ اش را غیرتِ خورشیدِ تاباں یافتم　　چشم را چشمک زنِ چشمِ غزالاں یافتم

خالِ مشکین ست بر لعلِ لبِ جاناں مقیم　　زنگیے را حارسِ شہرِ بدخشاں یافتم

آفتابِ حشر باشد روے تو　　نامۂ اعمالِ من گیسوے تو

مرحبا بر زخمِ دامن دارِ من　　آفریں بر قوتِ بازوے تو

مثلِ خسرو، کشت شاکر را ہمیں　　غمزۂ تو، چشمِ تو، ابروے تو

بادہ و معشوق ایمانِ من است　　مے پرست و بت پرستم یعلی

بادۂ وحدت مرا از خود ربود　　سرخوشِ عہدِ الستم یعلی

نیست شاکر نشۂ افلاس تو　　از ازل من فاقہ مستم یعلی

بے مہری و بے لطفی و کج خلقی و نفرت　　کیا کیا نہ مرے یار نے اغیار سے سیکھا

گرنا کبھی، اٹھنا کبھی، رہ رہ کے چمکنا　　بجلی نے مری آہِ شرر بار سے سیکھا

بادہ پیمائی میں مجھ سا رندِ مشرب چاہیے　　قلزمِ مے میرے ساغر میں لبالب چاہیے

تاک میں ہوں ساغرِ سرشار کی　　اس میں کیفیت ہے چشمِ یار کی

ہیچ ہے دنیا، ولے با ایں ہمہ　　دھوم ہے عالم میں اس مردار کی

[اردوے معلی (ماہنامہ) دسمبر ۱۹۱۲ء؛
مکتوبات ہادی مچھلی شہری بنام مؤلف۔]

شاہ ــــــ انور علی عظیم آبادی

غالب سے بذریعہ خط و کتابت مشورہ کیا۔ مرثیہ میں دبیر کے شاگرد تھے۔ آخر عمر میں زیادہ تر تصوف کی طرف رجحان ہو گیا تھا۔ اور شعر و سخن سے زیادہ لگاؤ نہیں رہا تھا، بلکہ اپنے ایک شاگرد عبدالکریم نشتر کو اپنی بیاض دے کر حکم دیا، کہ اسے لے جا کر گنگا میں ڈال دو۔ فرماں بردار شاگرد نے بتعمیلِ حکم میں اسے دریا بُرد کر دیا۔ عظیم آباد میں اُن کے شاگردوں کی اچھی خاصی تعداد تھی۔ چند شعر سنیے ؎

کچھ ایسے واقعات مرے دل کے ساتھ ہیں
جیتے تو ہیں، مگر بڑی مشکل کے ساتھ ہیں

مایلِ حسن پرستی ہے طبیعت اپنی
خلق میں عشقِ بتاں سے ہوئی خلقت اپنی

دل پہ قابو نہیں بے بس ہیں علی انور شاہ
آ ہی جاتی ہے حسینوں پہ طبیعت اپنی

(نگار، اپریل ۱۹۵۳ء) ص ۴۴-۴۵

شائق ــــــ سیّد شاہ عالم مارہروی

مارہرہ کے مشہور خاندانِ سادات میں سے تھے۔ ان کے والد حضرت شاہ صاحب عالم خلف سید خورشید علی بلگرامی عرف پیارے صاحب سجادہ نشین درگاہ برکاتیہ (سرکارِ خورد) تھے۔ سید صاحب عالم خود بھی شاعر تھے۔ صاحب تخلص تھا۔ اُردو میں کم اور فارسی میں زیادہ کہا اور اس فن میں میرزا محمد حسن قتیل[ے] کے علاوہ اپنے ماموں سید افتخار علی بلگرامی ذرہ کلم

ے قتیل پیدائشی ہندو تھے۔ اصلی نام دیوانی سنگھ تھا۔ بعض لوگوں نے انھیں غلطی سے کائستھ لکھا ہے حالانکہ بھنڈاری کھتری تھے۔ والد کا نام درگاہی مل اور بزرگوں کا وطن بٹالہ (ضلع گورداسپور۔ پنجاب) تھا۔ جہاں سے غالباً قتیل کے پردادا نقلِ مکان کر کے باغپت چلے آئے۔ قتیل ۱۱۷۲ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے

سے بھی اصلاح لی۔ ولادت ۲۹۔ اکتوبر ۱۷۹۶ء (۲۶۔ ربیع الثانی ۱۲۱۱ھ) کو بلگرام میں ہوئی اور ۷۷ برس کی عمر میں ۲۴۔ مارچ ۱۸۷۱ء (۲ محرم ۱۲۸۸ھ) کو مارہرہ میں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئے۔ شاہ علی احسن، احسن مارہروی مرحوم ان کے پرپوتے تھے۔

شاہ عالم شائق انہی صاحب کے منجھلے بیٹے تھے۔ افسوس کہ ان کے زیادہ حالات نہیں ملے۔ یہ ۱۲۴۰ھ میں پیدا ہوئے۔ اور ان کا انتقال ۱۹۔ اکتوبر ۱۸۸۵ء (۱۰ محرم ۱۳۰۳ھ) کو ہوا۔

ان کے بھانجے سید فرزند احمد صفیر بلگرامی (شاگرد غالب) کے ہاں صاحبزادہ ہوا۔ جس کا نام نور احمد رکھا گیا تو اس کی تاریخ ولادت کہی ؎

چوں نشوم شاد، کہ ناگہ زشرق — مژدہ رساں پیک صبا آمدہ
گفت، کہ در خانۂ شمس الضحیٰ — رشک سہا، بدر الدجیٰ آمدہ
ہاں بوجود آمدہ پور صفیر — کو ہمہ تن ذہن و ذکا آمدہ
شائق شاداں پے تاریخ طفل — گفت "زہے شمس سخیٰ آمدہ"
۱۲۸۳ھ

(لطف یہ ہے کہ خود صفیر کا تاریخی نام شمس الضحیٰ ہے)۔

[جلوۂ خضر (۲) ص ۲۰۷؛ قاموس المشاہیر (۲) ص ۲۵؛
اردو ادب (اکتوبر۔ دسمبر ۱۹۵۴ء) ص ۱۱۳۔]

(صفحۂ گزشتہ سے آگے) اور ۱۸ برس کی عمر میں مرزا محمد باقر شہید اصفہانی کی تعلیم سے متاثر ہو کر فیض آباد میں اسلام قبول کیا۔ مرزا محمد حسن نام ہوا، اور اپنے استاد شہید کی رعایت سے قتیل تخلص اختیار کیا۔ کچھ مدت کے لیے نواب سعادت علی خاں کی سرکار کے متوسلین میں شامل رہے تو امامیہ مذہب کے پیرو بن گئے۔ بمرض استسقاء ۳۱۔ جنوری ۱۸۱۸ء (۲۳۔ ربیع الاول ۱۲۳۳ھ) کو لکھنؤ میں انتقال کیا۔ ناسخ نے تاریخ کہی ؎

سال ترحیل قتیل اے ناسخ
گفتہ ام "شہرۂ آفاق قتیل" ۱۲۳۳ھ

متعدد کتابیں لکھیں، جن میں سے رقعات اور چار شربت اور نہر الفصاحت زیادہ مشہور ہیں اور مدتوں درس میں شامل رہیں۔ انشا کی دریائے لطافت کی تصنیف میں بھی یہ شریک تھے مصحفی کے بھی بہت گہرے دوست تھے۔ مصحفی نے تذکرہ عقد ثریا انھیں کی فرمائش پر لکھا تھا۔

(عقد ثریا، ص ۴۶؛ شمع انجمن، ص ۳۹۰۔ ۳۹۱)

شائقؔ ــــــــ خواجہ فیض الدین عرف حیدر جان جہانگیر نگری

معزز خاندان کے فرد، خواجہ خلیل اللہ خاں کشمیری کے بیٹے اور جہانگیر نگر (ڈھاکہ) کے رہنے والے تھے۔ سر عبدالغنی سے بھی عزیز داری تھی۔ غالباً دہلی اور کلکتے بھی آئے تھے، اور ممکن ہے کہ غالبؔ سے ان کے قیامِ کلکتہ کے دوران میں ملاقات بھی ہوئی ہو۔ سخن شعرا کے بیان کے مطابق ۱۲۶۹ھ میں فوت ہوئے۔ اُردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ایک مختصر دیوان یادگار چھوڑا تھا، جو اب نہیں ملتا۔ خطوط کا بھی ایک مجموعہ قلمی صورت میں موجود ہے۔

تجھے عرش کا جس نے تارا بنایا — اُسی نے بد اختر ہمارا بنایا
اُسی نے کیا ہم کو رسوائے عالم — کہ جس نے تجھے عالم آرا بنایا
یہاں نالۂ بے اثر ہم کو بخشا — وہاں دل ترا، سنگِ خارا بنایا
نیا درد وہ ہم کو گردوں نے، شائقؔ! — کہ تدبیر جس کی، نہ چارا بنایا

جس کی ٹھوکر سے جی اُٹھے مردے — اُسی کی رفتار نے ہمیں مارا
یوں یہ تنِ خراب بنا، اور بگڑ گیا — جیسا کہ بس حباب بنا، اور بگڑ گیا

مری فسق و فجور میں عمر کٹی، کوئی حسنِ عمل تو کیا ہی نہیں
یہی فکر ہے دیکھیے کیا ہو وہاں، بجز اُس کے تو اور پناہ ہی نہیں
کوئی رفتۂ ملکِ عدم نہ پھرا، کہ جو پوچھوں وہاں کا میں حال ذرا
ہے مقام عجب، کہ وہ کیسی ہے جا، جو گیا سو وہاں کو پھرا ہی نہیں
مجھے بھائی تھی دستِ جنوں کی قضا، مرے دل میں بھرا وہ ذوق و مزا
گئے بارِ جنوں میں جو ایک ذرا، دلِ شائقِؔ خستہ لگا ہی نہیں

کیا کہیں تجھ بن کیا کیا ہم نے ساری رات کی — انتظاری، بے قراری، آہ و زاری رات کی
یاد میں اس سرو قامت کے یہاں تک روئے ہم — جوئے خوں چشموں سے شائقؔ! ہم نے جاری رات کی

صبا! اس کو کہیو، کہ تجھ کو خبر ہے — بہت حال شائقؔ کا تیرے بتر ہے

ہوا خواہ تھا میں کبھی جس چمن کا — یہ اڑتی سی پہنچی وہاں کی خبر ہے
نہ چلتی تھی جس جا نسیمِ سحر بھی — صبا کا وہاں آج شائق گذر ہے

مت لے خدا کے واسطے نخچیر ہاتھ میں — دل کو ہمارے پہلو سے لے چیر ہاتھ میں
سودا ہوا اس کی کاکلِ پیچاں کا سر میں آہ — ہو زلفِ یار کی مری زنجیر ہاتھ میں

فارسی کا نمونہ یہ ہے۔ پہلے حافظؔ کے ایک شعر کی تضمین ملاحظہ ہو۔

چند گویم شکوۂ ایام را — چند نالم بخت نا فرجام را — مطربا بنشیں کہ یابم کام را
"ساقیا برخیز و در دہ جام را — خاک بر سر کن غمِ ایام را"

ایک قصیدہ کے چند شعر ہیں، جو نواب سر عبد الغنی بہادر کے فرزند رشید نواب سر احسن اللہ بہادر کی ولادت پر لکھا تھا۔

للہ الحمد، کہ آمد بجہاں عہدِ بہار — خرم و شاد و ہمہ تازہ و تر شد گلزار
از سما تا بہ سمک ہست ہجومِ اقبال — ہمچو عنقا شدہ معدوم وجودِ ادبار
نازد از زادنِ او مادرِ گیتی بر خود — فخر صد فخر زماں را ز وجودش بپندار
ہر زماں گردشِ چرخ بلا گردان ست — ہست از بہرِ ہمیں گردشِ چرخِ دوّار
فکرِ تاریخ چو کردیم، "امیر اعظم" — ایں ندا آمدہ از غیب بگوشِ منِ زار
۱۲۶۲ھ

ہمیں بس بود خوں بہا، بعدِ قتلم — بفرما کہ "از کشتگانِ من است ایں"

[سخن شعرا، ص ۲۴۱؛ مشرقی بنگال میں اردو، ص ۳۰-۳۲؛ مشرقی پاکستان کے اردو ادیب ص ۲۵-۲۹؛ نگارستانِ سخن، ص ۴۵؛ سراپا سخن، ص ۱۹۷؛ تواریخ ڈھاکہ، ص ۳۲۷]

شفق ــــــ نور الدولہ سعید الملک نواب محمد سعد الدین خاں بہادر صولت جنگ (عرف منجھلے صاحب) رئیس کالپی

آپ کے والد بزرگوار افضل الدولہ احمد بخش خان بہادر عرف میر منوّ، بیتاب تخلص، نواب عماد الملک غازی الدین خاں خلف نظام الملک آصف جاہ کی اولاد میں سے، کدورہ کالپی کے رہنے والے تھے۔ پہلے سیّد امجد علی قلق[1] سے اور بعد میں غالب سے مشورہ کیا۔ بہت پختہ کلام ہے۔ چشمۂ فیض ایک نثری رسالہ اور دیوان اور ایک مثنوی یادگار ہیں۔ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں ایک مولود منظوم بھی مخزنِ سعادت کے نام سے ۱۸۵۲ء میں شائع کیا تھا۔ ۱۸۸۲ء (۱۲۹۸ھ) میں انتقال کیا اپنے پیچھے چار لڑکے چھوڑے۔

ان کے چھوٹے بھائی خواجہ نور الدین خاں عرف سانولے صاحب بھی شاعر تھے اور شیفتہ اور فروغ دو تخلص کرتے تھے۔ یہ بھی شفق کی طرح قلق ہی سے اصلاح لیتے تھے۔

شفق کے چند شعر ملاحظہ ہوں :-

مقامِ عشق میں غفلت ہی عینِ ہشیاری ... کہ راہ نمائے زلیخائے زار خواب ہوا

بگولے لیتے ہیں تعلیم مجھ سے، ہرزہ گردی کی
کہ آندھی ہو رہیں، صحرا سے جنوں کی خاک اڑائے ہیں

حوصلے دل میں تڑپنے کے ہیں کیا کیا، دیکھیے ... ذبح کر کے رقصِ بسمل کا تماشا دیکھیے

گھر سے وحشت میں نکلتے ہی وطن بھول گئے ... یہ فضا دشت کی دیکھی، کہ چمن بھول گئے

[گلستانِ سخن، ص ۲۸۹ - ۲۹۰؛
سخن شعرا، ص ۲۴۸ - ۲۴۹، ۲۵۰، ۳۶۶؛
خم خانۂ جاوید (۵) ص ۶-۷؛ نادراتِ غالب
(۱) ص ۱۶۴؛ ایضاً (۲) ص ۱۴۳ - ۱۴۴۔]

---

[1] سیّد امجد علی قلق۔ جناب سیّد محمد علی کے بیٹے تھے۔ بزرگوں کا وطن دہلی تھا لیکن نقل مکان کر کے لکھنؤ میں مقیم ہو گئے تھے۔ قلق خود کدورہ کالپی میں رہتے تھے۔ کلام پر اصلاح فخر الملک نواب میر منوّ بیتاب سے لی۔ صاحب دیوان ہیں۔ (سخن شعرا، ص ۳۸۷)

شوخی ——— نادر شاہ خاں رامپوری

ان کے والد محمد ضامن خاں، رام پور کے پٹھان تھے، لیکن شوخی دہلی میں پیدا ہوئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ان کی غالب سے ملاقات اور شاگردی کا دلچسپ واقعہ لکھا ہے۔ فرماتے ہیں کہ جب میرزا ۱۸۶۰ء میں فردوس مکان نواب محمد یوسف علی خاں بہادر کی دعوت پر رام پور تشریف لے گئے تو شوخی وہاں موجود تھے۔ یہ غالب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور اصلاح کی درخواست کی میرزا کا اصول یہ تھا کہ چونکہ میں دربار رام پور کا وظیفہ خوار ہوں، اس لیے رام پور میں والیِ ریاست کی اجازت کے بغیر کسی کو شاگردی میں قبول کرنا ٹھیک نہیں۔ انھوں نے شوخی کو بھی یہی جواب دیا اور ان کے کلام پر اصلاح دینا منظور نہ کیا۔ شوخی اس جواب سے مایوس تو بہت ہوئے لیکن ہمت نہ ہارے۔ چند دن بعد جب یہ پھر خدمت میں حاضر ہوئے، تو میرزا نے کہا کہ شراب کا ذخیرہ ختم ہو چکا ہے اور یہ صرف مراد آباد میں مل سکتی ہے اور ملازموں میں کوئی بھی اس اہم خدمت کے سرانجام دینے کا اہل نہیں۔ شوخی نے فوراً اپنی خدمات پیش کیں۔ گھر آئے، منت سماجت کرکے والد سے دام لیے اور ایک کی جگہ پانچ بوتلیں لاکے غالب کی خدمت میں پیش کردیں۔ جب غالب نے قیمت ادا کرنا چاہی، تو انھوں نے لینے سے انکار کردیا۔ اگلے دن جب یہ پھر حاضر ہوئے تو میرزا نے پوچھا کہ بھئی وہ تمہاری غزل کہاں ہے، جس پر تم اصلاح لینا چاہتے تھے۔ انھوں نے جھٹ سے کاغذ جیب سے نکال کے سامنے رکھ دیا۔ میرزا نے جگہ جگہ اصلاح دی اور ساتھ ساتھ اصلاح کے وجوہ بیان کرتے گئے۔ اس کے بعد جب میرزا دہلی چلے آئے تو یہ دہلی میں بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے بہرحال معلوم ہوتا ہے کہ شوخی نے غالب سے زیادہ استفادہ نہیں کیا۔ زیادہ سے زیادہ دس پانچ غزلوں پر اصلاح لی ہوگی۔

وسطِ عمر میں شوخی طلب معاش میں بنارس گئے اور وہاں کلکٹری کے دفتر میں پہلے نائب ناظر اور بعد میں پیش کار ہوئے میرزا قادر بخش صابر اُن دنوں بنارس میں مقیم تھے۔

شوخی اُن سے مشورہ کرنے لگے۔ اس کے بعد کلکتے چلے گئے اور وہاں کچھ تجارت کا سلسلہ کر لیا، مولانا آزاد سے اُن کی ملاقات یہیں ہوئی تھی۔ بیسویں صدی کے اوائل میں وفات پائی۔ متوسط درجے کا کلام ہے۔ ملاحظہ ہو۔

آج پھر پی کر شراب آئے ہیں اُن کی بزم میں — کل نکلوائے گئے تھے ہم اسی تقصیر پر

ہر ہر سخن پہ، جان نہ دینے کا ہے گلہ — اک بات آ گئی ہے بتِ خود نما کے ہاتھ

بنا کر دل کوئی میخانہ جی میں ہے شوخیؔ — کہ بعدِ مرگ زمانے میں یادگار رہے

کچھ روز، جوانی کے مزے لینے دے، زاہد! — دو چار برس میں تو قیامت نہیں ہوتی

[خم خانۂ جاوید (۵) ص ۶۶ - ۶۷؛ غالبؔ ص ۱۳۰ - ۱۳۳؛ یادگارِ ضیغم، ص ۲۱۳ - ۲۱۴]

شوکتؔ ــــــ نواب یار محمد خاں بھوپالی

ان کے والد ماجد نواب فوجدار محمد خان، نواب سکندر بیگم والیۂ بھوپال کے حقیقی ماموں تھے۔ شوکتؔ ۱۶ جولائی ۱۸۳۳ء (۲۷ صفر ۱۲۴۹ھ) کو پیدا ہوئے۔ عربی اور فارسی درسیات کی تکمیل مولوی سید محمد عبداللہ متوطن خوشاب (پنجاب) اور اخوند منشی احمد علی صاحب بوہرہ اور مولانا محمد عباس شروانی رفعتؔ سے کی۔ دیگر فنون مثلاً ادب و آداب، طبابت اور تلوار زنی سید علی اکبر خاں غازی سے اور سواریِ اسپ و فیل، سکندر محمد خاں رسالدار بھوپال سے حاصل کیے۔ غرض کہ استعدادِ علمی کے علاوہ سپہ گری میں بھی طاق تھے۔

غالبؔ سے تعلقات ان کے والد نواب فوجدار محمد خاں سے بہت دوستانہ تھے۔ غالبؔ کے قدیم اُردو کلام کا مجموعہ جو نسخۂ حمیدیہ کے نام سے شائع ہوا ہے، اُنھیں کے کتب خانے سے دستیاب ہوا تھا۔ شوکتؔ نے غالبؔ کے علاوہ اُن کے شاگرد مولانا محمد عباس شروانی رفعتؔ سے بھی اصلاح لی۔ شوکتؔ کا انتقال ۸ اگست ۱۹۱۲ء کو ہوا۔ بھوپال ہی میں پیر سیہ روڈ پر نواب یاسین محمد خان کے باغ میں مدفون ہے۔ اس باغ میں مغرب کی طرف نواب یاسین محمد خان کا عظیم الشان مقبرہ ہے۔ اس کے اندر کی قبروں کے زینے کے پاس، نیچے کی طرف جالی دار پختہ قبر ہے۔ قبر پر کتبہ نہیں۔

متعدد تصانیف اپنے پیچھے چھوڑیں۔ جن میں سے زیادہ مشہور دیوانِ شوکت۔ تذکرۂ فرح بخش۔ چار باغ شوکت۔ ہفتخوانِ شوکت۔ قرابادینِ شوکت۔ باز نامہ۔ فیل نامہ۔ فرس نامہ ہیں۔ ان سے ان کے مذاق کی بوقلمونی بھی ظاہر ہوتی ہے۔

یوں ہر اک کوچۂ سفاک سے باہر نکلا
کوئی بسمل، کوئی زخمی، کوئی مضطر نکلا

آ گئی موت، مگر ہم کو یہ حسرت ہی رہی
دم نہ بیمار کا، عیسیٰ کے قدم پر نکلا

ہست اور نیست میں ہے سب کو کلام
عقل حیراں، دہانِ تنگ میں ہے

تیر مژگان کا جو اثر دیکھا
توڑ ایسا کہاں خدنگ میں ہے

عشق میں کس کو رنجِ رسوائی
کب کوئی فکرِ نام و ننگ میں ہے

فارسی میں یہ رنگ ہے ؎

در دلم، زاں سرو قد، رفتار می باشد لذیذ
از لبِ شکرفشاں، گفتار می باشد لذیذ

بے محابا، دست ہا انداختن، در گردنم
ایں ادائے طرفہ، اے مہ خوار، می باشد لذیذ

مے ز دستِ دیگرے، زہر ست در کامِ دلم
شوکتا جام از کفِ دلدار می باشد لذیذ

[فرح بخش، ص ۲۸-۲۷؛ آثار الشعرا، ص ۱۴۳-۱۴۲؛
مکتوب جناب نادم سیتاپوری بنام مؤلف]

شہاب ـــــ شہاب الدین خاں رام پوری

حکیم نصیر الدین خاں کے صاحبزادے تھے۔ ۱۲۵۰ھ میں پیدا ہوئے، ریاست رام پور میں ایک پلٹن کے حوالدار تھے۔ فنِ طب میں بھی کچھ شُد بُد رکھتے تھے۔

فتنۂ دہر ہو، بیٹھے ہی رہو
گر اٹھو گے، تو قیامت ہو گی

بھول گیا ہے مجھے، اے سروِ گل اندام!
اک دم میں تری یاد سے غافل نہیں ہوتا

[انتخاب یادگار، ص ۱۸۵؛ یادگارِ ضیغم، ص ۲۱۴]

شہیر ـــــ افتخار الشعرا، حافظ خان محمد خان رام پوری ثم بھوپالی

مولوی غلام محمد خاں خلف حافظ غلام حسین خاں رام پوری کے صاحبزادے تھے ۱۲۶۱ھ میں نرسنگھ پور کندیلی میں پیدا ہوئے۔ "نور چشم راحت جان" تاریخ ولادت ہے۔ ان کے والد سرکار انگریزی میں معزز عہدوں پر ملازم رہے۔ ملازمت کا زیادہ زمانہ صوبجات متوسط کے مختلف مقامات پر تحصیلداری میں گذرا۔ پنشن لینے کے بعد وہ چھندواڑہ میں مقیم ہو گئے تھے اور وہیں کچھ جائداد بھی خرید لی تھی، جو شہیر کو ورثے میں ملی۔

شہیر کو شعر گوئی کا شوق اوائل عمر سے تھا۔ حسن اتفاق سے غالب کا سا استاد میسر آ گیا اور یہ شعر و سخن کے رموز سے خوب آگاہ ہو گئے۔

شہیر غالب کی وفات کے بعد ۱۸۷۲ء میں بھوپال میں ساٹھ روپے ماہانہ پر ملازم ہو گئے۔ چند نواب صدیق حسن خاں بہادر کے دونوں صاحبزادوں، مولوی نور الحسن خاں اور مولوی علی حسن خاں کے اتالیق بھی رہے بلکہ مولوی نور الحسن خاں کلیم تو بعد میں اپنے کلام پر اصلاح بھی انھیں سے لیتے رہے۔ شہیر کا سرمایۂ ناز ذخیرہ وہ فارسی قصیدے ہیں، جو انھوں نے نواب شاہجہاں بیگم والیۂ بھوپال اور ان کے شوہر نامدار امیر الملک نواب صدیق حسن خان بہادر کی مدح میں کہے ہیں وہ نظم و نثر میں غالب کی پیروی کی کوشش کرتے تھے۔ جب ۱۸۷۲ء (۱۲۹۰ھ) میں نواب شاہجہاں بیگم کو حکومت انگریزی کی طرف سے "تاج ہند" (CROWN OF INDIA) کا تمغہ ملا، تو شہیر نے ایک معرکے کا قصیدۂ تہنیت نذر گذرانا، اس پر انھیں ممدوحہ کی طرف سے خطاب "افتخار الشعرا" عنایت ہوا، اس قصیدے کا مطلع ہے ؎

مضمونِ اوجِ عرش، اگر من در آورم ۔۔۔ خواہم کہ سدرہ را بہ نشیمن در آورم

۱۳۱۸ھ یا ۱۳۱۹ھ (۱۹۰۰-۱۹۰۱ء) میں بھوپال میں لاولد فوت ہوئے۔ سیفیہ کالج کے متصل قلندر شاہ کے تکیہ میں مدفون ہے۔

شہیر اگرچہ شروع میں اردو میں بھی شوق کرتے رہے۔ لیکن بھوپال آ جانے کے بعد ان کی توجہ تمام تر فارسی پر مبذول رہی۔ بھوپال میں اُن کے شاگردوں کی خاصی تعداد تھی۔ کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

ہیں نام دارِ ہجر، عدوِ کام گارِ وصل
وہ کام کر گیا ہے، تو ہیں نام کر گیا

پوچھو نہ اہلِ عشق کو، کیا ہیں، کہاں کے ہیں
اچھے ہیں یا جس طرح کے ہیں، جو ہیں، جہاں کے ہیں

بزمِ جاناں میں جو جاتا ہوں، تو فرماتے ہیں
"ایک یہ بھی مرے ایام کی شامت آئی"

کوئی ہو، ان کی وحشتِ دل کا علاج ہو
اک ہم اگر نہیں، نہ سہی، غیر ہی سہی

فارسی کلام کا انتخاب یہ ہے ؎

اے فلک! ایں نہ تلافی ست، شبِ ہجراں را
رنگ وہ باختہ امشب بزبر دستیِ ما

اے شہیرؔ! آہ ز معراجِ وصال افتادیم
آسماں اوج فروشے ست بہ پستیِ ما

بہ رُوے خاک، عجب افتادہ ہستم
کہ تا زمانہ درافگند بر نداشت مرا

جفاے چرخ، حریفِ دل شہیرؔ نہ شد
قضا بدستِ ستم پیشگاں گذاشت مرا

چمن ترا ز دلِ داغدارِ ہجراں گشت
فغاں، کہ عشق مرا گشت و در بہاراں گشت

قتیلِ خنجرِ بے دادِ جاہلاں نہ شدم
شہیرؔ! قطعِ نگاہِ سخن شناساں گشت

کاش می ساخت کسے با دلِ سوزاں یک چند
شمع ہم سوختہ آخر ز شبستاں برخاست

نہ گل نہ غنچہ، نہ گلزار را فشاں باقی ست
ز بلبلاں خس و خاشاکِ آشیاں باقی ست

تو باش و شکوۂ بے مہریِ گل، اے بلبل!
بہارِ باغ اگر بگذرد، خزاں باقی ست

گماں مبر ز من، اے سوزِ غم! کہ نا دارم
بیا کہ مغز اگر سوخت، استخواں باقی ست

گذشت غالبؔ و رفت از جہاں بہادر شاہ
شہیرؔ باد، کہ نوابؔ قدرداں باقی ست

طبعم ازیں جنوں، بجنونِ دگر گشد
راہم ز خارِ رہ، بسوے نیشتر گشد

تمکینِ فردشِ یار و چہ دیوانگاں مرا
ایں اضطراب دل بسوے رہگذر گشد

اے کہ چشم، بہ تماشاے سراپاے تو شد
حسنِ تو وسوسہ فرماے تمناے تو شد

آئینہ را در آتشِ غیرت بسوختم
کز جلوہ خریدم و حیرت فروختم

کس از بزمت نہ رفت امشب بہانے کہ من رفتم
فغاں بر لب، قلق در دل، شکایت بر دہن رفتم

؎ نواب والا جاہ، امیر الملک سید محمد صدیق حسن خاں بہادر مراد ہیں۔

ایکہ سراغ من بری، درتہ پاشِ ہنگری — چوں منِ ناکِ پائے را نعش کجا، مزار کو

ودش گلچینِ گلستانِ بہارش بودم — گر بگلشن نگہے، گاہ بداماں نظرے

[صبح گلشن، ص ۲۳۰ - ۲۳۸؛ شمع انجمن، ص ۲۴۹۔

۲۵۱؛ طور کلیم، ص ۵۹ - ۶۰؛ آثار الشعرا، ص ۱۴۳۔

۱۴۵؛ مکتوب جناب نادم سیتاپوری بنام مولف]

شیر ——— سید محمد شیر خاں بہاری

قصبہ بہار شریف کے روساء میں شمار تھا۔ سید محبوب شیر صولت رئیس اعظم آباد کے خویش تھے۔ انجمن رفاہِ عام بہار کے سیکرٹری رہے۔ حج بھی کیا تھا۔ شیعہ مذہب کے پیرو تھے۔ میرزا غالب کے علاوہ وحید[1] الہ آبادی سے بھی مشورہ کیا۔

ہم کو دلیلِ عشقِ حقیقی ہوا مجاز — آوارگی نے کام دیا خضرِ راہ کا

کس رنگ پر ہے حسن مرے گل عذار کا — سر سے قدم تک ایک ہے عالم بہار کا

سیماب و برق کو نہیں لاتا خیال میں — جو حال دیکھتا ہے ترے بے قرار کا

[یادگار ضیغم، ص ۲۰۹؛ تاریخ شعرای بہار، ص ۱۲۵]

---

[1] مولوی وحید الدین وحید خلف مولوی امیر الدین عرف امیر اللہ کٹرہ (ضلع الہ آباد) کے رہنے والے تھے (بیاض سخن میں والد کا نام غلام حسین لکھا ہے، جو غلط ہے) نہایت عالی اور باوقار خاندان کے نام لیوا تھے۔ ۱۸۲۹ء میں پیدا ہوئے شیخ بشیر علی بشیر (شاگرد آتش) کے شاگرد تھے اور اپنے زمانے کے اساتذہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ اکبر الہ آبادی انہی کے نامور شاگرد تھے۔ وحید کی موت نہایت افسوسناک طور پر ہوئی۔ ان کے گھر میں آگ لگ گئی۔ یہ دوڑ کر باہر نکل آئے۔ یہاں پہنچ کے اپنا دیوان یاد آیا کہ عمر بھر کی کمائی تھی۔ اسے بچانے کے لیے واپس گئے۔ اتنے میں مکان میں اتنا دھواں بھر چکا تھا کہ انھیں باہر نکلنے کا راستہ نہ سوجھا۔ جب بعد میں لوگ تلاش کرتے ہوئے آئے تو

شیفتہ و حسرتی ——— نواب محمد مصطفیٰ خاں دہلوی

نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ کے والد عظیم الدولہ سرفراز الملک نواب مرتضیٰ خاں بہادر مظفر جنگ بنگش تھے اور والدہ مشہور جرنیل اسمٰعیل بیگ ہمدانی کی صاحبزادی جناب اکبری بیگم تھیں۔ نواب محمد خاں بنگش رئیس فرخ آباد اور نواب مرتضیٰ خاں کا خاندان دراصل ایک ہی تھا۔ سب سے پہلے شیفتہ کے دادا ولی داد خاں فرخ سیر کے عہد میں قسمت آزمائی کے لیے بنگشات (کوہاٹ علاقہ سرحد) سے ہندستان وارد ہوئے اور فرخ آباد میں مقیم ہو گئے۔

جب سلطنت دہلی میں خلل رونما ہوا تو نواب مرتضیٰ خاں، مہاراجہ جسونت رائے ہلکر کے لشکر میں شامل ہو گئے۔ ایک پلٹن کی کمان ان کے سپرد ہوئی۔ یہ وہ زمانہ ہے، جب لارڈ لیک، ہلکر کی سرکوبی کے درپے تھا۔ نواب مرتضیٰ خاں کی کوشش اور حسن تدبیر سے یہ لڑائی صلح و صفائی پر ختم ہوئی۔ لارڈ لیک ان کی خدمات سے بہت خوش ہوا، اور ان کے صلہ میں انھیں ۱۸۱۲ء میں تین لاکھ سالانہ کی جاگیر ہوڈل دپلول (ضلع گوڑ گانوہ) حین حیات کے لیے عطا ہوئی۔

نواب مرتضیٰ خاں کی بلند ہمتی نے اسی پر قناعت نہ کی اور اُنھوں نے اگلے ہی سال ۱۸۱۳ء میں جہانگیر آباد (ضلع میرٹھ) کا علاقہ اپنے ہونہار فرزند محمد مصطفیٰ خاں کے نام پر خود خرید لیا۔ جو پہلے راجہ کھودس رائے کی ملکیت تھا اور مالگزاری نہ ادا کیے جانے کی سزا میں نیلام ہو رہا تھا۔

جب نواب مرتضیٰ خاں کی وفات ہوئی تو ہوڈل دپلول کی جاگیر انگریزوں نے

(صفحۂ گزشتہ سے) تو دیکھا کہ ایک کرسی پر بیٹھے ہیں۔ دیوان کی بیاض ہاتھ میں ہے اور جاں بحق ہو چکے ہیں۔ یہ حادثہ ۹ اپریل ۱۸۹۲ء (۱۱ رمضان ۱۳۰۹ھ) کو پیش آیا۔ شاہ علیم الہ آبادی کے قطعہ تاریخ کا آخری شعر ہے ؎

تشنہ کامی گفت تاریخش علیم
جائے پاکش بر لب کوثر بود

دیوان کا انتخاب انجمن ترقی اردو نے "انتخاب وحید" کے عنوان سے ۱۹۲۹ء میں چھاپا تھا۔ اس کے شروع میں مختصر حالات بھی ہیں۔

واپس لے لی۔ لیکن خاندان کی گذشتہ خدمات کا خیال کر کے اس کی جگہ بیس ہزار روپیہ سالانہ زرِ نقد کی صورت میں مقرر کر دیا۔ البتہ جہانگیر آباد کا علاقہ چونکہ نواب مرتضیٰ خاں کا زرِ خرید تھا، وہ بدستور اُن کے خاندان میں رہا۔

نواب مصطفیٰ خاں ۱۸۰۶ء (۱۲۲۱ھ) میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم کے تمام مدارج بھی مختلف اساتذہ کی نگرانی میں یہیں طے ہوئے۔ وہ عربی اور فارسی دونوں میں دستگاہِ کامل رکھتے تھے۔ فارسی اور عربی میاں جی مالامال سے پڑھیں۔ جو اپنے زمانے کے مشہور اہل اللہ میں سے اور ممتاز معلم تھے۔ حدیث اور فنِ تجوید حاجی محمد نور دہلوی نقشبندی سے حاصل کیے۔ دورانِ حج میں حدیث کے چند سبق شیخ عبداللہ سراج حنفی اور شیخ محمد عابد سندھی سے لیے اور اُن سے سند حاصل کی۔

اپنے زمانے کے رئیسوں کی عام روش کے مطابق ان کی ابتدائی زندگی بھی بے راہ روی اور ... شوں سے پاک نہیں تھی۔ تقریباً تمام تذکرہ نویسوں نے اُن کے حالات میں نارنول والی رجّو کا ذکر کیا ہے۔ غالب سے ان کا شراب کا لطیفہ مشہور ہی ہے کہ ایک دن سردی کے زمانے میں سرِ شام شیفتہ اُن سے ملنے کو گئے۔ تو میرزا اُس وقت "ساغر و مینا" سے شوق کر رہے تھے۔ انھوں نے شیفتہ کو بھی دعوت دی۔ انھوں نے جواب دیا "حضرت! میں نے توبہ کر لی ہے۔" تو غالب بولے "ارے غضب کیا، کیا جاڑوں میں بھی!" اسی زمانے کا شعر ہے

ما حسرتی! از شیوۂ غالب گرفتہ ایم　　　آمیختن بہ بادۂ صافی، گلاب را

ــــہ یہ دو بہنیں تھیں۔ رجّو اور جنگجو۔ دونوں بڑی طرحدار اور یکتائے روزگار تھیں۔ رجّو چند روز شیفتہ کے پاس رہی۔ جنگجو میر رحیم مختار کار عدالتِ فوجداری کے گھر پڑ گئی تھی۔ چرخہ والوں (دہلی) میں ان کا عالی شان مکان اب تک موجود ہے۔ جشن اسکول کے برابر والی عمارت ہے۔ یہ ان سے سیٹھ لچھمی نرائن نے خریدی اور موخر الذکر نے بعد میں حکیم احسن اللہ خاں بہادر کے ہاتھ بیچ ڈالی۔ رجّو شعر بھی کہتی تھی۔ نزاکت تخلص تھا۔ مرنے کے بعد سلطان جی میں دفن ہوئی۔

(گلشن بیخار، ص ۲۲۸-۲۲۹؛ چمن انداز، ص ۱۵۰؛ سخن شعرا، ص ۵۸۰)

بہر حال بعد میں "شوقِ صنم" اور "خواہشِ صہبا" تمام منہیات سے توبہ کرلی۔ ۱۸۳۹ء (۱۲۵۴ھ) میں حج بیت اللہ کی غرض سے حجاز تشریف لے گئے۔[1] اس سفر کے حالات انھوں نے فارسی سفرنامہ "ترغیب السالک الی احسن المسالک" میں بیان کیے ہیں۔ اس کا دوسرا فارسی نام "رہ آورد" ہے۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ اس سفر میں اُنھیں مختلف طرح کے حادثے پیش آئے۔ یمن کی بندرگاہ حدیدہ سے کچھ آگے جہاز ایک تہہ آب پوشیدہ چٹان سے ٹکرا کر غرق ہو گیا۔ اور تمام مسافر کشتیوں کے ذریعہ ایک قریب کے ویران جزیرے پر اُتار دیے گئے۔ شیفتہ یہاں سے خشکی کے راستے یمن کا علاقہ عبور کر کے حجاز پہنچے اور زیارت بیت اللہ سے مشرف ہوئے اور آخر دو برس کی غیر حاضری کے بعد ۱۶۔ فروری ۱۸۴۱ء (۲۳۔ ذی الحجہ ۱۲۵۶ھ) کو واپس دہلی پہنچے۔

شیفتہ کو بزرگانِ دین کی خدمت کا شروع سے بہت شوق تھا۔ سب سے پہلے حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی کے نواسے شاہ محمد اسحاق محدث سے بیعت کی۔ ان کے وصال کے بعد شاہ غلام علی نقشبندی (سجادہ نشین و خلیفہ حضرت میرزا جان جاناں مظہرؒ) کے دونوں خلفاء شاہ ابوسعیدؒ اور شاہ احمد سعیدؒ کی خدمتِ بابرکت میں حاضر ہوئے اور ان سے فیوضِ باطنی حاصل کیے۔ آخر میں حضرت شاہ عبدالغنی مجددیؒ سے سلسلۂ نقشبندیہ

---

[1] روایت ہے کہ شیفتہ نے اسی سال حج کیا جس سال منشی کرامت علی شہیدی بھی وہاں گئے تھے۔ اور اسی سفر میں شیفتہ کی موجودگی میں شہیدی کا انتقال مدینہ کے باہر ہوا۔ بلکہ کہا جاتا ہے کہ مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کے سفر میں دونوں ایک ہی محمل میں تھے۔ شہیدی اسہال کے مریض تھے اور بہت کمزور ہو رہے تھے۔ ضعف سے غش پر غش آ رہے تھے۔ جب مدینے کا سواد نظر آنے لگا تو شیفتہ نے ان سے کہا، شہیدی آنکھیں کھولو۔ دیکھو گنبد خضرا سامنے نظر آ رہا ہے۔ شہیدی نے آنکھ کھولی۔ روضہ مبارک پر نظر ڈالی اور طائرِ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر کے روضۂ رسول کے درختوں پر جا بیٹھا۔ ع

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

(صلائے عام دسمبر ۱۹۲۹ء ص ۲۷)

[2] دہلی میں حبشی قبر سے ترکمان دروازے کی طرف جائیں تو میر مہدی کی خانقاہ کے آگے اُلٹے ہاتھ کوچہ میر ہاشم

میں سلوک کی تکمیل کی اور انھیں سے سندِ خلافت لے کر خود صاحبِ اجازت ہوئے۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحب اپنے مریدوں کو تکمیل کے لیے ان کے پاس بھیجا کرتے تھے۔

شیفتہ بھی ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی لپیٹ میں آگئے تھے۔ ہوا یہ کہ چونکہ جہانگیر آباد [illegible]

(صفحۂ گزشتہ) کے آخری سرے پر شاہ غلام علی کی خانقاہ ہے۔ ان کا اصلی نام شاہ عبداللہ تھا، لیکن مشہور شاہ غلام علی کے نام سے ہوئے۔ نسباً سادات علوی میں سے تھے۔ اصلی وطن بٹالہ ضلع گورداسپور (پنجاب) تھا۔ آپ کے والد شاہ عبداللطیف شاہ ناصر الدین قادری کے مرید تھے (جن کا مزار شیدی پورے (دہلی) میں محمد شاہی عیدگاہ کی پشت پر ہے) شاہ غلام علی ۱۱۵۸ھ میں پیدا ہوئے۔ تاریخ ولادت "مظہر جود" ہے۔ ۲۲ برس کے تھے کہ بٹالہ سے دہلی پہنچے اور میرزا جانجاناں مظہر کی بیعت کی۔ اور ان کی وفات کے بعد سجادہ نشین ہوئے۔ تمام عمر قناعت اور توکل سے بسر کی اور قرآن اور حدیث اور فقہ کا درس دیتے رہے۔ خود سندِ حدیث حاجی محمد افضل سے لی تھی۔ جو میرزا مظہر کے بھی حدیث میں استاد تھے۔ فارسی میں شعر بھی کہتے تھے۔ علی تخلص تھا۔ تصوف میں ایک کتاب "سید المرشدین" بھی آپ سے یادگار رہے۔ ۲۲ نومبر ۱۸۲۴ء (۲۲ صفر ۱۲۴۰ھ) بروز شنبہ واصل بحق ہوئے۔ اسی خانقاہ میں اپنے مرشد میرزا مظہر کے پہلو میں دفن ہوئے۔ "نور اللہ مضجعہ" تاریخ وفات ہے۔

آپ کے خلیفہ شاہ ابوسعید مجددی حضرت مجدد الف ثانی سرہندی سے پانچویں پشت میں تھے۔ یہ علم قرأت و تجوید میں یکتائے زمانہ تھے۔ دور دور سے لوگ ان سے قرآن سننے کو آتے تھے۔ حج سے واپسی پر ۳۱ جنوری ۱۸۳۵ء (یکم شوال ۱۲۵۰ھ) کو ٹونک میں وصال ہوا۔ نعش دہلی آئی اور اب شاہ غلام علی کے پہلو میں محو خواب ہیں۔ "نور اللہ مضجعہ" سے تاریخ نکلتی ہے۔ ان کے بعد ان کے سب سے بڑے بیٹے احمد سعید صاحب سجادہ نشین ہوئے۔ "مظہر یزداں" تاریخ ولادت ہے۔ یہ بھی اپنے والد کی طرح کلام اللہ اور حدیث رسول کے عاشق تھے۔ ساری عمر درس تدریس میں گذاری۔ ہجرت کر کے مدینہ منورہ چلے گئے تھے اور وہیں ۱۸ ستمبر ۱۸۶۰ء (۲ ربیع الاول ۱۲۷۷ھ) کو وفات پائی۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے روضے کے قریب دفن ہوئے۔ ان کے بعد ان کے چھوٹے بھائی یعنی شاہ ابوسعید کے دوسرے بیٹے شاہ عبدالغنی صاحب سجادہ نشین ہوئے جو اس بلند مرتبہ خاندان کے لیے بھی باعثِ فخر تھے۔ ۸ جون ۱۸۲۰ء (۲۵ شعبان ۱۲۳۵ھ) کو پیدا ہوئے۔ پندرہ برس کی عمر میں مکہ معظمہ جا کر علم حدیث شیخ محمد عابد سندھی سے حاصل کیا اور واپسی پر شاہ محمد اسحاق سے تکمیل کی سند لے کر خود درس دینے لگے۔ مشہور محدث اور عالم مولانا رشید احمد گنگوہی انھیں کے شاگردوں میں سے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد

تھا۔ بہ احتیاطاً وہاں سے اُٹھ کر اپنے دوست عبداللطیف خاں رئیس خان پور کے یہاں آن مقیم ہوئے۔ ٹھاکروں نے موقع دیکھ کر جہانگیر آباد لوٹ لیا۔ اور ان کے مکانات کو نذرِ آتش کر دیا۔ جس میں دوسرے اثاث البیت کے ساتھ ان کا قیمتی کتب خانہ بھی جل کر خاک سیاہ ہو گیا۔ بارے رام پور کی فوج جو تلنگوں کی گوشمالی کے لیے دہلی جا رہی تھی یہاں سے گذری اور اس کی مدد سے ٹھاکروں کو بے دخل کیا گیا اور جہانگیر آباد پر نواب مصطفیٰ خاں کا دوبارہ قبضہ ہوا۔ ہنگامہ فرد ہونے کے بعد ان پر مقدمہ قائم ہوا کہ تم نے اپنی جاگیر کو یوں غیر محفوظ چھوڑ کر گویا باغیوں کی اعانتِ مجرمانہ کی تھی۔ جاگیر ضبط ہو گئی اور ابتدائی عدالت نے سات برس قید کی سزا دی۔ بارے اپیل میں بری ہو گئے۔

ان کی رہائی کے لیے نواب والا جاہ امیر الملک مولوی صدیق حسن خاں بہادر (بھوپال) نے بعض انگریزی حکام کے توسط سے خاص کوشش کی تھی۔ ان کا مقدمہ مولوی مومن علی خاں سندیلوی صدر الصدور کی عدالت میں تھا۔ نواب والا جاہ نے ان کے نام سفارشی خط لکھا۔ خدا کے فضل سے شیفتہ رہا ہو گئے۔ لیکن جائداد ضبط ہو گئی۔ رہائی کے بعد انھوں نے شکریہ کا خط نواب صدیق حسن خاں بہادر کو لکھا اور کہا کہ نجاتِ صوری تو ہو گئی، لیکن نجاتِ معنوی ابھی باقی ہے یعنی جب تک ذریعۂ معاش پیدا نہ ہو زیست محال ہے۔ اس پر نواب صاحب نے دوسرا خط صدر الصدور موصوف کے نام لکھا تو نصف جائداد بھی واگذاشت ہو گئی۔

مصیبت کس پر نہیں آتی، لیکن بہت کم ہیں جو اس حالت میں بھی اپنی وضعداری اور آن قائم رکھ سکتے ہیں۔ شیفتہ کے بعض واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس میدان میں بھی فردِ فرید کا مقام رکھتے تھے۔ مثلاً ایام ۱۸۵۷ء میں جب قید خانے میں تھے، انھوں نے بہت کوشش کر کے اپنے مہربانِ قدیم ٹرسیل صاحب کو بلا بھیجا جو پہلے بلند شہر میں کلکٹر اور پھر میرٹھ میں

(صفحۂ گزشتہ) ہجرت کر کے مدینہ منورہ چلے گئے جہاں ۱۸۷۹ء (۱۲۹۶ھ) میں انتقال فرمایا اور اپنے بڑے بھائی شاہ احمد سعید کے جوار میں دفن ہوئے۔ "انا للہ وانا الیہ راجعون"۔

(تذکرۂ اہلِ دہلی، ص ۱۱-۲۱؛ واقعاتِ دار الحکومت دہلی (۲)، ص ۱۵۳-۱۵۴)

جج رہے تھے اور اب بھی کسی اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ مدعا یہ تھا کہ صحیح واقعات بتا کے اُن کے ذریعے سے اپنی صفائی کرائیں۔ اتفاق سے وہ صبح کے وقت پہنچے جب شیفتہ نمازِ فجر کے لیے نیت باندھ چکے تھے۔ سورۂ دہر کی تلاوت شروع کی اور باوجود اطلاع کے نیت نہ توڑی۔ ٹریل صاحب انتظار کے بعد واپس چلے گئے۔

اسی طرح کا اور ان ہی ایام کا ایک اور واقعہ ہے۔

ایک دن پاپیادہ بیڑی پہنے سڑک پر جا رہے تھے۔ آسمان کی طرف دیکھ کے فرمایا۔ "تیری شانِ کریمی کے قربان کہ اتنی ہی سزا دی' ورنہ میں تو اس سے بہت زیادہ کا مستحق تھا۔"

شمس العلماء منشی ذکاء اللہ نے ان کے ضبط اور استقلال کا ایک حیرت ناک واقعہ بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ نواب شیفتہ کو مرضِ سرطان لاحق ہو گیا۔ ڈاکٹر نے عمل جراحی تجویز کیا۔ وہ آتا اور ناقص گوشت کاٹتا جس سے قدرتی طور پر سخت تکلیف اور درد ہوتا ہوگا۔ اوپر سے دیکھنے والے تک برداشت نہ کر سکتے' لیکن اُن کے ماتھے پر بل بھی نہ آتا۔ ایک دن بڑے صاحبزادے محمد علی خاں (رشکی) بے اختیار ہو کر رونے لگے تو فرمایا: "میاں! اس جسمِ خاکی کے زوال پر رونا بڑی کم ہمتی ہے۔ انسان کو اپنی مصیبت پر صبر ہونا چاہیے۔"

شیفتہ کے غالب سے بہت گہرے تعلقات تھے۔ غالب کو ان پر ناز تھا اور وہ ان کی رائے کو خاص وقعت کی نظر سے دیکھتے اور اُن کے پایۂ سخن فہمی کے معترف تھے' چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

غالب بفنِ گفتگو نازد بدیں ارزش، کہ اُو — ننوشت در دیواں غزل، تا مصطفیٰ خاں خوش نکرد

ایک دوسری جگہ ان کی مضمون آفرینی اور دقتِ نظر کی یوں داد دیتے ہیں:-

غالب ز حسرتی چہ سرایم، کہ در غزل — چوں اُو تلاشِ معنی و مضمون نکردہ کس

غالب نے اپنے زمانے کے مشہور اور مستند فارسی دانوں کا ذکر اپنی ایک غزل میں کیا ہے اُس میں بھی ان کا نام موجود ہے۔ فرماتے ہیں ؎

ہندرا خوش نفسانند سخنور، کہ بود — باد در خلوتِ شاں مشک فشاں از دمِ شاں

مومن و نیّر و صہبائی و علوی و آنگاہ — حسرتی، اشرف و آزردہ بود اعظمِ شاں

تلامذۂ غالب

غالبِ سوختہ جاں گرچہ نیرزد بہ شمار ہست در بزمِ سخن ہم نفس و ہم دمِ شاں

جب ۱۸۴۷ء میں غالب پر جوا خانہ قائم کرنے کے سلسلے میں ابتلاء آیا اور وہ چھ ماہ کے لیے قید خانے بھیج دیے گئے تو یہ شیفتہ ہی کی ذات تھی جس نے دامے، درمے، قدمے ہر طرح غالب کی خدمت کی۔ حالانکہ اس زمانے میں مرزا کے بعض نہایت عزیز دوست اور رشتہ دار بھی پیٹھ دکھا گئے تھے۔ غالب نے قید کے دوران میں جو تاریخی نظم لکھی ہے اس میں شیفتہ کی ان خدمات کا پُرزور اعتراف کیا ہے۔ لکھتے ہیں ؎

خود چرا خوں خورم از غم کہ بہ غم خواریِ من رحمتِ حق، بہ لباسِ بشر آمد، گوئی

خواجہ ہست دریں شہر، کہ از پرسشِ وے پایۂ خویشتنم، در نظر آمد، گوئی

مصطفیٰ خاں کہ دریں واقعہ غم خوارِ من است

گر بمیرم، چہ غم از مرگ، عزادارِ من است

غالب نے ان کی مدح میں ایک مستقل قصیدہ بھی لکھا تھا۔ جو اُن کے فارسی کلیات میں موجود ہے۔

آزردہ نے ۱۸۵۷ء کے بعد جو مرثیہ دہلیِ مرحوم کا لکھا تھا اور جو فغانِ دہلی میں شامل ہے۔ اس میں ایک بند میں اُن کا ذکر بھی کیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

روز وحشت مجھے صحرا کی طرف لاتی ہے سر ہے اور جوشِ جنوں، سنگ ہے اور چھاتی ہے

ٹکڑے ہوتا ہے جگر، جان پہ بن آتی ہے مصطفیٰ خاں کی ملاقات جو یاد آتی ہے

کیوں کہ آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو

قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

اسی طرح ایک غزل میں بھی جو اسی زمانے میں کہی ہے، یوں لکھتے ہیں ؎

رہے ہم نہ کچھ مصطفیٰ خاں کے غم میں نہ فکرِ سخن، نہ پڑھانے کے قابل

شیفتہ کی تعلیم اور استعداد کا ذکر ہو چکا ہے۔ وہ اردو اور فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے۔ اردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے۔ اردو کلام پر مومن سے اور فارسی پر غالب سے اصلاح لی۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے کا بہت سا کلام اس ہنگامے میں تلف ہو گیا۔

کلیات اُن کے صاحبزادے نواب محمد اسحاق خاں کے اہتمام سے نظامی پریس بدایوں سے ۱۹۱۶ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں اُردو فارسی نظم و نثر سب شامل ہے۔

گارساں دتاسی لکھتا ہے کہ اُنھوں نے ابنِ جوزی کے مولد محدث کا بھی عربی سے اُردو میں ترجمہ کیا، جو لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔ میری نظر سے یہ نہیں گذرا۔

شیفتہ بلند پایہ نقادِ سخن بھی تھے۔ اُردو شاعروں کا مشہور فارسی تذکرہ "گلشنِ بے خار" انھیں کی تصنیف ہے جو ۱۸۳۷ء میں شائع ہوا۔ اس میں مختلف شاعروں کے کلام پر جچی تلی تنقید کی ہے وہ مذاقِ سخن بدل جانے کے باوجود آج بھی اپنی جگہ پر قائم ہے اور جب یہ خیال میں رہے، کہ اس تذکرے کی تالیف کے وقت ان کی عمر تیس سال سے زیادہ نہیں تھی تو اُن کی ژرف نگاہی اور اصابتِ رائے کی داد دینا پڑتی ہے۔ مثلاً نظیر اکبرآبادی کے متعلق لکھتے ہیں :۔

"اشعار بسیار دارد کہ بر زبانِ سوقیین جاری ست و نظر بآں ابیات در اعدادِ شعرا نشاید ش شمرد"۔

اس رائے پر اُن کے زمانے میں بھی کافی لے دے ہوئی تھی اور اب بھی بعض لوگوں کی زبان پر حرفِ شکایت آجاتا ہے، کہ صحیح معنی میں نظیر ہی وہ شاعر ہے جس نے ملک کے عوام کے خیالات کی ترجمانی کی اور شیفتہ کا اسے نظری کر دینا ان کی اپنی کوتاہ نظری کا ثبوت ہے۔ اس سے قطعِ نظر کہ جس ماحول میں شیفتہ نے تربیت پائی تھی اس میں نظیر کی شاعری حد درجہ عامی اور غیر ثقہ شمار ہوتی تھی اور اس لیے وہ اس رائے کے علاوہ جو انھوں نے ظاہر کی کوئی دوسری رائے دے ہی نہیں سکتے تھے۔ میرے خیال میں یہ بہت اچھا ہوا کہ اس زمانے میں لوگوں نے عام طور پر نظیر کو پسند نہ کیا۔ کیونکہ پسند بالعموم تقلید کا پیش خیمہ ہوا کرتی ہے۔ قدما کے زمانے میں اُردو ابھی تکمیل کے مدارج طے کر رہی تھی۔ میر و میرزا اور دوسرے اساتذہ کی کاوشوں کے باوجود زبان ابھی ترقی کے معراج تک نہیں پہنچی تھی۔ اگر اُس ابتدائی زمانے میں لوگ نظیر کے کلام کی پیروی شروع کر دیتے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ اس کی ترقی رک جاتی اور وہ مبتذل ہو کر رہ جاتی۔ وجہ ظاہر ہے، "نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند"۔ سنجیدگی

ے ظرافت اور طنز کو نباہنے کے لیے بہت بڑے سلیقے کی ضرورت ہے، جو بہت کم لوگوں کے حصے میں آتا ہے۔ یہ نظیر ہی تھے جو اس رنگ کو نباہ گئے۔ اگر ان سے کم درجہ کا شاعر ان موضوعات پر قلم اٹھاتا تو یقیناً منہ چڑانے لگتا اور مسخرہ ہو کے رہ جاتا۔ اگر کسی کو اس رائے سے اختلاف ہو تو وہ آج بھی تجربہ کر کے دیکھ لے۔

شیفتہ نے اپنی عمر میں دو نکاح کیے۔ پہلی بیگم سے صرف ایک صاحبزادہ جناب محمد علی خاں رشکی ہوئے جن کا ترجمہ ہم اوپر درج کر چکے ہیں۔ جناب افضل بیگم دوسری بیوی سے دو لڑکے نقش بند خاں اور نواب محمد اسحاق خاں اور دو صاحبزادیاں ہوئیں۔ یہ نقش بند خاں ہی تھے جن کی تعلیم کے لیے حالی مقرر ہوئے تھے۔ یہ شعر بھی کہتے تھے، مجبور تخلص تھا۔ ان کا انتقال پچیس برس کی عمر میں ۵۔ نومبر ۱۸۷۷ء (۲۸ شوال ۱۲۹۴ھ) کو ہوا۔

حالی نے تاریخ کہی "وحلوا اساور من فضۃ" (سورۂ دہر)

شیفتہ نے ۱۸۶۹ء (۱۲۸۶ھ) میں انتقال فرمایا۔ وفات کے وقت ۶۳ برس کی عمر تھی۔ ذیابیطس کا مرض ایک زمانے سے سوہانِ جان تھا۔ "آخری وقت ہاتھ پر ایک کالا دانہ نکلا، جو موت کا بہانہ ہو گیا۔" دہلی میں نواب مصطفیٰ خاں کی دو حویلیاں مشہور رہیں۔ ایک تو جامع مسجد کے جنوب کی طرف چتلی قبر کے قریب ہے۔ اسے "چھپا بیگم کا چھتہ" بھی کہتے ہیں۔ یہاں اب حویلی کا نام بھی نہیں رہا، چھوٹے چھوٹے مکان بن گئے ہیں۔ محلے کا نام البتہ رہ گیا ہے۔ دوسری حویلی کوچہ چیلاں میں ہے۔ جو علی جان والوں کی عمارت کے برابر میں ہے۔ شیفتہ وفات کے وقت اسی کوچہ چیلاں والی حویلی میں مقیم تھے۔ مولانا حالی نے بہ ادنیٰ تغیر قرآن مجید کی ایک آیت "وجزاھم بما صبروا جنات وحریرا" (سورۂ دہر) سے تاریخ وفات نکالی۔ یہی لوح مزار پر کندہ ہے۔ اپنا کفن آبِ زمزم سے دھو کر خود حجاز سے لائے تھے۔ اسی میں کفنائے گئے۔ اور سلطان جی میں اپنی خاندانی ہڑواڑ میں سپردِ خاک ہوئے۔

قطعۂ تاریخ وفات ہے ؎

چو رئیس ابنِ رئیسِ نام دار	کرد رحلت زیں جہانِ بے بقا
سالِ تاریخ وفاتش فی البدیہہ	ملہمِ غیبی بمن کردہ عطا

کز ہر رازے بباید گفت ایں "رحمتِ حق بر محمد مصطفیٰ!"
۱۲۸۶ھ

شیفتہ کے چھوٹے بھائی محمد اکبر خاں بھی شعر کہتے تھے۔ اکبر تخلص تھا۔ اور مومن ہی سے اصلاح لیتے تھے۔

شیفتہ کے کلام سے متعلق کسی رائے کا اظہار کرنا تحصیلِ حاصل ہے وہ یک فنے تھے۔ یعنی غزل کے سوائے اور کوئی صنفِ کلام اُن کے یہاں نہیں ملتی۔ لیکن انھوں نے غزل کو اس طرح نبھایا کہ اس کا حق ادا کر دیا۔ اگرچہ اس زمانے کے عام رنگ سے الگ کچھ زیادہ کلام نہیں، لیکن جہاں اس سے ہٹ کے کہا ہے۔ خوب کہا ہے۔ زبان اور اسلوبِ بیان اور خیالات ہر لحاظ سے شیفتہ کا کلام زندہ رہنے کا حقدار ہے۔ پہلے انتخابِ اُردو ملاحظہ فرمائیے:۔

وہی جو شام کو ہر روز سحر کرتا ہے ایک دن شام ہماری بھی سحر کر دے گا

ناچار ہوں، کہ حکم نہیں کشفِ راز کا کچھ انتہا، مجھ کو نہیں، مے کا، نہ ساز کا

کیا کوئی اور ستم یاد آیا کس لیے لطف کی باتیں ہیں پھر

نہ سُنا تم نے کبھی ہائے فسانہ دل کا دیکھیے ہم بھی، کہ آرام سے سوتے کیوں کر

کھیل، جو لوگ سمجھتے ہیں لگانا دل کا ہم سے پوچھیں، کہ اسی کھیل میں کھوئی ہے عمر

جو کوئی ہو، تمھیں احوال سنانا دل کا شیفتہ! ضبط کرو، ایسی بھی کیا بے تابی!

دل ہوا رنج سے خالی، تو جی بھر آیا نہ دیا، ہائے مجھے لذّتِ آزار نے چین

پر شیفتہ! میں اُس سے خفا ہو نہیں سکتا وہ مجھ سے خفا ہے، تو اُسے یہ بھی ہے زیبا

صبح تک وعدۂ دیدار نے سونے نہ دیا یاس سے آنکھ بھی جھپکی تو توقع سے کھلی

رہا ذکر گل اور ہر باب کا محبت نہ ہرگز جتائی گئی

بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا ہم طالبِ شہرت ہیں، ہمیں ننگ سے کیا کام

کچھ اپنی طرف سے تو تصرف نہیں کرتا سب باتیں انہی کی ہیں یہ، سچ بولیو قاصد!

بے وجہ کوئی شیفتہ! اُف اُف نہیں کرتا کیا حال تمھارا ہے، ہمیں بھی تو بتاؤ!

جس ہاتھ نے کہ جیب کو دامن بنا دیا دامن تک اُن کے ہائے نہ پہنچا کبھی وہ ہاتھ

مشاطہ کا تصور سہی، سب بناؤ میں
اس نے ہی کیا نگاہ کو، پُر فن، بنا دیا!

اظہارِ عشق اس سے نہ کرنا تھا شیفتہ!
یہ کیا کیا، کہ دوست کو دشمن بنا دیا

حسرت سے اس کے کوچہ کو کیوں کر نہ دیکھیے!
اپنا بھی اس چمن میں کبھی آشیانہ تھا

کیا جانے گذری غیر پہ کیا اُس کی بزم میں
آئے وہ اس طرح، کہ مجھے پیار آگیا

یار کو محرومِ تماشا کیا
مرگِ مفاجات نے یہ کیا کیا

عرضِ تمنا سے رہا بے قرار
شب وہ مجھے، میں اُسے چھیڑا کیا

غیر ہی کو چاہے ہیں اب شیفتہ
کچھ تو ہے جو ہم نے ایسا کیا

یاد نے جس کی بھلایا سب کو
اُس کی میں یاد بھلاؤں کیوں کر

آشفتہ زلف، چاک قبا، نیم باز چشم
ہیں صحبتِ شبانہ کے ظاہر نشاں ہنوز

جو بات مے کدے میں ہے اک اک زبان پر
افسوس مدرسے میں ہے بالکل نہاں ہنوز

اے تابِ برق تھوڑی سی تکلیف اور بھی
کچھ رہ گئے ہیں خار وخس آشیاں ہنوز

آمد آمد میں اس قدر شورش
دیکھیے کیا کریں بہار میں ہم

وہ تو سو بار اختیار میں آئے
پر نہیں، اپنے اختیار میں ہم

بچتے ہیں اس قدر جو اُدھر کی ہوا سے ہم
واقف ہیں شیوۂ دلِ شورش ادا سے ہم

کم التفاتیوں کا ہے وہم اہلِ بزم کو
شرمندہ ہوگئے تری شرم وحیا سے ہم

گو ہم سے خفا وہ ہیں، لگے اُن سے خفا ہم
مدت سے اسی طرح نبھی جاتی ہے باہم

طوفانِ نوح لانے سے اے چشم فائدہ
دو اشک بھی بہت ہیں، اگر کچھ اثر کریں

اہلِ زمانہ دیکھتے ہیں عیب ہی کو بس
کیا فائدہ کہ شیفتہ عرضِ ہنر کریں

کہتا ہوں جو غیر سے نہ ملیے
کہتا ہے کہ "کیا میں بے وفا ہوں؟"

شیفتہ! عشق کی یہ دھوم اور اب تک حضرت
دلِ بے تاب نہیں، دیدۂ بے خواب نہیں

الفت چھپا کے اور بھی شرمندہ میں ہوا
اظہارِ عشقِ غیر سے وہ منفعل نہیں

جو حال پوچھنا ہے تم اس سے ہی پوچھ لو
مجھ کو دماغِ قصۂ غم ہائے دل نہیں

دل کا گلہ، فلک کی شکایت، یہاں نہیں
وہ مہرباں نہیں، تو کوئی مہرباں نہیں

ہم آج تک چھپاتے ہیں یاروں سے رازِ عشق حالانکہ دشمنوں سے یہ قصہ نہاں نہیں

رنگیں ہے بے گناہوں کے خوں سے سوادِ شہر حالانکہ واں ہنوز سرِ امتحاں نہیں

لگ جائے شاید آنکھ کوئی دم شبِ فراق ناصح ہی کو لے آؤ، گر افسانہ خواں نہیں

اس نوبہارِ حسن کو بدنام مت کرو تھی شیفتہ کے پہلے ہی شورش دماغ میں

آرام سے ہے کون جہانِ خراب میں گل سینہ چاک اور صبا اضطراب میں

دونوں کا ایک حال ہے، یہ مدعا ہو کاش وہ ہی خط اس نے بھیج دیا کیوں جواب میں

وہ قطرہ ہوں کہ موجۂ دریا میں گم ہوا وہ سایہ ہوں کہ محو ہوا آفتاب میں

قطعِ نظر جو نقش و نگارِ جہاں سے ہو دیکھو وہ آنکھ سے جو نہ دیکھا ہو خواب میں

بے باک شیوہ، شوخ طبیعت، زباں دراز ملزم ہوا ہے، پر نہیں عاجز جواب میں

افسردہ خاطری وہ بلا ہے کہ شیفتہ طاعت میں کچھ مزا ہے نہ لذت گناہ میں

ہے [illegible] کو شکرِ وفائے عدو سے بے تابی کروں میں کچھ گلہ، لطف گر عتاب نہ ہو

حجابِ منظرِ مقصود ہے طلسمِ خودی جو یہ طلسم نہ ٹوٹے تو فتحِ باب نہ ہو

ہر شیوے سے ٹپکے ہے ادا، ناز تو دیکھو ہر بات میں اک بات ہے، انداز تو دیکھو

ہائے وہ شیفتہ کی بے تابی تھام لینا وہ تیرے محمل کو

اتنی نہ بڑھا پاکیِ داماں کی حکایت دامن کو ذرا دیکھ، ذرا بندِ قبا دیکھ

شاید اسی کا نام محبت ہے، شیفتہ! ہے آگ سی جو سینے کے اندر لگی ہوئی

وہ شیفتہ کہ دھوم ہے حضرت کے زہد کی میں کیا کہوں، کہ رات مجھے کس کے گھر ملے

لطف اوروں پہ رہے، ہم کو ستم ہی بس ہے نہ سہی وہ بھی ہمیشہ، کوئی دم بھی بس ہے

دل لگایا تو ناصحوں کو کیا ق بات جو اپنے جی میں آئی، کی

شیفتہ وہ، کہ جس نے ساری عمر دینداری و پارسائی کی

آخرِ کار مے پرست ہوا شان ہے اس کی کبریائی کی

مرنے کا مرے نہ ذکر کرنا! قاصد وہ بہت الم کریں گے

اتنی بھی بری ہے بے قراری اب آپ سے اُنس کم کریں گے

ناشکیبی کی دعا مانگیں گے — صبر کی ہم کو ضرورت ہی سہی

از دحامِ غم و اشک و حرماں — پھر بھی فرصت ہے تو فرصت ہی سہی

میری خاطر سے چلو شیفتہ! واں — خیر، اُن سے تمھیں نفرت ہی سہی

زیاں ہے عشق میں، ہم خود بھی جانتے ہیں مگر — معاملہ ہی کیا ہو، اگر زیاں کے لیے

فسانے اپنی محبت کے سچ ہیں، پر کچھ کچھ — بڑھا بھی دیتے ہیں ہم زیبِ داستاں کے لیے

نہ پوچھو شیفتہ کا حال، صاحب! — یہ حالت ہے کہ اپنے میں نہیں ہے

پھر بلا سے کوئی بیٹھے شیفتہ — اُٹھ گئے جب آپ کوئے یار سے

ناصح! تری زبان، ترے بس میں جب نہ ہو — انصاف کر کہ دل پہ مرا زور کیا چلے

ایسی رغبت سے کرے قتل، گماں کاہے کو تھا — شیفتہ اس کو تو لو، تم سے محبت نکلی

ان کی فارسی دانی اور ذوقِ سخن سے متعلق آپ غالب کی رائے ملاحظہ فرما چکے ہیں، بالکل اہلِ زبان کا رنگ ہے۔ کلام کا نمونہ دیکھیے ؂

تہدید بر ریا کردی شیخ شہر مارا — امروز ساغرے، خوردیم آشکارا

در دہر، جز خرابات، جائے دگر نیابی — آنجا کہ خندہ آید، بر پادشاہ گدا را

نادیدہ نہ بندی، نتوانی کہ بہ بینی — آں جلوہ کہ مشہود شود اہلِ نظر را

نہ بیم محتسب، نے خوفِ قاضی، نے غمِ فردا — نمی دانم، کہ از مے چیست لذت گبر و ترسا را

بکنجے کھنچ دم، صاحب دلے می گفت بازاری — بعصیاں ہائے پنہاں بخش طاعت ہائے رسوا را

خندہ چہ خوش شیوہ ایست، از پسِ خشم و عتاب — لذتِ دیگر بود، زخمِ نمک سود را

رازِ نہفتہ گفتم، اگر ساقیا! مرنج — می گفتمت کہ بادہ بدہ ایں قدر مرا

رحم ست بر کسے کہ دراں کوئے می رود — در دست نامۂ من و بر لب سلامِ ما

سحر بہ مہرِ دل افروز کردہ ام امشب — ہزار عشرت نوروز کردہ ام امشب

از پئے صیدِ تو، صد دام بہر جائے ہست — جرمِ من چیست، مرا نیز تمنائے ہست

خار را خوار نگیری، کہ گلش در جیب ست — قطرہ را سہل مپندار، کہ دریائے ہست

نیست کایں مژدہ برد معتقدانِ او را! — خلوت و حسرتی و شاہدِ رعنائے ہست.

بے تابم و یار را خبر نیست
می نالم و نالہ را اثر نیست

در انجمنت بسر رسیدم
در عشق تمیزِ پا و سر نیست

ماییم و فغاں، کہ در محبت
دستورِ ترانۂ دگر نیست

چشم بد دور، از جمالش
می بینیم و طاقتِ نظر نیست

پردہ داری چو نہ شد بت کدہ بدنام افتاد
ورنہ پوشیدہ بصد جا بُتِ دُزدیدہ ہست

یار را دل ربودنم ہوس ست
برق اندر کمینِ شبت خس ست

شیوۂ چند، لازمِ رندی ست
زاں یکے ارتباط با عسس ست

نگہے، غمزۂ، شکر خندے
اندکے التفات از تو بس ست

زباں، زبانہ فشان و نفس، شرر ریز ست
مرا گناہ نباشد، مے مغاں تیز ست

غم و سرور نباشد بیک دل اندر جمع
برنجِ عشقِ تو نازم کہ راحت انگیز ست

گر بمسجد رفتدم، رغبتِ طاعت در دل
مسجدے ہم بسرِ کوے مغاں می بایست

آنانکہ در سکوت، دل از کف ربودہ اند
آیا چہا کنند، اگر گفتگو کنند

نازم اندازِ بتاں را، کہ دل و صبر و شکیب
ہمہ بردند عیاں و بہ نہانم دادند

چوں بہ پیری کنم، اے شیخ! از رندی توبہ
کارسازانِ قضا، بختِ جوانم دادند

شب کہ در بزمِ تو، جز غیر کسے بار نداشت
آتش از شمع گرفتند و بجانم دادند

حسرتی! از اثرِ نشۂ توفیق مپرس
درِ میخانہ زدم، کعبہ نشانم دادند

گفتمش، عشقِ توام حوصلہ می فرساید
گفت، عشق ست، چرا حوصلہ فرسا نبود

حسرتی، سیر ز جاں گشتہ، خبر باید داشت
کہ مبادا بہ درِ آں ستم ایجاد رسد

تو مپندار، کہ ایں کم نگہی عشوہ گری ست
حسرتی! سادہ رخاں شرم و حیا نیز کنند

شہیدِ جلوۂ نازِ تو جاں شکار انند
اسیرِ حلقۂ دامِ تو دم شکار انند

چہ بودۂ تو، کہ آزادگاں بہ بندِ تو اند
تو کیستی، کہ گدائے تو شہریار انند

خرابِ حوصلۂ آں قرابہ نوشانم
کہ خم بیادہ کشیدند و ہوشیار انند

بگوش و نامۂ خود را سپید کن، زاہد!
ترا ازاں چہ، کہ رنداں سیاہ کار انند

جانم بلب رسیدہ و چشم براہ تست — دارم ز عمر رفتہ، امید وفا ہنوز
عمر کوتاہ دادہ اند مرا — گو شبِ غم بود دراز، چہ باک

براں سرم کہ زہر نیک و بد کنارہ کنم — خورم شراب و رخ نیکواں نظارہ کنم

نہ چوں عشق سازگارم، بہ مزاج دردمنداں — نہ چو حسن اعتبارم، بہ نگاہِ خود پسنداں
برخ چو آفتابت، نگہِ قمر عذاراں — بکمندِ عنبرینت، سرِ عنبریں کمنداں
شبِ وصل غیر رفتم، پے اکتسابِ نفرت — چو ہجومِ عیش دیدم، شدہ شوقِ من دو چنداں
زچہ حسرتی! ننالم، زجفائے طالعِ بد — بمذاقِ یار تلخم، چو فغانِ دردمنداں

دل دادہ نہ، دردِ دلِ زار چہ دانی — در دام نہ، حالِ گرفتار چہ دانی
اے چشم چہ دیدی، از نگاہش — بے وعدہ در انتظار چونی

رباعی

من تشنہ و سیراب زصہبائے خودم — من کعبۂ خویشتم و کلیسائے خودم
با غیر خودم ہیچ سروکارے نیست — من عاشق و معشوقِ خود آرائے خودم
چندے بحریمِ شہریاراں رفتم — چندے بدرِ زہد شعاراں رفتم
دیدم ہمہ لہو و سہو دکبر و طامات — ناچار بکوئے مے گساراں رفتم

[دیباچہ کلیات شیفتہ؛ صبح گلشن، ص ۱۲۱-۱۲۲؛
شمع انجمن، ص ۱۳۴-۱۳۶؛ خمخانۂ جاوید (۵)،
ص ۱۵۵-۱۶۲؛ نقوش، جون ۱۹۵۶ء ص ۱۷۲؛
معارف، ستمبر ۱۹۵۴ء ص ۱۸۸-۲۱۲]

صاحب — نواب سید شیر زماں خاں دہلوی

مشہور استاد "حافظ جیو" عبدالرحمٰن خاں احسان کے پوتے تھے۔ شر دعا میں چندے

اصلاح بھی اُن ہی سے لی۔ بعد میں ذوق سے مشورہ کیا۔ ان کی وفات کے بعد غالب سے رجوع کیا۔ ۷۰ برس کی عمر تھی، جب ۱۲۱۲ھ میں حیدر آباد میں انتقال کیا۔

کس کس کو میں بتاؤں، کہ بارِ غمِ فراق ———— دل پر نہیں، جگر پر نہیں، جان پر نہیں

ذرا آنکھوں میں اس کو رکھنا صاحب ———— کہیں یہ طفلِ اشک ابتر نہ ہووے

عُقدہ جو تیرے جَعد کا رشکِ قمر کھلے ———— عشاق کے دلوں کی گرہ، سربسر کھلے

جان ان کی آسمان کو پرواز کر گئی ———— لیکن کبھی نہ تیرے اسیروں کے پر کھلے

[گلستانِ سخن، ص ۳۲۵؛ بزمِ سخن، ص ۷۳؛

خم خانۂ جاوید (۵) ص ۲۳۹؛]

صاحب ———— محمد حسین بریلوی

یہ نومسلم تھے۔ ان کے والد کا نام بہادر سنگھ تھا۔ فارسی اور ریاضی میں بھی اچھی مہارت تھی۔ اُردو کے علاوہ فارسی میں بھی کہتے تھے۔ ۱۲۰۷ھ میں انتقال ہوا۔

بوسۂ مژگان و ابرو کا چکھا تا بے مزہ ———— لب سے زخمِ دل کا مل جانا تری تلوار کا

قیس کی جو دشت بالکل صاف تم نے لے لیا ———— بستیوں پر چل کے اب دعویٰ کرد کہسار کا

اسیرِ پنجۂ خورشید، ماہ را دیدم ———— گرفت دستِ نگاریں چو جامِ مینا را

[یادگارِ ضیغم (قلمی)]

صادق ———— مولوی محمد عزیز الدین بدایونی ثم دہلوی

مولوی محمد اساس الدین فرشوری بنیرہ حافظ ابو المؤید خاں کے بیٹے تھے۔ اگرچہ

بدایوں میں پیدا ہوئے، مگر دہلی کو وطن ثانی بنا لیا تھا۔ بہت عالم و فاضل شخص تھے۔ چندے بیلی بھیت میں منصف رہے۔ پہلے عزیزؔ تخلص کرتے تھے؛ بعد میں بدل کے صادقؔ کر لیا۔ ۲۵ نومبر ۱۸۹۳ء (۱۶۔ جمادی الاول ۱۳۱۱ھ) کو انتقال کیا۔ ان کے چھوٹے بھائی بھی شعر کہتے تھے۔ نام محمد سعید الدین اور سعیدؔ تخلص تھا۔ پہلے کچھ مدت کاملؔ تخلص بھی کیا۔ مرزا زین العابدین خاں عارفؔ کے شاگرد تھے۔ ۱۱۔ دسمبر ۱۸۹۸ء کو فوت ہوئے۔

ابوالحسن اُن کے بیٹے سر سید کے سیکریٹری تھے۔ بعد میں وہ حیدر آباد میں جج بھی رہے تھے۔ صادقؔ کے ایک دوسرے بیٹے محمد وہاب الدین کا تخلص طالبؔ تھا۔ وہ علی گڈھ کالج کے تعلیم یافتہ تھے اور اپنے والد سے اصلاح لیتے تھے۔

گذر کیوں کر ہو ایسے آستاں تک — تصور بھی نہیں جاتا جہاں تک
یہی گر آہ و نالہ ہے، تو صادقؔ — رہے گا دم نہ تاثیرِ فغاں تک

قاتل جو اپنا ہے، وہی اب سوگوار ہے — اس موت پر حیات فدا، جاں نثار ہے
ہماری آتشِ شوق اور بھڑکی — چلے جب وقت وہ دامن اُٹھا کے
سارے اندازِ ستم، ختم نہ کر تو مجھ پر — کچھ تو دشمن کے لیے طرزِ جفا رہنے دے
ہے یہ تنہائی میں مجھ سوختہ جاں کی غم خوار — شمع مرقد کو مری، بادِ صبا رہنے دے
لے گئی دل اک نظر میں اس کی چشمِ نیم خواب — مست ہم سمجھے تھے اس کو پر بہت ہشیار ہے

[تجلیاتِ سخن (نظامی)، ص ۳۲۔ ۳۴؛ ۳۶؛
یادگارِ ضیغم، ص ۲۲، ۲۳؛ بخن شعرا، ص ۲۱۷، ۲۷۰؛
خم خانۂ جاوید (۵) ص ۲۵۰۔ ۲۵۱؛ ایضاً ص ۲۹۸؛]

صفیر ——— سید فرزند احمد بلگرامی

ان کے والد سید عبدالحی عرف میر سید احمد، احمد تخلص حسینی واسطی سید تھے۔ بزرگوں کا

وطن شروع میں ضلع ہردوئی کا مشہور مردم خیز قصبہ بلگرام رہا۔ بعد میں یہ خاندان کوا تھ میں منتقل ہوگیا جو آرہ (ضلع شاہ آباد۔ بہار) کے قریب سادات کی مشہور بستی ہے۔

صفیر ۹۔ اپریل ۱۸۳۴ء (۲۸۔ ذی قعدہ ۱۲۴۹ھ) کو اپنی ننھیال مارہرہ (ضلع ایٹہ) میں پیدا ہوئے۔ "شمس الضحیٰ" سے تاریخ ولادت نکلتی ہے۔ پانچ برس کی عمر تھی جب یہ اپنے والد کے ہمراہ آرہ آئے۔ اور اس کے بعد ساری عمر یہیں گذار دی۔

صفیر نے شاعری گویا ورثے میں پائی۔ دادھیال اور ننھیال دونوں طرف کے اجداد پشتوں سے شاعر تھے۔ صفیر کا ابھی کوئی ۱۴ برس کا سن تھا کہ شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ اور اپنے پھوپھا سید محمد مہدی خبر سے اصلاح لینے لگے۔ یہ سلسلہ چھ برس تک جاری رہا پھر لکھنؤ جاکر شیخ امان علی سحر کے شاگرد ہوئے۔ پانچ برس بعد غدر کے زمانے میں مرثیہ گوئی کی طرف متوجہ ہوئے تو مرزا دبیر سے مشورہ کرنے لگے اور ایک مدت تک ان کے ساتھ بیٹھ کر مشق سخن کی۔ پے در پے سات تخلص اختیار کیے۔ قلب، آثم، نسیم صبا، نالاں، احقر، اور صفیر۔ آخر میں صفیر ہی سے زیادہ مشہور ہوئے۔

مرزا غالب کے مکتوب الیہم میں مارہرہ شریف کے سجادہ نشین حضرت صاحب عالم بھی ہیں۔ یہی صاحب عالم، صفیر کے نانا تھے۔ ۱۲۸۰ھ (۱۸۶۳ء) میں صفیر نے غالباً اپنے نانا جان کے ایماء پر اپنی فارسی اور اردو غزلیں اصلاح کے لیے غالب کی خدمت میں بھیجیں۔ دو سال بعد مئی ۱۸۶۵ء میں اپنے ماموں جناب شاہ عالم شائق کے ساتھ دہلی پہنچ کر غالب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور بہت دن تک ان کے پاس رہ کر استفادہ کیا۔ غالب کی وفات کے بعد چندے غلام حسنین قدر بلگرامی سے بھی مشورہ کرتے رہے۔

صفیر کی زبان میں لکنت تھی۔ جس سے بزم مشاعرہ میں پڑھنے سے انھیں بہت تکلیف ہوتی تھی۔ بعض اوقات پڑھتے پڑھتے سانس بھول جاتی اور لیٹ جانا پڑتا تھا۔ اس لیے بالعموم ان کے پیچھے گاؤ تکیہ لگا دیا جاتا تھا۔ تاکہ اس کے سہارے آرام سے بیٹھ سکیں۔

بروز دوشنبہ ۱۱۔ مئی ۱۸۹۰ء (۲۱۔ رمضان ۱۳۰۷ھ) کی دوپہر کو پٹنہ میں

انتقال کیا اور آرہ میں مدفون ہوئے۔ "شہر رمضان المبارک" تاریخ وفات ہے۔ ان کے صاحبزادے سید نور احمد بھی شعر کہتے تھے۔ گرامی تخلص تھا اور اپنے والد ہی سے مشورہ کرتے تھے۔

صفیر نظم و نثر پر یکساں حاوی تھے اور اس میں شک نہیں کہ بدرجہ غایت قادر الکلام تھے۔ متعدد مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصنیفات ان کی یادگار ہیں۔ ان کا تذکرہ جلوۂ خضر اور دس جلدوں میں بوستانِ خیال کا اردو ترجمہ بہت مشہور ہیں۔ اردو کے آٹھ دیوان تھے جن میں سے دو صفیر بلبل ۱۲۸۰ھ اور خم خانۂ صفیر ۱۲۹۸ھ ان کی زندگی میں چھپ گئے تھے۔ تین دیوان فارسی کے تھے، چار فارسی کی مثنویاں اور چھبیس اردو کی۔ قصائد، رباعیات، قطعات اور واسوختوں کے مجموعے ان کے علاوہ۔ کلام بہت پختہ ہے۔ زبان پر قدرت ہر ایک شعر سے ہویدا ہے۔

رازِ خلوت کا بیاں، کس نے کیا، کیا جانیں — ایک میں، ایک ہو تم، بس کوئی آیا نہ گیا
بادۂ عشرت ہوش رُبا تھا، رات جو میں نے جام لیا — ہائے یہ جرأت ساقی نے کی، دوڑ کے مجھ کو تھام لیا
قتل کیا تو خجلت کیسی، چھپ سکتا تھا خون کہیں — جس نے سنا احوال ہمارا، اس نے تمھارا نام لیا
دیکھنے مجھ کو آجاتے، تو بات تو ہوتی کہنے کو — عمر تو آخر ہو ہی چکی تھی، تم نے عبث الزام لیا
میں، اور تمھیں، خلق میں بدنام کروں حیف! — یوں تم پہ کھلے میری زباں، ہو نہیں سکتا

اے صفیر! اس سوزِ غم سے کون عاشق بچ سکے
جل بجھا کل رات، دیکھی تم نے، پروانے کی بات

بھلا تم تو بھلے ہو، میں برا ہوں — محبت جھوٹ، میرا چاہنا جھوٹ
نالوں میں دل نہیں ہے، بھلا آپ کس لیے — تسکین دیتے ہیں مجھے، سمجھائے جاتے ہیں
کیا یاد آگیا انھیں صبح شب وصال — منہ میرا دیکھ دیکھ کے شرمائے جاتے ہیں
تعزیر میں مری، نہ کمی کر ستم ایجاد — وہ آج ہی ہو جائے جو کچھ روزِ جزا ہو
لائے وہ میرے گھر، تو رقیبوں کو لے کے ساتھ — یا رب، قبول یوں بھی کسی کی دعا نہ ہو
بہار میں گل و بلبل سے کیا ہے سرگوشی — یہ کانوں کان کسی کو خبر نہیں ہوتی

کل جو اُٹھتے تھے بٹھانے کے لیے　　　آج بیٹھے ہیں، اُٹھانے کے لیے

[جلوۂ خضر (۱) ص ۲۱۹ - ۲۲۱؛ ایضاً (۲)
ص ۲۱۲ - ۲۲۶؛ تاریخ شعرائے بہار، ص
۱۲۶ - ۱۳۱؛ بہار اور اُردو شاعری، ص ۱۱۵ - ۱۲۰؛
خم خانۂ جاوید (۵)، ص ۳۳۹ - ۳۴۱؛ آبِ بقا
ص ۷۶ - ۷۹؛ یادگارِ ضیغم، ص ۳۰۱؛ ماہ نامہ
آج کل، فروری ۱۹۵۶ء، ص ۲۷ - ۳۳؛
ایضاً، فروری ۱۹۵۷ء، ص ۲۱؛]

صوفیؔ ــــــ سید ابو محمد خلیل الدین حسین عرف شاہ فرزند علی منیری

یہ خاندان اصل میں ضلع پٹنہ کے موضع شرف آباد پارتھو کا رہنے والا تھا لیکن صوفیؔ ۶ جنوری ۱۸۳۸ء (۹۔ شوال ۱۲۵۳ھ) کو منیر شریف (ضلع پٹنہ) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام سید شاہ محمد علی تھا۔ منیر حضرت مخدوم یحییٰ منیری کے مزار کی وجہ سے اہلِ دل میں دور و نزدیک مشہور ہے۔ شاہ فرزند علی کا سلسلۂ نسب، ددھیال کی طرف سے حضرت سید علیم الدین گیسو دراز دانشمند نیشاپوری (دیباجی الحسینی) سے اور ننھیال کی طرف سے مخدوم شاہ خلیل الدین برادر مخدوم الملک شاہ شرف الدین بہاری (خلف الرشید حضرت مخدوم یحییٰ منیری) کے واسطے سے حضرت امام محمد تاج فقیہ فاتح منیر تک پہنچتا ہے۔

صوفیؔ نے ۲۵۔ فروری ۱۹۰۱ء (۶۔ ذی قعدہ ۱۳۱۸ھ) کو اسلام پور (ضلع پٹنہ) میں انتقال فرمایا اور وہیں دفن ہوئے۔ انھوں نے اپنی عمر میں دو نکاح کیے۔ پہلی بیوی سے تین صاحبزادے، سید شاہ محمد عبدالقادر صاحب سجادہ نشین خانقاہ اسلام پور، حکیم حاجی شاہ محمد عمر صاحب عامرؔ اور شاہ سید علی صاحب کاملؔ اور دو صاحبزادیاں

ہوئیں۔ دوسری بیوی سے جناب شاہ اسد اللہ صاحب منیری تھے۔ ان کی اولادِ امجاد اسلام پور اور منیر شریف میں موجود ہے۔

صوفی کا خط بہت پاکیزہ اور خوبصورت تھا۔ اُن کے قلمی نسخے ان کے خاندان میں موجود ہیں۔ فارسی میں بہت اعلیٰ استعداد تھی۔ عربی بھی اچھی جانتے تھے۔ تاریخ گوئی میں یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ نظم و نثر میں متعدد اُردو فارسی تصانیف یادگار چھوڑیں جن میں سے مخدوم الملک شاہ شرف الدین کی سوانح عمری وسیلۃ الشرف مشہور تالیف ہے۔ راحتِ روح اُردو نثر میں تصوف سے متعلق ہے۔ اردو فارسی کے دیوانوں کے علاوہ تین اُردو مثنویاں روشِ عشق، کششِ عشق اور لواء الحمد ہیں۔ لواء الحمد جس میں حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ ہے مدت ہوئی چھپی تھی۔ دوسری دونوں ۱۹۵۰ء میں رسالہ اُردو میں شائع ہوئیں۔

لواء الحمد میں لکھتے ہیں ؎

فخرِ عالم، گہرِ تاجِ رسل ۔۔۔ خواجۂ کون و مکاں، مرجعِ کل

قرۃ باصرۂ عینِ حضور ۔۔۔ اولیں موجۂ دریائے ظہور

نورِ حق، جلوۂ ربِ شانِ الہٰ ۔۔۔ ہے تو بندہ، مگر اللہ اللہ

آخری شعر پر غالب نے دو صاد بنائے اور اُسے بہت پسند کیا۔

استاد کی مدح میں اُن کے مخالفوں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں ؎

ہیں شعر کے معرکے میں صفدر غالب ۔۔۔ ہاتھ اُن کے ہے کھیت، یہی سب پر غالب

اس نام کا پاس ہے خدا کو، صوفی ۔۔۔ پھر ہوں اسد اللہ نہ کیوں کر غالب

سب تیغِ زباں سے اُنھیں پہچانتے ہیں ۔۔۔ غالب ہیں وہ سب اہلِ سخن جانتے ہیں

یہ شیرِ خدا کے نام کی ہے برکت ۔۔۔ لوہا اسد اللہ کا سب مانتے ہیں

کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو :-

قدم بوسی تری کرتا، زمینِ آستاں ہو کر ۔۔۔ خجل ہے آسماں قسمت سے اپنی آسماں ہو کر

اٹک کر رہ گئے زہاد، ہم مے پی کے چل نکلے ۔۔۔ گئی ہے راہ کوئے یار کی باغِ جناں ہو کر

گر حبِ خواہ گردشِ ایام چاہیے ۔۔۔ تو دورِ جامِ مے بسحر و شام چاہیے

تقویٰ کی رُت بدل گئی رندی کے دن پھرے
شیشہ بغل میں، ہاتھ میں اب جام چاہیے

کل ہم کریں گے عرض، کہ رحمت کی نذر کو
ہدیہ گناہ لائے ہیں انعام چاہیے

لاکھوں دنیا میں ہوں، زہد اور عبادت والے
کہیں دو چار ہی نکلیں گے محبت والے

باتیں اچھی ہیں، بُرائی ہے تو بس اتنی ہے
نیک اپنے کو سمجھتے ہیں نصیحت والے

جلوے کو تیرے، حشر کا کیوں انتظار ہے
جلوہ ترا ہے حشر کا ساماں کہیں جسے

خوش ہوں جنوں سے ہیں اگر کرتے ہیں التفات
ہے صبحِ عید، چاکِ گریباں کہیں جسے

صوفی بتائے منزلِ جاناں کی راہ کون!
اب چپ ہے وہ جرس، دلِ نالاں کہیں جسے

فارسی کی ایک غزل کے چند شعر ہیں ؎

در سینہ، دلِ تپاں نہ گنجد
رازم بہ دردل، از آں نہ گنجد

از قیدِ وجود، ہر کہ وارست!
در دائرہ جہاں نہ گنجد

ساقی! قدحے، کہ عُجب و پندار
در خاطرِ سرکشاں نہ گنجد

عشق آمد و حکمِ عقل برخاست
بیک ملک، دو حکمراں نہ گنجد

شورے، کہ مراست در سر از عشق
در گنبدِ آسمان نہ گنجد

[معارف (اعظم گڑھ) جون ۱۹۳۲ء؛ ہندستانی: ۱۹۳۵ء، ص ۲۳، ۳۳؛ تاریخ شعرائے بہار، ص ۱۳۱، ۱۳۳؛ اُردو (کراچی) جولائی۔ اکتوبر ۱۹۵۰ء]

صوفی ــــــ حکیم محمد علی نجیب آبادی

ریاست جے پور سے ملازمت کا تعلق تھا ؎

بیٹھے یوں غیر تری مسندِ کم خواب کو داب
بارِ غم کیوں کر نہ ہوئے سرِ احباب کو داب

طالبؔ ــــــ سردار محمد خاں

افسوس کہ نہ حالات معلوم ہو سکے، نہ کلام ہی دستیاب ہوا۔ صرف اتنا پتہ چلا کہ اُردو کے مشہور ڈرامانویس پنڈت نارائن پرشاد بیتابؔ اِن ہی کے شاگرد تھے۔

[خم خانۂ جاوید (۱)، ص ۱۴۲]

طالبؔ ــــــ میرزا سعید الدین احمد خاں عرف نواب احمد سعید خاں دہلوی

نواب ضیاء الدین احمد خاں نیرؔ درخشاں کے دوسرے بیٹے اور میرزا شہاب الدین احمد خاں ثاقبؔ کے چھوٹے بھائی تھے۔ ۱۸۵۲ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم و تربیت اپنے والدِ نامدار کی نگرانی میں ہوئی۔ ۱۸۷۵ء میں لفٹنٹ گورنر پنجاب سر رابرٹ ایجرٹن کی مردم شناس نگاہ نے اِن کا انتخاب کیا۔ اور یہ اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر (E A C) مقرر ہو گئے۔ آٹھ دس برس تک نیک نامی سے اپنے فرائضِ منصبی کو انجام دیا۔ جب ۱۸۸۵ء میں اِن کے والدِ بزرگوار، نواب ضیاء الدین احمد خاں کا انتقال ہو گیا تو یہ اپنے عہدے سے مستعفی ہو کر دہلی میں قیام پذیر ہو گئے۔ اس دوران میں دہلی میونسپل کمیٹی کے ممبر نامزد ہو گئے تھے۔

نہایت خوش رُو اور جامہ زیب شخص تھے۔ گھوڑے کی سواری کا بہت شوق تھا۔ عام طور پر کاٹھیا واڑ اور بالوترے کی نسل کے گھوڑے اپنی سواری میں رکھتے تھے۔ اتنے ماہر شہ سوار تھے کہ سرِ بازار گھوڑے کو الف کر کے اُسے پچھلی ٹانگوں سے چلانے لگتے۔ جب سوار ہو کر چاوڑی بازار سے نکلتے تو لوگ باگ تماشا دیکھنے کو کوٹھوں پر نکل آتے تھے۔ مہذب، متین، وضع کے پابند، مرنجاں الاخلاق اور منکسر مزاج تھے۔ خوش دل اور بذلہ سنج ایسے کہ جس مجلس میں پہنچ جاتے وہ زعفران زار بن جاتی۔ شعر بھی نہایت دل آویز انداز سے پڑھتے تھے۔

آخری عمر میں پاؤں میں ورم آجانے کے باعث زیادہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے
تھے۔ بروز یک شنبہ، یکم ستمبر ۱۹۲۵ء (۳- ذی الحجہ ۱۳۴۷ھ) کو انتقال فرمایا، اور درگاہ
قطب صاحب میں نواب علاؤالدین احمد خاں کی ہڑواڑے میں اپنے والد کے پہلو میں دفن
ہوئے۔ ان کا نکاح اپریل ۱۸۷۳ء میں بادشاہ بیگم دختر آغا سید احمد شاہ نواب سمرد
سے ہوا تھا۔ لاولد فوت ہوئے۔

نو مشقی کے ابتدائی زمانے میں غالب سے اصلاح لی۔ اُن کی وفات کے بعد چند
دن اپنے بڑے بھائی ثاقب اور مولانا حالی سے مشورہ کرتے رہے اور آخرکار اپنے والد
کے کہنے پر، میر مہدی مجروح کو کلام دکھانے لگے۔ اگرچہ کبھی کبھی اپنے خاندانی ورثے کے زیر اثر
فارسی کی ترکیبیں بھی لکھ جاتے ہیں، لیکن بالعموم دلی کی صاف ستھری زبان، محاورہ، روزمرہ
اور بلاغت اُن کے کلام کے امتیازی نشان ہیں۔ افسوس کہ دیوان شائع نہ ہوا۔ اس کا
قلمی نسخہ لوہارو ریاست کے کتب خانے میں تھا اور یہ اب کتب خانہ رضائیہ رام پور میں ہے۔ چند شعر درج ذیل

بہار آئی، یہ سن کر یوں ہوئی محوِ طرب بلبل — کہ ہر کنجِ قفس، اس کی نظر میں اک گلستاں تھا
اُس سے ستم کی وجہ کوئی پوچھتا نہیں — پرساں ہے اک زمانہ، ہمارے ہی حال کا
طالب کی لو خبر، کہ وہ بیمارِ ناتواں — دنیا میں کوئی دم کے لیے میہماں ہے اب
محتسب نے خوب پی، پیرِ مغاں کے ہاتھ سے — راہ پر آیا، جو پہنچا مرشدِ کامل کے پاس
ساقیا! ہے بزمِ آخر، دور بھی ہے آخریں — دیکھنا، محروم رہ جائیں نہ اک ساغر سے ہم
اُس کے در سے اُٹھے اُٹھائے ہوئے — ناتوانی ذرا سنبھال ہمیں
اُٹھایا جو رخ سے بزم میں، اُس نے نقاب کو — شوخی نے کچھ بڑھا دیا لطفِ حجاب کو
اپنے بیگانے ہوئے، سب لطفِ ساقی دیکھ کر — پھر گیا ہم سے زمانہ، گردشِ ساغر کے سا
گزر چل گیا وار، تیرِ نگاہ کا — خلش دل میں ہے اور پیکاں نہیں۔
ترے ساتھ تھے، دل کے ارمان سارے — نہیں جب سے تو، کوئی ارماں نہیں۔
نہیں اس میں گنجائشِ کینِ دشمن — وہ دل جس میں تیری محبت بھری ہے
نہیں فکر کچھ، ہم جو بیٹھے ہیں، خالی — صراحی تو مے کی لبالب بھری ہے

یہاں تو وہی کی وہی سوجھتی ہے — زمانے کو کیوں کر نئی سوجھتی ہے

قیامت کے وعدوں پہ تم جی رہے ہو — تمھیں زاہدو! دور کی سوجھتی ہے

یہاں حال پر ہے ہنسی اپنے آتی — وہ سمجھے کہ اس کو خوشی سوجھتی ہے

ہیں دل فریب نقش و نگارِ جہاں، ولے — کیا اس کا اعتبار ہے، جو مستعار ہے

[خم خانۂ جاوید (۵)، ص ۴۱۱ - ۴۱۸؛

"پچاس برس پہلے کی دلی"۔ ساقی جنوری ۱۹۴۶ء]

طالب ——— سید شبیر محمد خاں دہلوی

غالب کے علاوہ حافظ عبدالرحمٰن احسان سے بھی اصلاح لی۔

لون ہے بسملِ شمشیرِ نظر اپنا سا — یا نڈھال اپنا سا، یا سینہ سپر اپنا سا

اُس چشمِ سرمگیں سے ملائی نہ آنکھ تھی — لڑنا پڑا ہے اب تو خدایا! قضا کے ساتھ

طالب یہاں جو کرنا نہ تھا، وہ بھی کر چکے — اب دیکھیے بنے گی وہاں کیا، خدا کے ساتھ

کیا اپنی روشنی پہ شگفتہ ہے، قرصِ ماہ — طالب! جو تیرے ساتھ وہ رشکِ قمر نہیں

اٹھ سے تمہاری بزم میں جایا نہ جائے گا — جب تک رقیب واں سے اٹھایا نہ جائے گا

[طبقات الشعرائے ہند، ص ۴۱۸ - ۴۱۹؛ گلستانِ

بے خزاں ص ۱۵۱؛ خم خانۂ جاوید (۵) ۴۰۲ - ۴۰۳،

۴۱۰ - ۴۱۱]

طالب ——— خان بہادر ڈاکٹر محمد حفیظ اللہ اکبر آبادی

شاہی زمانے میں ان کے آبا و اجداد اسلحہ سازی میں مہارت رکھتے تھے۔ اور یہ

ایک طرح خاندانی پیشہ ہو گیا تھا۔ طالب نے عربی تعلیم اپنے طور پر کی۔ اپنے استاد بھائی محمد اقبال حسین عاشق کے دیوان "افکارِ عاشق" (شاملِ دیوان) کی جو تقریظ لکھی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو اور فارسی دونوں میں لکھتے تھے۔ اردو نثر میں بھی اچھی مہارت تھی۔

جو بھلا کرتا ہے، اس کا بھی بھلا ہوتا ہے — اس کے کوچے میں یہی ہم نے صدا رکھی ہے
لے چلا پھر خیالِ یار مجھے — سوئے صحرا دکو ہسار مجھے
پھر جنونِ شباب کا ہے جوش — مے الفت کا ہے خمار مجھے

[شاعر (آگرہ نمبر) ص ۸۹]

طالب ـــــ مولوی محمد ریاض الدین

یہ دو شعر خم خانۂ جاوید میں اُن کے نام سے لکھے ہیں۔

کیا اور وصف زاہدِ میکش کا کیجیے — بد عہد اس قدر ہے کہ توبہ شکن ہوا
طالب! ایسِ فنا نہ ہوا کوئی پردہ پوش — میرا لباسِ عمر ہی آخر کفن ہوا

[خم خانۂ جاوید (۵) ص ۲۱۱]

طرار ـــــ مرزا سرفراز حسین دہلوی

صرف اتنا معلوم ہوا، کہ پنڈت جگموہن ناتھ شوق فدا ان کے شاگرد تھے۔

[بہارِ گلشنِ کشمیر (۲) ص ۶۱]

طرزی ــــــ مولانا سید قطب الدین دلاور علی جعفری ہاپوڑی

دلاور علی نام اور قطب الدین لقب تھا۔ یہ بیٹے تھے سید امداد علی بن اللہ بخش بن سید ادریس بن سید محمد مرید بن سید عبد الکریم کے۔ اسی طرح سلسلۂ نسب حضرت امام جعفر صادق تک پہنچتا ہے۔ اس خاندان میں سب سے پہلے سید عبد الکریم ہی ہرات سے دہلی آئے۔ اس زمانے میں حضرت حسن رسول نما زندہ تھے۔ اور ان کی مجلسِ علم و ارشاد مرجع انام تھی۔ سید عبد الکریم نے بھی اُن کی خدمتِ بابرکت میں رہ کے علومِ ظاہری و باطنی حاصل کیے۔ پھر ان سے خرقۂ خلافت پایا اور خود ہاپوڑ میں رہ کے مسندِ رشد و ہدایت پر متمکن ہوئے۔

جناب طرزی کے والد سید امداد علی بلند شہر میں وکیل سرکار تھے۔ ۱۸۵۷ء کی شورش کے زمانے میں یہ نواب ولی داد خاں رئیسِ مالاگڑھ (ضلع بلند شہر) کے کار مختار اور نائب الریاست تھے۔ جب ہنگامہ ختم ہوا۔ تو نواب ولی داد خاں پر بھی بغاوت کا الزام عاید ہوا اور انھیں موت کی سزا دی گئی۔ سید امداد علی بھی گیہوں کے ساتھ گھن کی طرح پس گئے۔ بارے جان تو بچ گئی لیکن جایداد کے ماتھے گئی اور یہ ضبط ہو کر نیلام ہو گئی۔ اس کے بعد یہ الور جا کر سرشتہ دار کلکٹری ہو گئے۔

طرزی بلند شہر ہی میں پیدا ہوئے اور ان کی ابتدائی تعلیم بھی اسی جگہ ہوئی۔ جب یہاں سے فارغ ہوئے تو تکمیل کے لئے دہلی پہنچے اور مفتی محمد صدر الدین خاں صدر الصدور سے منطق اور ریاضی اور مولانا مملوک علی نانوتوی سے حدیث اور ادب عربی اور مولوی سدید الدین سے فارسی پڑھی۔ مولانا مملوک علی کے درسِ حدیث میں یہ اور حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم ہم سبق تھے۔ مولانا تھانوی فرمایا کرتے تھے، کہ دلاور علی اور تو سب کام کر لیتے تھے، لیکن روٹی پکانے سے ہمیشہ کتراتے تھے اور یہ کام میرے سپرد تھا۔ درسیاتِ متعارفہ کے علاوہ طب اور مصوری اور خوش نویسی میں بھی مہارت پیدا کی۔ طب حکیم امام الدین خاں سے پڑھی۔ خوش نویسی میں میر پنجہ کش کے شاگرد تھے۔ فنِ سپہ گری کے بھی ماہر اور خصوصاً بنوٹ کے اُستاد تھے۔ شطرنج بھی بہت اچھی

کھیلتے تھے۔ پتنگ بازی کا بھی شوق تھا۔

دہلی میں تعلیم ختم کرنے کے بعد ہاپوڑ کے سرکاری اسکول میں صدر مدرس (ہیڈ ماسٹر) مقرر ہوئے۔ ریاضیات میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ یہاں ایک دن ڈپٹی انسپکٹر مدارس سے کسی ریاضی کے مسئلے میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ یہ گھر پر آئے اور استعفیٰ لکھ کے بھیج دیا۔ ڈپٹی انسپکٹر صاحب نے کتنا کہا کہ میرے دل میں آپ کی بہت عزت ہے۔ آپ استعفیٰ واپس لے لیں۔ لیکن یہ اپنی ضد پر قائم رہے اور نوکری ترک کر دی۔ اس کے بعد لکھنؤ چلے گئے۔ اور وہاں بندوبست میں ناظر اول مقرر ہو گئے، پھر منصرم بن گئے اور بندوبست ختم ہونے تک اسی عہدے پر رہے۔ انہی زمانے میں فارسی کے مشہور شاعر خواجہ عزیز الدین عزیز زندہ تھے۔ طرزی اور ان کے درمیان بہت گہرے دوستانہ تعلقات پیدا ہو گئے (عزیز کے کلیات میں بھی ایک خط طرزی کے نام موجود ہے)۔

جب سید امداد علی کا انتقال ہوا، تو طرزی اپنے والد کی جگہ الور میں سررشتہ دار کلکٹری مقرر ہوئے۔ یہاں سے تحصیلدار ہو کے رام گڑھ گئے اور آخر میں ترقی کر کے ۱۸۸۷ء میں ریاست کے چیف مجسٹریٹ ہوئے۔ ۱۹۰۳ء میں ملازمت سے پنشن لی اور اس کے بعد مستقلاً ہاپوڑ میں رہنے لگے۔ یہیں چند روز بعارضۂ بخار علیل رہ کر ۲۸۔ ستمبر ۱۹۱۱ء (۴۔ شوال ۱۳۲۹ھ) کو واصل حق ہوئے۔

اُن کے دوست قاضی محمد علیم سہنوی نے تاریخ کہی ؎

چو دا حسرتا! طرزیِ خوش بیاں
بحق جانِ خود داد و در قبر خُفت
بہجری علیمؔ حزیں سالِ فوت
غم طرزیِ پاک دل آہ گُفت
۱۳۲۹ھ

عیسوی تاریخ ہوئی ؎

رفتہ مخلد طرزیِ شیریں زباں
باد بُرد حش بے رحمتِ تو، یا خدا!

سالِ مسیحی علیم گفتہ پئے یادگار

وائے دریغا بمرد طرزیِ اہلِ صفا

۱۹۱۱ء

ہاپوڑ ہی میں مدفون ہیں۔ لوحِ قبر پر علیم ہی کا لکھا ہوا یہ کتبہ ہے ؎

یا غفار یا واحد واجب

آہ طرزی زجہاں رفت و کنوں ۱۳۲۹ھ اندریں قبر دریغا خفتہ

بہرِ تاریخ، علیم ایں مصرع تربتِ طرزیِ نامی گفتہ ۱۳۲۹ھ

بڑی آن بان اور وضع کے بزرگ تھے۔ بعض معمول ایسے تھے جن میں عمر بھر فرق نہیں آیا۔ مثلاً روزانہ بعد ظہر کپڑے بدل لیتے تھے۔ تیسرے روز صافہ یا اچکن یا انگرکھا بدلتے۔ ساری عمر کوٹ، شیروانی وغیرہ استعمال نہیں کی۔ جوتا ہمیشہ زرد مخمل کا پہنتے اور ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو اُسے بدل ڈالتے، حالانکہ ٹوٹنا تو در کنار، ابھی یہ میلا بھی نہیں ہوتا تھا۔ ایسے لوگ اب کہاں پیدا ہوتے ہیں۔

اپنے پیچھے اولادِ جسمانی کوئی نہیں چھوڑی۔ اُن کے ایک چھوٹے بھائی سید نظام الدین تھے۔ یہ حافظ قرآن اور شاعر بھی تھے۔ نظام اور نظامی دو تخلص کرتے تھے۔ طرزی نے ان کے بڑے بیٹے سید احمد کو متبنیٰ کر لیا تھا۔ اِن کا بھی اگست ۱۹۴۸ء میں انتقال ہو گیا۔ اب اُن کے صاحبزادے لاہور میں ڈاکٹری کرتے ہیں۔ خاندان کی ایک شاخ ہاپوڑ میں بھی ہے۔

دہلی کی تعلیم کے دوران ہی میں شعر و شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ وہ فضا ہی ایسی تھی کہ کوئی اُس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ پھر یہ تو اپنی تعلیم کے سلسلے میں مفتی صدر الدین آزردہ کے ہاں جاتے آتے ہی رہتے تھے۔ ان ہی کے واسطے سے غالب، صہبائی، شیفتہ اور دوسرے اساتذۂ وقت سے مراسم پیدا ہوئے۔ آغاز میں ثاقب تخلص کرتے اور آزردہ سے اصلاح لیتے رہے۔ استاد نے ثاقب بدل کر تخلص طرزی کر دیا (تذکرہ یادگارِ ضیغم میں نام ثاقب ہی کے تحت ہے)، غالباً اُسی زمانے میں غالب سے مشورہ کرنے لگے۔ اردو میں کبھی کچھ نہیں کہا، ہمیشہ فارسی لکھا کیے۔ شروع میں عام روش کے مطابق مذہب

سے کچھ زیادہ تعلق نہیں تھا۔ چنانچہ شاعری میں بھی وہی رسمی عاشقانہ اور فلسفیانہ مضامین لکھتے رہے لیکن آخر میں مولانا شاہ بہار الدین امروہی کے ہاتھ پر بیعت کرکے ان باتوں سے ہاتھ اُٹھالیا اور پرانی قسم کے پکے حنفی مولوی بن گئے۔

فارسی کے دو دیوان (ایک غزلیات کا، ایک قصاید کا) اور ریاضیات میں ایک کتاب تہذیب اقلیدس مطبوعہ موجود ہیں۔ قصاید میں ایک قصیدہ غالبؔ کی مدح میں بھی ہے۔ بہت پختہ اور مرصع کلام ہے۔ ہر ایک شعر سے ان کی قدرتِ زبان اور نکتہ آفرینی کا ثبوت ملتا ہے۔

ان کی غزلیات میں واقعی غزل ہے یعنی سادہ زبان اور دلی جذبات اور خلوص۔ نہ پیچ، نہ فلسفہ، نہ دور از کار استعارے اور تشبیہیں۔ وہ جو متاخرین نے غزل کو الفاظ کا گورکھ دھندا بنا دیا ہے، اس کا طرزیؔ کے کلام میں کہیں نشان نہیں۔ اُن کا کلام دیکھ کر سعدیؔ اور خسروؔ یاد آجاتے ہیں۔ نمونہ دیکھیے:-

آخر اے یارِ سفر کردہ کجائی باز آ ــــ بیش ازیں نیست مرا تابِ جدائی باز آ

طرزیؔ! الحق کہ قیامت نرسد پیش از وقت ــــ مگر آں وقت کہ از یار شود یار جدا

بروی از خانہ بحیلہ غیر را بیرون در ــــ سوے من باز آمدی، نازم باحسانِ شما

از غمِ دوریم، آرامِ دلِ زار کجاست ــــ باشد آرامِ دل از یار، دلے یار کجاست

حاش اللہ کہ ترکِ تو در آید بخیال ــــ ایں خیال اے بتِ طناز! نمی دانم چیست

غیر گوید سخنِ تلخ و بسوئیت نگرد! ــــ دانم ایں جرأت بیجاش باپیاے ہست

طرزیؔ! چو بود رنجشِ بیجا ازیں طرف ــــ شرمندہ پیش او شدم از گفتگوے صلح

قسمت ایں بود کہ در راہ بمانم وز دور ــــ من بحسرت نگراں باشم و محمل برود

گرچہ دل بر سرِ صد شکوۂ بیداد رود ــــ چوں کنی نیم نگاہے، ہمہ از یاد رود

آہ ازاں حیلہ کہ از ہم نفسے می آید ــــ مضطرب گشتن و گفتن کہ کسے می آید

از پے رخصتم از بزم مگر خاستہ ــــ کہ ازیں نوع ترا حیلہ بسے می آید

ایں قدر ہست نصیبم ز گلستاں طرزیؔ ــــ کہ نسیمے ز شگافِ قفسے می آید

زبے تابی و شوق از اولِ شب تا سحر ظرزی! | رو و ہر لحظہ زاں کوے و ہماں دم باز می آید
ظرزی آورد ز ہر بابِ سخن وقتِ وداع | تا بتقریبِ سخن ہمرہِ محمل برود
بہر کس بے سبب ہم گفتگوے می کنم تا دیر | کہ باشد حیلۂ از بہرِ ماندن زیرِ دیوارش
باد آہستہ گویم حرفِ مطلب چوں کسے آید | باآوازِ بلند از مصلحت حرفِ دگر گویم
با ہمہ رشکِ رقابت ہر دم آیم سوے تو | نیست آں صبرم کہ یک ساعت نہ بینم روے تو
تا بوصلِ خویشتن امید وارم کردۂ | زاں شکایت ہا کہ کردم، شرمسارم کردۂ

[خطوط مولانا معشوق حسین اظہر ہاپوڑی مرحوم دستید
محمد جمیل ہاپوڑی بنام مولف]

ظفر ــــــــ ظلِ سبحانی ابو ظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ تاجدار دہلی

ظفر کے خاندان کا حال کیا لکھا جائے کہ اس سے ہندستان کی تاریخ کے صفحات روشن ہیں۔ مختصراً یہ کہ ہندستان میں جس خاندانِ مغلیہ کی ابتدا ۱۵۲۶ء میں بابر کے ہاتھوں پڑی تھی، ظفر اس سلسلے کی آخری کڑی تھے۔ ظفر کے دادا شاہ عالم ثانی آفتاب تخلص کا نام اس لحاظ سے مشہور ہے کہ غلام قادر روہیلے نے ان کی آنکھیں نکلوادی تھیں اور انھیں کے عہد میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو لال قلعہ دہلی پردہ تصرف حاصل ہوا جس کا نتیجہ "خلق خدا کی، ملک بادشاہ کا اور حکم کمپنی بہادر کا" کی شکل میں ظاہر ہوا۔ شاہ عالم ۱۸ر نومبر ۱۸۰۶ء (۷۔ رمضان ۱۲۲۱ھ) کو رہ گراے عالم بقا ہوئے۔ اور ان کے بعد اُن کے دوسرے بیٹے اکبر شاہ ثانی جلوہ آراے سریر سلطنت ہوے۔ ظفر انہی اکبر شاہ ثانی کے بڑے بیٹے تھے۔ ۲۸۔ شعبان ۱۱۸۹ھ (۲۴۔ اکتوبر ۱۷۷۵ء) کو بدھ کے دن لال قلعہ میں ایک ہندو رانی لال بائی کے بطن سے پیدا ہوئے۔

اکبر شاہ ثانی کی تخت نشینی کے بعد قانونی طور پر ظفر کو ولی عہد سلطنت ہونا چاہیے

تھا لیکن اکبر شاہ اپنے دوسرے بیٹے جہانگیر کو ولی عہد مقرر کرنا چاہتے تھے، جو اُن کی چہیتی بیگم نواب ممتاز محل کے بطن سے تھے۔ جب انگریزوں نے اُنھیں اس سے منع کیا کہ یہ ناانصافی ہے تو اس پر انھوں نے جھلّا کے کہہ دیا کہ سراج الدین میرا بیٹا ہی نہیں۔ ان ذہنی اور روحانی صدموں کے سامنے بھی ظفر کے پائے استقلال میں لغزش نہیں آئی۔ ان کا مقولہ تھا۔ "خدا دارم، چہ غم دارم"۔ قادرِ مطلق خدا دیکھ رہا تھا اور انسانِ ضعیف البنیان کی خام خیالیوں پر ہنس رہا تھا۔

جہانگیر کے مزاج میں شورش بہت تھی، شامتِ اعمال انھوں نے ایک دن انگریز ریذیڈنٹ آرچبولڈ سیٹن پر طپنچہ داغ دیا۔ بارے وار خالی گیا اور ریذیڈنٹ کی جان بچ گئی لیکن اِن کے ماتھے گئی۔ یہ گرفتار کر کے الٰہ آباد بھیج دیے گئے۔ یہی واقعہ دہلی کے مشہور میلے "پھول والوں کی سیر" کا باعث ہوگیا۔ ہوا یوں، کہ ان کی والدہ نواب ممتاز محل نے منت مانی کہ میرزا جہانگیر رہا ہو کر آئیں گے تو میں حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ کے مزارِ مبارک پر پھولوں کا چھپر کھٹ اور غلاف نذر چڑھاؤں گی۔ جب یہ الٰہ آباد سے واپس آئے، تو یہ منت پوری کی گئی۔ پھول والوں نے ایک جدت کی کہ چھپر کھٹ میں پھولوں کا ایک پنکھا بھی لٹکا دیا۔ یہ چھپر کھٹ بڑی دھوم دھام سے قطب صاحب پہنچایا گیا اور بادشاہ کی چہیتی بیگم کی خاطر سے قلعے اور شہر کے لوگ امنڈ کے تماشا دیکھنے کو آئے۔ جنگل میں منگل ہوگیا۔ اور ایک میلا سا لگ گیا۔ اکبر شاہ کو یہ بہت پسند آیا۔ حکم دیا کہ ہر سال اسی طرح ساون کے مہینے چھپر کھٹ نذر دیا جائے چنانچہ اب تک یہ ہر سال دہلی میں ہوتا ہے۔

میرزا جہانگیر آنے کو تو آگئے لیکن ان کے مزاج کی وحشت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ جلد ہی پھر ایسی حرکت کی کہ واپس الٰہ آباد بھیج دیے گئے۔ جہاں کثرتِ شراب نوشی کی علت میں ۱۸۲۱ء (۱۲۳۶ھ) میں انتقال ہوگیا۔ لاش وہاں سے دہلی لائی گئی اور سلطان جی کی مسجد کے صحن میں ایک خاص حجرے کے اندر دفن ہوئی۔

انگریزوں نے اب اعلان کر دیا کہ ہم ظفر کے سوائے کسی اور کو ولی عہد تسلیم نہیں کریں گے۔ ظفر نے لکھا ہے

کیسی تدبیر ظفرؔ جب وہ کرے اپنا کرم　　کام بگڑے ہوئے بن جائیں یونہی آپ سے آپ

اکبر شاہ ثانی ۲۸ ستمبر ۱۸۳۷ء کو ۸۲ برس کی عمر میں عالم جاودانی کو سدھارے اور اُن کی جگہ ابو ظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ثانی، ظفرؔ تخلص تختِ دہلی پر جلوہ آرا ہوئے۔ اُس وقت اِن کی عمر ۶۲ برس کی تھی۔ صہبائی نے تاریخ کہی ؎

از نشۂ دولتِ بہادر شاہی　　شد پُر زمے طرب، ایاغ دہلی
بنشست بہ تختِ دولتِ روز افزوں　　نزہت بفزود از وبہ باغِ دہلی
تاریخِ جلوسِ آں شہِ والا قدر　　آمد بلبِ خود "چراغِ دہلی"

۱۲۵۳ھ

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ شاہی بس نام کی تھی۔ کہنے والے تو اُن کے دادا کے وقت ہی سے کہنے لگے تھے "عملداریِ شاہ عالم، از دہلی تا پالم" (پالم دہلی سے سات کوس پر ہے) ظفرؔ تک پہنچتے پہنچتے یہ اور بھی مختصر ہوگئی۔ لال قلعہ دہلی کے باہر حکومت اور انتظام کمپنی بہادر کا تھا۔ یہ صرف قلعہ کی چاردیواری کے اندر تک کے بادشاہ تھے۔ کارکنانِ قضاو قدر کے ترکش میں ابھی ایک اور تیر باقی تھا۔ اُنھیں اس بوڑھے، خداترس، دیندار بادشاہ کا یہ گوشۂ عافیت بھی نہ بھایا۔ مئی ۱۸۵۷ء میں دیسی فوج نے انگریزوں کے خلاف ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ یہ فوج میرٹھ سے آکر دہلی پر قابض ہوگئی اور بہادر شاہ کے شہنشاہِ ہندستان ہونے کا اعلان کر دیا۔ ابھی اس اعلان پر مشکل سے چار مہینے گزرے تھے، کہ ستمبر میں انگریزوں نے ہندستانی فوج کو شکست دی اور دوبارہ شہر اور قلعہ پر بھی مسلّط ہوگئے۔

بہادر شاہ نے قلعے سے راہِ فرار اختیار کی اور اپنے دادا ہمایوں بادشاہ کے مقبرے میں جا پناہ لی۔ مخبر نے انگریزوں کو پرچہ دیا کہ بادشاہ ہمایوں کے مقبرے میں چھپا بیٹھا ہے۔ کرنیل ہاڈسن اُنھیں شہر لانے کے لیے پہنچا۔ بادشاہ نے پہلے تو انکار کیا، وہ بھلا کیسے اُس کا اعتبار کر لیتے لیکن ہاڈسن کے وعدہ کرنے اور مرزا الٰہی بخش کے سمجھانے پر کہ اُن کی جان پر آنچ نہیں آئے گی، اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا۔ دیکھا جائے تو وہ اور کر بھی کیا سکتے تھے۔ قصہ کوتاہ یہ پکڑے آئے اور زینت باڑی (لال کنواں) میں نظر بند کر دیے

گئے۔ ایامِ نظربندی میں پانچ روپیہ یومیہ خرچ کے لیے ملتے تھے۔

جب ملک میں دوبارہ ہر جگہ انگریزوں کا پورا تسلط ہو گیا اور کسی طرف سے خطرہ نہ رہا تو سر جان لارنس چیف کمشنر پنجاب کی منظوری سے ظفر پر مقدمہ قائم ہوا اور انھیں ۲۷ جنوری ۱۸۵۸ء کو ایک فوجی کمیشن کے سامنے پیش کیا گیا۔ فردِ جرم یہ تھی:-

(۱) فوجی باغیوں (جرنیل محمد بخت خاں) کی امداد و اعانت۔

(۲) شاہزادے مرزا مغل اور دوسرے اشخاص کو حکومتِ انگریزی کے خلاف جنگ کرنے پر ابھارنا اور اُن کی مدد کرنا۔

(۳) انگریزی حکومت کی رعایا ہونے کے باوجود اپنی بادشاہت کا اعلان اور حکومت کے خلاف جنگ۔

(۴) انچاس عیسائیوں کا قتل کرانا اور قاتلوں کی اعانتِ مجرمانہ۔

سب سے پہلے تو جو فوجی عدالت ظفر کے مقدمہ کی سماعت کرنے کے لئے مقرر کی گئی تھی۔ اُسے ظفر پر مقدمہ چلانے کا کوئی اختیار ہی نہیں تھا، نہ ملکی قانون کی رُو سے نہ بین الاقوامی قانون کے تحت۔ ظفر انگریزوں کی رعایا نہیں تھے۔ ہندستان میں جو قانون اس وقت نافذ تھا، وہ لاکھ برائے نام سہی، خود ظفر ہی اُس کے لیے ذمہ دار اور اس کے نافذ کرنے والے تھے۔ چونکہ وہ شاہِ ہندستان کی حیثیت سے سلطنت اور حکومت کے مرکز تھے، اس لیے وہ قانون سے بالا تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ظفر نے مقدمے کی کارروائی میں کوئی حصہ نہیں لیا لیکن آخر میں ایک بیان دیا جس میں جرم سے انکار کیا اور کہا، کہ میں مجبورِ محض اور باغیوں کا قیدی تھا۔ بہرحال بنا بنایا کیا تھا۔ مقدمہ ۹ مارچ کو ختم ہوا۔ کمیشن نے فیصلہ کیا کہ ظفر نے ایسٹ انڈیا کمپنی سے اپنے تمام معاہدوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے غداری کی اور انگریزوں کے خلاف جنگ میں حصہ لیا۔ اس لیے یہ سزائے موت کے سزاوار ہیں۔ کمیشن نے یہ فیصلہ کر کے سر جان لارنس کے پاس بھیجا اور اُس نے اپنی سفارشات کے ساتھ اسے مرکزی حکومت کو کلکتے بھیج دیا۔ آخری حکم یہ صادر ہوا کہ ظفر کو جلاوطن کر کے رنگون بھیج دیا جائے۔ زینت محل اُن کی

ملکہ اور شہزادہ جواں بخت کو اختیار ہے کہ بادشاہ کے ساتھ چلے جائیں یا کلکتے میں نظر بند رہیں۔ ان دونوں نے ظفر کے ساتھ جانے کو ترجیح دی۔

یہ مختصر قافلہ اکتوبر ۱۸۵۸ء میں کلکتے سے رنگون پہنچا۔ انگریزوں نے چھ سو روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر کیا، جو انھوں نے لینے سے انکار کر دیا۔ چار سال نہایت عسرت اور مصیبت میں بسر کر کے ۷؍ نومبر ۱۸۶۲ء کو مغرب کے قریب بعارضۂ فالج جان بحق ہوئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ نساخ نے تاریخ کہی ؎

وائے دردا چوں بہادر شاہ مُرد　　عالمے شد با غم و با رنج جُفت

سالِ ترحیلش فلک از آسماں　　ناگہاں، بخشایش اللہ گفت

۱۲۷۹ھ

موت کے وقت عمر ۸۷ برس کی تھی۔ وہیں رنگون میں بدھوں کے مشہور شوڈگون گوڈا کے نواح میں بہادر شاہ ظفر روڈ پر آخری آرام گاہ ہے۔ آرام گاہ تو کیا، چشمِ بصیرت کے لیے سامانِ صد عبرت ہے۔ ایک مختصر چوکھنڈی کے اندر سنگ مرمر کا سادہ سا تعویذ ہے۔ اُن کے دائیں طرف ملکہ زینت محل اور دوسری طرف شاہزادہ جواں بخت محوِ خواب ہیں۔ پچھلی جنگ سے پہلے ایک تحریک ہوئی تھی کہ قبر اُن کے شایانِ شان تعمیر کر دی جائے۔ کافی سرمایہ بھی جمع ہو گیا تھا اور کام بھی ہونے لگا تھا کہ جنگ شروع ہو گئی۔ شاید شاہی خاندان ہی کے کوئی نام لیوا قبر کے مجاور ہیں۔

اس وقت قبر کے سرہانے یہ کتبہ ہے:-

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خاندانِ مغلیہ کا آخری چراغ

حضرت ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر رحمۃ اللہ علیہ

۱۸۳۷ء جلوس تا ۱۸۵۸ء

آج بتاریخ ۷؍ نومبر ۱۸۶۲ء مطابق تاریخ ۱۴ جمادی الاول

۱۲۷۹ھ دن جمعہ کو وہ روح جو نواسی سال بہادر شاہ کے جسم

۱؎ زینت محل کی وفات ۱۷؍ جولائی ۱۸۸۶ء کو رنگون میں ہوئی اور جواں بخت کی ۱۸۸۴ء میں مولمین (برما) میں۔

میں موجود رہی۔ زندگی کے تمام تماشے دکھا کر وداع کی تیاری کر رہی

ہے۔ دن ڈھل چکا ہے اور دن کے ساتھ ہی بادشاہ کا پیمانہ

عمر بھی لبریز ہوگیا۔ رنگون کی خاک اس کو آغوش میں لیتی ہے جو

خاندانِ تیموریہ کا آخری چراغ تھا۔ جس نے جہان آباد میں

جنم لیا۔ وہ وطن سے ہزار کوس دور ایک معمولی پلنگ پر دم

توڑ رہا ہے۔ سکرات طاری ہے، سانس اُکھڑ چکا ہے، جس کی

زندگی سچ مچ کا میلہ تھا جس نے زندگی کا ہر لمحہ جمگھٹوں میں

گذارا، آج صرف تین آدمی ایک بیوی اور دو بچے اس کے دم

واپسیں میں ساتھ ہیں۔ آفتاب بھی غروب نہ ہوا تھا کہ اس

بادشاہ نے فانی دنیا کو اپنی عسرت کی تصویر دکھا کر دنیا سے

کوچ کیا اور شاہ جہاں آباد کا یہ گوہرِ آبدار رنگون کی خاک

میں ابدی نیند سو گیا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار

تاریخ وفات

چودہ جمادی الاولیٰ، جمعہ کا روز وقتِ عصر
حالتِ قید و بیکسی، تھی یہ گھڑی بہت کٹھن
وقت نے شاہِ ہند سے عرض کیا وطن سے دور
خُلد ہے آپ کا وطن اے ظفر جلا وطن

۱۲۷۹ھ

ظفر کی رسمی تعلیم بہت اچھی تھی۔ سب سے پہلے حافظ ابراہیم (شمس العلماء منشی ذکاءاللہ کے دادا) اُن کے اتالیق مقرر ہوئے۔ قاری محمد خلیل نے قرآن پڑھایا۔ مرصع قلم سید جلال الدین حیدر اور اُن کے والد میر ابراہیم علی دونوں سے خوش نویسی کی مشق بہم پہنچائی اور سندِ تکمیل حاصل کی۔ ان کے علاوہ مردانہ فنون میں تیراندازی۔ تیغ زنی نشانہ بازی، بانک، بنوٹ۔ لکڑی، شہ سواری میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے شہسواری

سے متعلق مشہور ہے، کہ ان کے زمانے میں ہندستان بھر میں صرف ڈھائی سوار تھے۔ سالم ایک یہ اور ایک اِن کے چھوٹے بھائی مرزا جہانگیر اور آدھے کوئی اور بزرگوار۔ اِن علوم کے علاوہ اپنے زمانے کے عام ذوق کی رعایت سے بٹیر بازی، مرغ بازی، کبوتر بازی کا بھی شوق تھا۔

ظفرؔ نے بہت کم عمری میں شعر کہنا شروع کیا۔ سب سے پہلے میر قدرت اللہ قاسمؔ (صاحبِ تذکرہ مجموعہ نغز) کے صاحبزادے میر عزت اللہ عشقؔ سے مشورہ کیا۔ اس کے بعد جب دہلی میں شاہ نصیرؔ کا طوطی بولنے لگا، تو یہ بھی اُن سے اصلاح لینے لگے۔ جب نصیرؔ دکن گئے تو میر کاظم حسین بیقرارؔ سے مشورہ کرنے لگے۔ لیکن اس شاہِ سخن کی استادی کا شرف ازل سے شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کی قسمت میں لکھا تھا۔ ۱۸۰۸ء میں بیقرار بھی ربنڈیلے کے ساتھ میر منشی بن کے سندھ اور بلوچستان کی طرف سدھارے اور یوں میدان ذوقؔ کے لیے خالی ہو گیا۔ چار روپیہ مہینا تنخواہ مقرر ہوئی، اور ذوقؔ ولی عہدِ سلطنت کے استاد بن گئے۔ تھوڑے دن بعد ترقی ہوئی تو آٹھ ہو گئے۔ جب ۱۸۳۷ء میں یہ تخت پر بیٹھے تو مشاہرہ تیس روپے مقرر ہوا۔ بعد میں اور اضافہ ہوا تو ایک سو روپے ماہانہ ہو گیا، جو اُنھیں موت تک (۱۸۵۴ء) ملتا رہا۔ ذوقؔ کے انتقال کے بعد غالبؔ استادِ شہ مقرر ہوئے۔ اُنھوں نے تین برس تک یہ خدمت سرانجام دی تھی کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ وہ بساط ہی الٹ گئی، نہ قلعۂ معلےٰ رہا نہ دربار، نہ استاد رہے، نہ شاگرد۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔

ظفرؔ نے طبیعت بہت دردمند پائی تھی۔ اگرچہ اُنھوں نے آنکھ کھلتے کے ساتھ ہی اپنے اردگرد عیش و عشرت کے سامان دیکھے۔ بعد میں خود ولی عہدِ سلطنت بنے، لیکن زوالِ سلطنت اور انگریزی اقدام نے خاندانِ شاہی کا حال بہت پتلا کر دیا تھا۔ شاہ عالم ثانی کو اخراجات کے لیے ساٹھ ہزار روپیہ ماہانہ ملتا رہا، جس میں سے ظفرؔ کے والد اکبر شاہ کو حصہ رسدی دس ہزار ملتے تھے۔ جب اکبر شاہ تخت پر بیٹھے، تو اُن کے اختیارات میں بھی کتر بیونت ہوئی۔ ۱۸۳۲ء میں پہلے دہلی کو صوبہ غرب و شمال کی عملداری میں شامل

کیا گیا اور ۱۸۳۵ء میں سکہ بھی کمپنی بہادر کا چلنے لگا۔ الغرض ظفر کی تخت نشینی (۱۸۳۷ء) سے پہلے ہی خاندانِ مغلیہ کی حکومت برائے نام رہ گئی تھی۔ بادشاہ کا اختیار لال قلعے میں بھی کامل نہیں تھا۔

اِن سب انقلابات نے ظفر کی حساس طبیعت پر بہت اثر کیا۔ ان کا رجحان شروع سے مذہب اور تصوف کی طرف تھا۔ وہ حضرت مولانا فخرالدینؒ[1] کے گھرانے میں مرید تھے اور آخر میں خود بھی لوگوں کو مرید کرنے لگے تھے۔ یہ شوق اس حد تک بڑھا کہ اُنھوں نے گلستانِ سعدی کی ایک شرح لکھی، جس میں تصوف کے نکات بیان کیے اور اُن کے ایماء پر مفتی میر لال نے ایک کتاب سراج المعرفت اوراد و اشغال کے بیان میں لکھی۔ غرض جیسا کہ غالب نے کہا ہے، واقعی شاہی اور درویشی ظفر کی ذات میں جمع ہو گئی تھیں۔ ان کے کلام میں یہ تمام داخلی اور خارجی اثرات نمایاں ہیں۔

---

[1] حضرت مولانا فخرالدین چشتیؒ ۲۲۔ مارچ ۱۷۱۴ء (۱۷۔ ربیع الاول ۱۱۲۶ھ) کو پیدا ہوئے۔ مولانا نظام الدینؒ اورنگ آبادی کے چھوٹے بیٹے تھے جو نگرام کے رہنے والے اور حضرت مخدوم شیخ سعدی کاکوروی کی اولاد میں سے تھے، اور اپنے مرشد سرگروہ چشتیہ نظامیہ شاہ کلیم اللہ جہان آبادی کے حکم سے اورنگ آباد میں مقیم ہو گئے تھے۔ مولانا فخرالدین نے خرقۂ خلافت اپنے والدِ ماجد سے پایا اور اُنھیں کے ارشاد کے مطابق ۱۱۶۰ھ (۱۷۴۶ء) میں پہلے اجمیر اور پھر دہلی آ گئے۔ یہ محمد شاہ کا زمانہ تھا۔ سب ان کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوئے۔ خود بادشاہ اور وزراء و اُمراء بکمالِ عقیدت و نیاز سے اُن کی مجلس میں حاضر ہوتے۔ ۲۷۔ جمادی الثانی ۱۱۹۹ھ (۸۔ مئی ۱۷۸۵ء) بروز شنبہ بوقتِ عشا واصلِ حق ہوئے۔ "حق پسند فخرالدین" اور "خورشیدِ دوجہانی" تاریخ ہوئی۔ مہرولی میں حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ کے حجرے کے باہر محوِ خواب ہیں۔ مزار مرجعِ انام ہے۔ اُن کے صاحبزادے حضرت مولانا غلام قطب الدین بھی بلند پایہ بزرگ تھے وہ بھی اُن کی تھوڑی مدت بعد ۱۷۔ محرم ۱۲۰۰ھ (۲۰۔ نومبر ۱۷۸۵ء) کو خدا کو پیارے ہوئے۔ غالب کے دوست (اور ظفر کے پیر) مولانا غلام نصیر الدین عرف میاں کالے صاحب اِنھیں غلام قطب الدین کے بیٹے تھے۔ ان کی وفات منگل کے دن ۹۔ دسمبر ۱۸۵۱ء (۱۵۔ صفر ۱۲۶۸ھ) کو ہوئی۔ میاں کالے صاحب کے بیٹے میاں نظام الدین کا ذکر غالب کے خطوں میں آیا ہے۔ اُن کا انتقال ۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء) میں ہوا۔ "خدا جوے و خدا داں آہ" تاریخ ہے۔ (تذکرۂ اہلِ دہلی، ص ۲۳-۲۶)

موئے کو مارے شاہ مدار، شاہی اور دنیوی اختیارات کا یہ عالم تھا۔ لے دے کے ایک شاعری رہ گئی تھی، لیکن تذکرہ نگاروں نے یہاں بھی اُن سے انصاف نہ کیا۔ آزاد نے حق پوشی سے کام لے کر ظفرؔ کی عمر بھر کی کمائی اپنے استاد ذوقؔ کی جھولی میں ڈال دی اور لکھ دیا کہ :-

"مسودۂ خاص میں کوئی شعر پورا، کوئی ڈیڑھ مصرع، کوئی آدھ مصرع، فقط بحر اور ردیف قافیہ معلوم ہو جاتا تھا، باقی بخیہ۔ یہ (یعنی ذوقؔ) ان ہڈیوں پر گوشت پوست چڑھا کر حسن و عشق کی پتلیاں بنا دیتے تھے۔"

کئی مصنفوں نے اُن کے اِس بیان کی قلعی کھولی ہے اور ثابت کر دیا ہے کہ ذوقؔ کی اُستادی مسلّم اور ان کا کلام ظفرؔ پر اصلاح دینا بھی تسلیم، لیکن اگر اس کا یہ مطلب ہے کو ظفرؔ کے چاروں مطبوعہ دیوانوں میں سے ساڑھے تین ذوقؔ نے خود لکھ کر ظفرؔ کے حوالے کر دیے تھے اور خود بے چارے ظفرؔ ساری عمر... دو مصرعے تک ٹھیک موزوں نہ کر سکے تو اس سے بڑا ظلم اور بہتان اور ہو نہیں سکتا۔ ایک معاصر تذکرہ نگار مولوی کریم الدین اپنے انتخاب شعراء "گلدستۂ نازنینان" (ص ۱۱۸-۱۱۹) میں ذوقؔ کے ترجمے میں لکھتے ہیں کہ "حالتِ صبا سے آج تک یہ عادت طبیعت میں متمکن ہے کہ جو شعر کہتے ہیں، کسی کو نہیں دیتے۔" اس شہادت کی موجودگی میں کون باور کرے گا، کہ ذوقؔ نے اپنا سارا کلام ظفرؔ کی نذر کر دیا۔ لیکن افسوس ہے کہ حالیؔ نے بھی غالباً استاد پرستی کے جذبے میں انصاف سے کام نہیں لیا۔ بلکہ رہی سہی کسر اُنھوں نے پوری کر دی۔ اُنھوں نے جو روایت ناظر حسین مرزا کی زبانی نقل کی ہے اُس کا بھی یہی مطلب ہے کہ غالبؔ خود کہہ کر کلام ظفرؔ کے نام کر دیا کرتے تھے۔

ظفرؔ نے اُس لال قلعے میں آنکھیں کھولیں، جہاں کی زبان اُردوئے معلّیٰ کہلائی۔ اس لیے یہ کہنا محض سخن گسترانہ بات نہیں کہ اُردو اُن کے گھر کی لونڈی تھی۔ پھر یہ بیان ہو چکا ہے کہ وہ ایک خانوادۂ فقر و تصوّف کے مرید اور خود بھی صوفی صافی بزرگ تھے۔ اس لیے اُن کے کلام میں تصوّف کی چاشنی کا ہونا تعجب کا مقام نہیں۔ ظفرؔ نے اپنی

عمر میں پانچ اُستادوں سے اصلاح لی۔ اور اس میں شک نہیں کہ اِن میں سے کم از کم تین اپنے اپنے رنگ کے بے مثل استاد ہیں۔ اِن اصحاب کی مشکل پسندی اور زبان اور محاورہ پر قدرت کسی سے مخفی نہیں۔ ظفرؔ کے کلام میں ان سب کے رنگ کے اشعار پائے جاتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ وہ کسی سے بھی اتنے متاثر نہیں ہوئے کہ اپنی انفرادیت کھو بیٹھے ہوں۔ وہ نصیرؔ کی طرح ٹیڑھی بیڑھی اور سنگلاخ زمینوں کو بھی پانی کر دیتے ہیں۔ وہ ذوقؔ کی طرح زبان اور محاورے اور روزمرہ کے بھی بادشاہ ہیں اور فنی پہلو سے بھی اُن کا کلام بے عیب ہے۔ غالب کا اصلاحی کلام ہم تک نہیں پہنچا کیونکہ وہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں ضائع ہو گیا۔ لیکن ظفرؔ کے ہاں خیال آرائی، جدت آفرینی اور مشکل پسندی کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ چونکہ ان کی نشو و نما ایسے ماحول میں ہوئی تھی جس کی اخلاقی پستی افسوسناک حد تک پہنچ چکی تھی؛ اس لیے ظفرؔ کے ہاں عریاں اور فحش اشعار بھی ہیں۔ اگرچہ خال خال، لیکن ان تمام خصوصیات کے باوجود اُن کے کلام کا ایک اپنا خاص رنگ ہے۔ یہ ہے اُن کا حزن و ملال اور سوگواری، اور یہی اُن کا اصلی اور مستقل رنگ ہے اور اسی رنگ کے اشعار کی اُن کے کلیات میں فراوانی ہے۔ باقی تمام رنگ خارجی اثرات کا نتیجہ ہیں لیکن یہ چیز اُن کی داخلی ہے۔ اُن کے چار ضخیم دیوان ان کی زندگی میں بلکہ غدر سے پہلے ہی چھپ چکے تھے۔ ہر صنفِ سخن میں کلام موجود ہے۔ اسی میں سے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

ہم نے یہی پایا کہ بُرا نام نہ پایا — دنیا میں بلا سے، اگر نام نہ پایا

دلِ بے تاب کو تھاموں، یہ نہیں ہو سکتا — ضبطِ فریاد کروں، گریہ کو روکوں، لیکن

کیا جانے، کہ ہے دل میں ترے کیا نہیں کھلتا — ظالم ترے چپ رہنے کا عقدہ نہیں کھلتا

تو نے جو کچھ مجھ سے کہا، سب سچ ہی نے مان لیا — دل نہیں مانتا ناصح! یہ مانے تو کام چلے

آج کیوں تو اے ظفرؔ! پھرتا ہے گھبرایا ہوا — خیر تو ہے کیا ہُوا، بگڑی کہیں اس یار سے

ظفرؔ آدمی اس کو نہ جانیے گا ہو وہ کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی، جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

کیا ذکر کچھ کلام میں واعظ کے ہو مزا
محفل میں وصفِ بادہ و ساغر کیے بغیر

داغ دل میں، آگ لختِ دل میں، چشمِ تر میں آگ
عشق کی سوزش سے ہے پھیلی ہوئی گھر گھر میں آگ

برسوں گزرے کہ ہوئی خاک ہماری برباد
اب تو اس کوچہ میں اے بادِ سحر خاک نہیں

دل دے کر اُن کو، ایسی اذیت ہوئی ہمیں
اب دل کبھی نہ دیں گے، نصیحت ہوئی ہمیں

منتِ کشِ اجل نہ ہوئے ہم کہ ہو گیا
کام اپنا، ایک تیری نگاہِ عتاب میں

نہ جانا چاہیے کوچہ میں اس کے یہ کہا تو نے
پر اے غم خوار کیا کیجے، نہیں دل اپنے قابو میں

ترے ہاتھ سے، دشتِ وحشت کی میں
جنوں، کب تلک خاک چھانا کروں

خرد کچھ کہے ہے، جنوں کچھ مجھے
کہو میں کہا کس کا مانا کروں

نہیں معلوم ظفرؔ سے اس سے ہوئیں کیا باتیں
چپکے بیٹھے ہوئے تم آج خفا سے کچھ ہو

آشنا ہو، تو آشنا سمجھے
ہو جو نا آشنا، تو کیا سمجھے

ہم اُسی کو بھلا سمجھتے ہیں
آپ کو جو کوئی بُرا سمجھے

اے ظفرؔ! وہ کبھی نہ ہو گمراہ
جو محبت کو رہ نما سمجھے

تری آنکھوں نے خدا جانے کیا کیا جادو
ہم بھی دانا تھے، پر اب پھرتے ہیں دیوانے سے

جو درد ہوتا تو غل مچاتا، جو سایہ ہوتا تو سر ہلاتا
الٰہی دل کو مرض یہ کیا ہے، نہ منہ سے بولے نہ سر سے کھیلے

وہ آئے یا نہ آئے، پر دلِ بیتاب کو اپنے
تسلی میں یہ دیتا ہوں، اب آتا ہے، اب آتا ہے

بہال تک لے گا، اے دیدۂ تر! روک اشکوں کو
ہماری آبرو کو، خاک میں، تو کیوں ملاتا ہے

موت آئے تو ٹل نہیں سکتی
اور آتی نہیں، تو پھر کیا ہے

نہیں رونے میں گر ظفرؔ! تاثیر
جگ ہنسائی نہیں، تو پھر کیا ہے

[تاریخ عروجِ عہدِ انگلشیہ ؛ بہادر شاہ ظفر؛
بہادر شاہ کا مقدمہ، مجموعۂ نغز (۱)، ص ۳۷۲-۳۷۳؛
آبِ حیات (حالات ذوقؔ)؛ یادگارِ غالب، ص ۲۲؛
خمخانۂ جاوید (۵) ص ۳۶۹ - ۳۷۷]

ظہیر ــــــ لالہ پیارے لال دہلوی

قوم کے کائستھ تھے۔ مجذوب سے آدمی تھے۔ ہمیشہ فکرِ شعر میں غرق رہے۔ عین جوانی میں ۱۸۷۲ء میں انتقال کیا۔

رات دِن ایک سا رہتا ہے اجالا میرے گھر ۔۔۔ آتشیں آہ ہے یا آٹھ پہر کی بتی
پڑ گئی رکھتے ہی ناسورِ جگر میں ٹھنڈک ۔۔۔ اس کا پیکاں بھی ہے کیا خوب اثر کی بتی
شبِ فرقت کا اندھیرا نہ گیا، پر نہ گیا ۔۔۔ کام کچھ موم کی آئی، نہ اگر کی بتی
رات گھر اس کے دیے میں کہیں جلتی تھی ضرور ۔۔۔ تا رہا ہے نگہِ اہلِ نظر کی بتی
شمع کی مجھ کو ضرورت نہیں واللہ ظہیرؔ! ۔۔۔ میری روشن ہے ہر اک مصرعِ تر کی بتی

[تذکرۂ آثار الشعرائے ہنود، ص ۹۱-۹۲؛
بہارِ سخن: ص ۲۶۷-۲۶۸؛]

عارفؔ ــــــ میرزا زین العابدین خاں دہلوی

اِن کے والد شرف الدولہ نواب غلام حسین خاں بہادر سہراب جنگ تھے۔ وہ بیٹے تھے نواب فیض اللہ خان بہادر کے اور وہ نواب قاسم جان کے جو عارف جان کے بھائی تھے۔ جن کی اولاد میں نواب احمد بخش خاں بہادر (والیِ لوہارو)۔ اور الٰہی بخش خاں معروفؔ تھے۔

نواب غلام حسین خاں شعر بھی کہتے تھے۔ مسرورؔ تخلص تھا۔ موسیقی خصوصاً ستار نوازی میں طاق تھے۔ غالبؔ کے ہم زلف تھے۔ یعنی اُن کا پہلا نکاح نواب الٰہی بخش خاں معروفؔ کی چھوٹی صاحبزادی بنیادی بیگم سے ہوا تھا۔ اس نکاح کا نتیجہ دو صاحبزادے تھے۔ زین العابدین خاں عارفؔ اور حیدر حسین خاں۔ لیکن بعد میں میاں بیوی میں بگاڑ ہو گیا۔

اور نوبت علیحدگی تک پہنچی۔ چنانچہ مسرور نے ایک مکان بیوی کے نام ہبہ کر دیا اور وہ اپنے طور پر الگ رہنے لگیں۔ اس کے بعد مسرور نے ایک عورت سنگی بیگم سے نکاح کر لیا۔ نواب غلام حسن خاں محو اسی دوسری بیوی کے بطن سے تھے۔ مسرور نے اکتوبر ۱۸۵۴ء میں انتقال کیا۔ غالب نے اُن کی مروت اور مہر و محبت کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔

عارف ۱۸۱۷ء (۱۲۳۳ھ) میں پیدا ہوئے۔ میاں بیوی میں ناچاقی کے باعث بیٹے کی تعلیم و تربیت کا بار کلیۃً ان کی والدہ کے سر پر آ پڑا۔ لیکن اس نیک بخت بی بی نے اُسے ہمت سے اُٹھایا۔ اِن کی تعلیم کے تمام مراحل گھر پر طے ہوئے۔ دوسرے علوم و فنون کے علاوہ خطِ نسخ کے بھی استاد تھے۔ اور اس فن میں یاقوت رقم خاں ثانی میر جلال الدین خوش نویس کے شاگرد تھے۔ استاد کی توجہ اور اپنی محنت سے سال کے اندر اندر ایسی مشق بہم پہنچائی کہ اُستاد نے اصلاح دینا چھوڑ دی اور سند لکھ دی۔ نواب سعید الدین احمد خاں طالب نے اِن کی تعلیمِ نسخ سے متعلق جو واقعہ اپنے والد نواب نیّر رخشاں سے روایت کیا ہے، وہ امراؤ مرزا انور کے ترجمے میں بیان کر چکا ہوں۔

جب غالب کے اپنے بچوں میں سے کوئی زندہ نہ رہا تو اُنھوں نے عارف کو بیٹا بنا لیا۔ غالب کو اُن سے جو شدید محبت تھی وہ اُن کے اُردو فارسی کلام سے ظاہر ہے۔

عارف نے بہت کم عمری میں شعر کہنا شروع کیا اور اپنے نانا نواب الٰہی بخش خاں معروف کے تخلص کی رعایت سے عارف تخلص اختیار کیا۔ طبیعت میں غضب کی آمد تھی اور بڑے پُرگو تھے۔ شروع میں شاہ نصیر سے اصلاح لی اور تھوڑی مدت میں اُن کے رنگ میں ایک دیوان بھی "مطلعِ مہرِ سعادت" کے نام سے مرتب کر لیا۔ گلدستۂ نازنیناں (ص-۲۲۲-۲۴۴) میں کلام کا جو انتخاب درج ہے وہ سراسر نصیر کے رنگ میں ہے۔ اسی طرح کی سنگ لاخ زمینیں شرمسار ہو کے چلے، اشکبار ہو کے چلے؛ برابر بجلی، گوہر بجلی؛ قبا میں بل پڑا، پارسا میں بل پڑا؛ نظر سے فلک پہ بجلی زمین پہ باراں، گہر سے فلک پہ بجلی زمین پہ باراں؛ بیمار اُٹھے اور بیٹھے، اغیار اُٹھے اور بیٹھے وغیرہ۔ لیکن جب نصیر دکن کو سدھارے تو عارف نے غالب سے استفادہ شروع کیا۔ رنگِ سخن بھی بدل دیا۔ اور پہلا دیوان

بھی نظری کر دیا۔ اب وہ شاعری میں غالب کی پیروی کرنے لگے۔ اور دوسرا دیوان مرتب کیا۔ انہی خوبیوں کے باعث میرزا ان پر بہت فخر کرتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ عارف اُردو میں میرے صحیح جانشین ثابت ہوں گے۔ چنانچہ ایک فارسی قطعہ مدحیہ میں لکھتے ہیں:

اے کہ میراث خوارِ من باشی — اندر اُردو کہ آں زبانِ من است

از معانی زمہد عرفیاعق — باد آنِ تو، ہرچہ آنِ من است

لیکن افسوس کہ اس ہونہار نوجوان کی جوانا مرگی کا داغ بھی غالب کی قسمت میں لکھا تھا اور اُن کی یہ آرزو بھی پوری نہ ہوئی۔ عارف نے اپنی عمر میں دو نکاح کیے۔ پہلا نواب شمس الدین احمد خاں والیِ لوہارو کی ہمشیرہ نواب بیگم (بنت فخر الدولہ نواب احمد بخش خاں) سے ہوا۔ یہ بتوانسہ بچے ہونے پر زچگی میں فوت ہو گئیں، تو اس کے بعد دوسرا مرزا احمد علی بیگ بخارائی کی صاحبزادی بسمی بیگم عرف نواب دلہن سے ہوا۔ عارف کو اس بیوی سے حد درجہ محبت اور شیفتگی تھی جب یہ بھی جنوری ۱۸۵۲ء میں دردِ گردہ کی تکلیف سے رہ گرائے عالم جاودانی ہوئیں، تو عارف کی دنیا اندھیر ہو گئی۔ طبیعت پہلے ہی کئی دن سے نڈھال رہتی تھی۔ یوں بھی دبلے پتلے اور کمزور قوام کے تھے۔ اس صدمے نے اور پست کر دیا۔ بیماری نے جلد ہی تشویشناک صورت اختیار کر لی اور پھیپھڑوں پر حملہ ہوا۔ موت سے چند دن پہلے خون کی قے ہوئی اور یوں بیوی کی وفات کے تین چار ماہ بعد یہ بھی اللہ کو پیارے ہوئے۔ جب مرض الموت میں غالب عیادت کو گئے، تو مزاج پوچھنے پر یہ شعر پڑھا ؎

آنکھوں میں دم ہے مثلِ چراغِ سحر ہوں میں — لَو لگ رہی ہے، جان کو کیا انتظار ہے

عارف کی موت پر غالب نے وہ دردناک نوحہ لکھا تھا، جو اُردو نظم کی تاریخ میں اپنا نظیر نہیں رکھتا۔ اس کا پہلا شعر ہے ؎

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور — تنہا گئے کیوں، اب رہو تنہا کوئی دن اور

میرزا قربان علی بیگ سالک نے تسکین، مومن اور عارف تینوں کی تاریخ وفات ایک قطعہ میں لکھی ہے ؎

برس دن میں، مُوئے یہ تین شاعر — کہ جو تھے حضرتِ دہلی کے ساکن
نہ ہاتھ آئی کوئی تاریخِ رحلت — رہی فکر اس کی سالک کو بہت دن
کہا دل نے کہ داخل ہو گئے سب — اِرم میں عارف و تسکین و مومن

۲۴۱ + ۳۵۱ + ۵۴۰ + ۱۳۶ = ۱۲۶۸ھ

نساخ نے تاریخ لکھی ہے

مُرد امروز میرزا عارف — دوستانش شدند با غم جُفت
سالِ مرگش چو از خرد جُستم — "خلد اعلا مقام عارف" گفت
۱۲۶۸ھ

عارف بھی مذہباً غالب کی طرح اثنا عشری شیعہ تھے۔ اپنے پیچھے دو خورد سال بچے باقر علی خاں اور حسین علی خاں چھوڑے۔ ان دونوں کی پرورش بھی غالب نے کی۔ (ان کے حالات کے لیے حسین علی خاں شاداں کا ترجمہ ملاحظہ ہو) افسوس کہ عارف کا دیوان شائع نہیں ہوا۔ اس کا ایک نسخہ لوہارو کے کتب خانے میں تھا اور اب رضا لائبریری رام پور میں منتقل ہو گیا ہے۔ دوسرا لالہ سری رام مرحوم مولف خم خانۂ جاوید کے کتب خانے میں تھا جو اب ہندو یونیورسٹی بنارس کے ذخیرے میں ہے۔ ایک اور نسخہ کتب خانہ سالار جنگ حیدرآباد میں بھی ہے۔ مختصر انتخاب ملاحظہ ہو

اے فلک! خانہ خرابی کی ہے پروا کس کو — دشت میں رہتے ہیں، مدت ہوئی، گھر چھوڑ دیا
مت کہو وہ بات، عارف! جو گراں خاطر پہ ہو — کیا مزا ہے، گر جبینِ آشنا میں بل پڑا
رنجِ ہجراں کی مصیبت جو یہ ہوتی معلوم — میں شبِ وصل کی ہرگز نہ تمنا کرتا
سخت شرمائے میں اتنا نہ سمجھتا تھا انھیں — چھیڑتا تھا، تو کوئی شکوۂ بے جا کرتا
دیکھ کے ایک بار ہی اس کو یہ بے خود ہوئے — پھر نہ ہوا حشر تک، بارِ دگر دیکھنا
جو کعبے میں ہے، ہے وہی بت خانہ میں جلوہ — اک پردہ ہے سو شیخِ حرم اُٹھ نہیں سکتا
اب تلک آئینہ شاید آپ نے دیکھا نہیں — آپ جو کہتے ہیں، "ہم رکھتے نہیں، اپنا جواب"
میں تو مر جاتا وہیں، غیرت سے، کوہِ طور پہ — اس طرح سے صاف گر ملتا مجھے، موسیٰ! جواب
چرخ تک جا کے نہ بدنام ہو، اے نالۂ دل! — بیٹھ جانے کو ہے یہ سقفِ کہن آپ سے آپ

باتیں ہزار، پیچھے بناتے ہیں بیٹھ کر ۔۔۔ مقدور کیا کہ بول سکیں رُوبروے دوست

گو زخم ہاے تن مرے، بھر آئے چارہ گر ۔۔۔ اے بے خبر! جراحتِ پنہاں کا کیا علاج

ساغر اک ہاتھ میں، اک ہاتھ میں مینائے شراب ۔۔۔ ہے یہ انداز ترا، ساقیِ سرشار پسند

ہم بے کسوں کا آن کے تو ہی ثواب لے ۔۔۔ اے موت! رحم کر، مرے حالِ تباہ پر

چپ پڑے رہتے تو کیوں یاں سے اُٹھائے جاتے ۔۔۔ ہائے کیوں شور مچایا تری دیوار کے پاس

اک دیکھنا ہی، کہیے تو اس کو بھی چھوڑ دیں ۔۔۔ رکھتے نہیں ہیں آپ سے، اس کے سوا غرض

پھر دشمنوں کی خاک شکایت کریں، بھلا ۔۔۔ جب دوست دیکھ سکتے نہیں آرزوے دل

اُٹھتا قدم جو آگے کو، اے نامہ بر نہیں ۔۔۔ پیچھے تو چھوڑ آئے کہیں اس کا گھر نہیں

مانا یہ ناصحا! کہ نہ اُس سے ملا کریں ۔۔۔ بہتر تو ہاں یہی ہے، مگر دل کا کیا کریں

تکلیف آپ آنے کی کیوں آشنا کریں ۔۔۔ بیٹھے ہوئے وہیں مرے حق میں دعا کریں

خود ہیں خجل کہ جیتے رہے اُس کے ہجر میں ۔۔۔ اپنا یہ منھ نہیں ہے، کہ اس سے گلا کریں

لذتِ درد سے محظوظ وہ ناکام نہیں ۔۔۔ جس کو بے تابیِ دل باعثِ آرام نہیں

کچھ تو ہے بات، کہ خاموش رہا کرتا ہوں ۔۔۔ کچھ تو ہے کام، کہ دنیا سے ہمیں کام نہیں

زاہدا! مے کدے کی راہ سے گذر امت کر ۔۔۔ رہن ہو جائے نہ جبہ و دستار کہیں

عارف! بتا کہ سر ہے یہ کس دن کے واسطے ۔۔۔ پھرتا ہے آج تیغ وہ عریاں کیے ہوئے

آج کیا تیغ بکف اس کو سنا ہے، عارف! ۔۔۔ آپ اس وقت جو یوں جاتے ہیں گھبرائے ہوئے

لذتِ درد سے، بے چارہ نہیں ہے واقف ۔۔۔ لے گیا چھین کے غم خوار نمک داں مجھ سے

آغازِ دردِ عشق کے انجام کو نہ پوچھ ۔۔۔ یہ ابتدا ہے وہ، کہ نہ جس کی خبر لے

گھر کے لُٹنے ہی سے تم غم میں پڑے ہو عارف! ۔۔۔ اور کیا کیا وہ ابھی کرتے ہیں، دیکھا کیجے

چین ایک دم نہیں بے تابیِ دل سے، عارف ۔۔۔ کس نے رکھ دی ہے مرے سینے کے اندر بجلی

رہی غمِ فرقت میں کچھ بھی جو توانائی ۔۔۔ شہرت مری افغاں کی تا عرشِ بریں ہوتی

اُمید ہے کب، عارف! نالہ کی رسائی کی ۔۔۔ یہ بیل منڈھے چڑھتی، معلوم نہیں ہوتی

فارسی کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

بہ ہجرِ یار چہ باک از شنودنِ پندست | گرفتم این کہ ز تلخی بہ زہر مانندست
نزاکت ست ترا، باعثِ درستیِ عہد | دگرنہ شیوۂ خوباں، شکستِ سوگندست
ہزار سال کند مشقِ دیدنِ خورشید | بہ دیدنِ رخِ تو، ہر کہ آرزومندست
کے زدوست شکایت کند، خدا نکند | بلطفِ دشمن دعا رف بجور خورسندست

دے بہ پرسشِ من گر زباں بجنباند | کلاہِ گوشۂ من آسماں بجنباند
ز دردِ دل بدرت آنچناں فرد گویم | کہ موجِ آبِ سرشک، آسماں بجنباند

[نادراتِ غالب (۲)، ص ۶۸؛ سخن شعرا، ص ۴۳۱؛
ذکرِ غالب، ص ۱۳۵-۱۳۷؛ روزِ روشن، ص ۴۲۱؛
خم خانۂ جاوید (۵) ۵۰۹-۵۱۷؛ گلدستۂ نازنیناں،
ص ۲۲۲-۲۴۴۔]

عاشق ـــــــ ماسٹر شنکر دیال اکبر آبادی

ان کے والد گردھاری لال بن چھبیلے رام بن خوشحال رائے تھے۔ خاندان کے مورث موضع سانڈی کے رؤسا میں شمار ہوتے تھے۔ یہ خاندان شروع میں شاہانِ اودھ کی ملازمت سے سرفراز رہا۔ حکومتِ اودھ کی طرف سے اُنھیں "رائے زادہ" کا خطاب ملا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں بعض خدمات کے عوض میں سرکارِ انگریزی کی طرف سے بھی "بہی خواہِ گورنمنٹ" کا خطاب عطا ہوا۔ اُسی زمانے میں آپ کے جدِ اعلیٰ ترکِ وطن کر کے ہاز نگر (ضلع ایٹہ) میں مقیم ہو گئے۔ عاشق کے خُسر بزرگوار دیوان ہر چرن لال تھے۔ دیوان صاحب موصوف کے اجداد بھی سرکارِ اودھ میں ممتاز عہدوں پر متمکن رہے اور دیوان کا خطاب حاصل کیا۔ یہ ۱۸۵۷ء کے زمانے کی خدمات کے انعام میں بدایوں کے تحصیلدار مقرر ہوئے

تھے۔ منشی گنگا پرشاد آگرہ ہائی کورٹ کے مشہور وکیل، عاشق کے بہنوئی تھے۔

عاشق کی رسمی تعلیم بہت اچھی تھی۔ انگریزی اور فارسی دونوں زبانوں میں کلکتہ یونیورسٹی سے ایم۔ اے کی سند حاصل کی۔ وکالت میں بھی بی۔ ایل کی سند لی۔ آگرہ کے ممتاز امیر، آنریری مجسٹریٹ اور آگرہ کالج کے ٹرسٹی تھے۔ شہر کے کامیاب وکیلوں میں شمار تھا۔ ساری عمر فارسی میں کہا۔ اُردو پر توجہ نہ کی۔ ۷۰ برس کی عمر میں ۲۔ فروری ۱۸ء کو انتقال کیا جسمانی یادگار دو صاحبزادے بابو پربھو دیال اور بابو کرشن دیال چھوڑے۔ دونوں بفضلہ حیات ہیں۔ چھوٹے بابو کرشن دیال وکالت کرتے ہیں۔ بڑے بابو پربھو دیال عرف شام بابو شعر بھی کہتے ہیں۔ شام تخلص ہے۔ آگرے کے مشہور شاعر مولانا سید نثار علی شاہ نثار (متوفی ۲۷۔ اپریل ۱۹۲۱ء) کے شاگرد ہیں۔ مدتوں دکن میں حضور نظام دکن کے چھوٹے صاحبزادے شاہزادہ معظم جاہ شجیع کے مصاحب رہے۔ آج کل آگرے میں قیام ہے۔ افسوس عاشق کا کلام مہیا نہ ہو سکا۔ صرف ایک اردو کا شعر ملا ؂

پھر تمنا کو ہوا جوشش کہ اصرار کرے ۔۔۔ پھر تغافل نے نکالا نیا طرزِ انکار

[نہالستانِ نثار، ص ۲۲]

عاشق ـــــــ منشی محمد اقبال حسین دہلوی

منشی نور الدین احمد دہلوی کے فرزند ارجمند تھے۔ دہلی میں اجمیری دروازہ اور حوض قاضی کے درمیان شاہ تارا کی گلی میں سکونت تھی۔ ۱۸۵۰ء میں ریاست لوہارو میں ملازم ہو گئے تھے اور یہیں غالب سے رسم و راہ کا ذریعہ ہوا۔ اس کے بعد ۱۸۶۸ء میں ریاست بیکانیر میں چلے گئے اور آخر کار ۱۸۸۰ء میں ایجنٹ گورنر جنرل ریاست ہائے راجپوتانہ کے وکیل حاضر باش کے عہدے پر فائز ہو کر مدتوں اجمیر میں مقیم رہے۔

بڑے دلچسپ بزرگ تھے۔ لالہ سری رام مرحوم نے اِن کے جو حالات لکھے ہیں

ان سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اپنی قابلیت اور قادر الکلامی سے متعلق بہت کچھ غلط فہمی تھی۔ اُستادوں کی غزل پر غزل کہتے اور قافیے کا جواب قافیے سے دیتے چنانچہ داغ کے دیوانِ ثانی "آفتابِ داغ" کا جواب ترکی بہ ترکی اور قافیہ بہ قافیہ لکھا اور لطیفہ یہ کہ جہاں ایک جگہ داغ کے دیوان میں کتابت کی غلطی سے قافیہ غلط چھپ گیا ہے۔ آپ نے بھی اسی طرح اُسے غلط باندھ دیا ہے۔ اس دیوان کا نام افکارِ عاشق ہے۔ اس کے آخر میں امیر مینائی کے دیوان مراۃ الغیب کی ردیف الف کی غزلیات کا بھی قافیہ بہ قافیہ جواب شامل ہے۔ امیر مینائی نے ایک قصیدہ "مناظرۂ شانہ و آئینہ" کے نام سے لکھا تھا۔ عاشق نے انہی قافیوں میں "مناظرۂ زُلف و رُخ" کے نام سے نواب محبوب علی خاں، نظامِ دکن کی مدح میں قصیدہ لکھا ہے۔

بیان الحقائق کے مصنف کا بیان ہے کہ جن دنوں عاشق بیکانیر میں مقیم تھے، انھوں نے اپنے "دو مطبوعہ دیوان جو مرزا خاں داغ کے ہر دیوان اور ہر غزل کے ردیف وار جواب میں تصنیف کیے تھے۔ مولانا سید عبید اللہ فرحتی (مصنفِ کتاب کے والدِ بزرگوار) کے آگے بہ مُرادِ اصلاح کلام رکھ دیے۔ چنانچہ موصوف نے براندک توجہ بہت سے دا قع پر اصلاح پسندیدہ کی۔ جس کو مولوی اقبال مرحوم نے بہ منت و سپاس قبول کر کے لرزِ انطباعِ دادین کا تہیہ و اہتمام کیا۔"

عاشق کے دماغ میں سنک تو ضرور تھی اور اُن سے کوئی فعل بھی بعید نہیں۔ لیکن انھیں اپنی ہمہ دانی کا جو غرّہ اور اپنی شاعرانہ عظمت کا جو زعم تھا۔ اس کے پیشِ نظر یہ روایت صد درجہ مشکوک ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

عاشق نہایت زود گو اور نظم و نثر پر یکساں حاوی تھے۔ اُردو کے تین دیوان ادرِ عاشق، افکارِ عاشق، اعجازِ عاشق اور فارسی کا ایک ترانۂ عشق" (مشمول افکارِ عاشق) چھپے ہوئے موجود ہیں۔ زبان واقعی بہت صاف ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے:-

اچھا میں بُرا سہی ولیکن — تم اپنی کہو، تمھیں ہوا کیا

بے پردہ رہ گیا، عاشق کا یہ اچھا ہوا — در بدر، کوچہ بکوچہ، مدتوں سے خوار تھا

"اپنی صورت کو تو دیکھو تمھیں چاہیں کیوں کر" ہائے کس ناز سے کہتے ہیں وہ مجھ سے ہر دم

حضرتِ واعظ اُسے کچھ جا کے سمجھاتے نہیں کرتے ہیں مجھ کو ہی وعظ و پند، ناحق رات دن

مجھے یہ غم، کہ وہ پہلو میں کیوں دشمن کے بیٹھے ہیں انھیں غصّہ، کہ میری بزم میں یہ کس لیے آیا

عدو سے من کے میٹھے ہیں، وہ مجھ سے تن کے بیٹھے ہیں مقدر اپنا اپنا ہے، کسی کا کیا اجارہ ہے

سو بے حجابیاں ہیں تمہارے حجاب میں شوخی نے رخنے ڈال دیے ہیں حجاب میں

وہ گُل ہے خار، جس میں محبت کی بُو نہ ہو وہ دل ہے خاک، جس میں تری آرزو نہ ہو

دیتی ہے دم بہار کی آب و ہوا مجھے توبہ تو کر چکا ہوں، مگر کچھ کچھ اِن دنوں

تو بتوں کی بھی خدائی ہو چکی گر ہماری بندگی ہے نا قبول

[نگارستانِ سخن، ص ۳۶۰ - ۳۶۱ ؛ —
خم خانہ جاوید (۵) ص ۵۲۹ - ۵۳۲ ؛
بیان الحقائق، ص ۴۲ -]

عاشق —— محمد عاشق حسین خاں اکبر آبادی

محمد مشتاق حسین خاں کے بیٹے اور آگرے کے رہنے والے تھے ۔

آج نالے مرے ممنون اثر کرتے ہیں شور سُن کر وہ دریچے سے نظر کرتے ہیں

[سخن شعرا، ص ۳۱۸]

عاقل —— سید محمد سلطان دہلوی

بزرگوں کا وطن برسٹ (ضلع بارہ) تھا۔ لیکن نقلِ مکان کر کے دہلی میں آ رہے

تھے۔ چنانچہ عاقلؔ یہیں ۱۳۔ مئی ۱۸۵۴ء (۱۵۔ شعبان ۱۲۷۰ھ) کو پیدا ہوئے۔ نجیب الطرفین تھے۔ دادھیال اور ننھیال کے سلسلے نواب حامد علی خان بہادر اور نواب نجف علی خاں بہادر تک پہنچتے ہیں۔ فارسی میں منتہی تھے اور عربی صرف و نحو کے بھی چند رسالے دیکھے تھے۔

غالبؔ ۱۵۔ فروری ۱۸۶۹ء (۲۔ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ) کو فوت ہوئے ہیں۔ گویا اس وقت عاقلؔ کی عمرِ عزیز پندرہ برس سے زیادہ نہیں تھی۔ اتنی کم عمری میں انھوں نے غالبؔ سے کیا استفادہ کیا ہوگا۔ ممکن ہے چند ابتدائی غزلیں دکھائی ہوں۔ اگرچہ مرزا کی آخری ایام کی تندرستی کے پیشِ نظر یہ بھی محلِ نظر ہے۔

عاقلؔ عالمِ جوانی میں بنارس گئے۔ وہاں میر وزیر حسین پھکیت سفید پوش اپنے فن کے ماہر تھے۔ یہ اِن کے خالو بھی ہوتے تھے۔ عاقلؔ نے اُن سے پھکیتی سیکھی اور ان کی دخترِ بلند اختر کو اپنے حبالۂ عقد میں لائے۔ اسی زمانے میں صاحبِ عالم مرزا قادر بخش صابرؔ گورگانی سے مشورہ کرنے لگے جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد اکثر بنارس میں قیام فرما رہے تھے۔ صابرؔ کی قدرتِ کلام اور مہارتِ فن اور زبان دانی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ چنانچہ عاقلؔ نے اُن سے پورا فائدہ اٹھایا اور اتنی مشق بہم پہنچائی کہ خود استاد کو ان کی شاگردی پر ناز تھا۔

اُن دنوں حیدر آباد میں ہُن برس رہا تھا، عاقلؔ نے بھی قسمت آزمانے کو (۱۸۸۳ء) میں دکن کی راہ لی۔ صاحبِ استعداد ہونے کے علاوہ آدمی موقع شناس تھے۔ تھوڑے ہی عرصے میں اپنی لسانی اور جادو بیانی سے ہر مجلس میں نفوذ حاصل کیا۔ ایک اخبار ہزار داستان نکالنے لگے۔ پھر اس سے قطع تعلق کر کے ایک مطبع آصفی قائم کیا اور یہیں سے ۱۳۰۱ھ میں اخبار آصفی شائع کرنے لگے۔ تھوڑے دن بعد نواب اکرام یار جنگ بہادر خانخاناں کے کہنے سے مطبع اور اخبار کو خیر باد کہی اور اُن کے معتمدی کے عہدے پر مقرر ہو گئے۔ زیادہ مدت نہیں گذری تھی کہ نواب صاحب موصوف نے اپنے سابق معتمد مولوی علی حسن بلگرامی کو بحال کر دیا اور اب اِن کے

لیے ایک اور عہدہ تجویز ہوا۔ یہ اس سے مطمئن نہیں تھے۔ لیکن یکایک طاعون کا شکار ہو گئے اور صرف ۲۹ برس کی عمر میں ۱۴۔اگست ۱۸۹۱ء (۸۔محرم ۱۳۰۹ھ) کو داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ وصیت تک نہیں کر پائے۔ صرف ایک صاحبزادہ فرخ سلطان کامل تخلص یادگارِ جسمانی چھوڑا۔ حیدر آباد کے امرائے عاقل کی بڑی قدر دانی اور عزت افزائی کی تھی۔ اُن کی وفات کے بعد نواب نظام یار جنگ اور نواب بہرام جنگ نے ان کے بیٹے کی سرپرستی کی۔ موخر الذکر ہی کی توجہ سے عاقل کا دیوان بھی شائع ہوا۔ چند شعر ملاحظہ کیجیے :-

یہاں ہے ضبط مانع، صبر واں قفلِ دہاں ہوگا
ہمارا آپ کا انصاف، یاں ہوگا، نہ واں ہوگا

جب کہا میں نے، کہ کب آیئے گا
ہنس کے بولے، یونہی مر جایئے گا

چھیڑ کی حد ہے، چلو چپ بھی رہو
ہم جو چھیڑیں گے، تو گھبرایئے گا

نہ زندہ، نہ مردہ، نہ دنیا، نہ دیں کا
تجھے تو نے رکھا نہ ظالم کہیں کا!

تم نہیں غیر سہی، غیر نہیں، مرگ سہی
مدعا یہ، کہ کوئی جان کا خواہاں ہوتا

شرما کے منھ پھرانا، لڑانا نگاہ کا
ظالم! یہ سیدھی سی ہے ادا بانکپن میں کیا؟

کیوں آئینے پہ پیار کی پڑتی ہیں نگاہیں
ہو جائے نہ تم کو کہیں، اے جان! نظر آج

کہتا ہے کہ ہے حسنِ بتاں، قدرتِ اللہ
یہ شیخِ ریاکار، اِدھر ہے نہ اُدھر ہے

[محبوب الزمن (۲)، ص ۸۰۹۔۸۱۱؛
یادگارِ ضیغم، ص ۲۴۸۔۲۴۹؛
تزک محبوبیہ (۲) دفتر ہفتم، ص ۱۲۵۔۱۲۶؛
خم خانۂ جاوید (۵)، ص ۵۵۶۔۵۵۸؛]

عرشی ـــــــ سید احمد حسن قنوجی

ان کا سلسلۂ نسب ۴۳ واسطوں سے حضرت امام حسین علیہ السلام سے ملتا ہے۔ اس خاندان میں بہت برگزیدہ ہستیاں گذری ہیں۔ جن میں سے آٹھ یعنی امام حسینؑ، امام علی زین العابدین، امام محمدؑ باقر، امام جعفر صادق، امام موسیٰ کاظم، امام علی رضا، امام محمد تقی اور امام علی نقی علیہم السلام، ائمۂ اہلِ بیت اور زمرۂ اثنا عشر آلِ اطہار میں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ اور کتنے اہل اللہ اور صلحا اس خاندان میں ہوئے۔ مثلاً مخدوم جہانیاں جہاں گشت (۷۸۵ھ) اور سید جلال معروف بہ گل سرخ بھی ان کے بزرگوں میں سے تھے۔ خلافتِ عباسیہ کے زمانے میں اور بعد میں بھی بزرگوں کا وطن بغداد رہا۔ سب سے پہلے جو بزرگ بغداد چھوڑ کر بخارا گئے، وہ سید محمدؒ تھے، جو عرشی سے ۲۲ پشت اوپر ہیں۔ ان سے تیسری پشت میں سید ابو عبد اللہ حسین گل سرخ ہوئے۔ جو اپنے زمانے کے مشہور ولی اللہ تھے۔ یہ شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانی (۶۶۱ھ) کے خاص مرید تھے اور اس خاندان کے پہلے مورث ہیں جو ہندستان آئے۔ شیخ الاسلام کے ارشاد پر انھوں نے سرحدی علاقے میں اوچہ کے مقام پر سکونت اختیار کر لی اور ساری عمر خلقِ خدا کی رشد و ہدایت میں بسر کر دی۔ ان کے صاحبزادے سید احمدؒ کبیر تھے جن کے نام پر آج بھی جاہل لوگ گائے ذبح کیا کرتے ہیں۔ ان ہی سید احمد کبیر کے بڑے صاحبزادے حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت تھے جن کے حالات سے تذکروں کے صفحات روشن اور اہل اللہ کی محفلیں گرم ہیں۔

مخدوم جہانیاں کی چوتھی پشت میں جلال ثالث اوچہ سے نقلِ مکان کر کے دہلی آ گئے جس کا سبب بھائیوں کی باہمی کشمکش کے علاوہ بادشاہِ وقت بہلول لودھی کی ارادت بھی تھی، بادشاہ نے جاگیر میں آپ کو قنوج کی سرکار دے دی۔ جب سے یہ خاندان قنوج میں رہنے لگا۔ جب قنوج کا تعلق حکومتِ دہلی سے منقطع ہوا اور یہ علاقہ اودھ میں شامل ہو گیا تو اس خاندان کے بزرگوں نے "الناس علیٰ دین ملوکہم" کے مصداق مذہب امامیہ اختیار کر لیا اور پانچ پشت تک یہ لوگ شیعانِ علیؓ میں شامل رہے۔ آخر میں خاندان کے ایک فرد

سید عزیز اللہ شمالی ہند میں اسلامی سلطنت کے زوال اور تباہی سے متاثر ہو کر حیدر آباد دکن چلے گئے۔ وہاں اُن کی مناسب آؤ بھگت ہوئی۔ سید اولاد علی خاں انور جنگ ان ہی عزیز اللہ کے پوتے اور ہمارے صاحبِ تذکرہ عرشیؔ کے دادا تھے۔

سید اولاد علی خاں کو سرکار نظام سے نواب انور جنگ بہادر کا خطاب اور گول کنڈہ کی قلعہ داری عطا ہوئی۔ پانچ لاکھ سالانہ کی جاگیر ان کے خالصہ میں تھی۔ نواب انور جنگ نے اپنے پیچھے فرزندِ نرینہ صرف ایک سید اولاد حسن بخاری چھوڑے جو قنوج ہی میں رہتے تھے۔ وہ بخلاف اپنے والد اور دوسرے اعزہ کے اہلِ سُنت والجماعت کے مسلک پر قائم تھے اور اِسی وجہ سے اُنھوں نے حیدر آباد جا کر اپنے والد مرحوم نواب انور جنگ کے ترکے کا مطالبہ نہیں کیا کہ خدا معلوم یہ مال کسبِ حلال سے جمع ہوا ہے یا حرام سے۔ اگر وہ چاہتے تو منہ مانگا بیش قرار منصب اور جاہ و منالِ دُنیوی اُنھیں مل سکتا تھا۔

مولانا سید اولاد حسن (۱۸۰۵ء۔۱۸۳۸ء) عالمِ با عمل تھے۔ ابتدائی تعلیم مولوی عبدالباسط قنوجی سے حاصل کی۔ اور تکمیل دہلی میں جا کر شاہ عبدالعزیزؒ اور شاہ رفیع الدینؒ کی خدمت میں کی۔ یہاں سے علوم دینیہ، حدیث، تفسیر، فقہ کے حصول کے بعد حضرت سید احمدؒ بریلوی کے ہاتھ پر بیعت کر لی جب سید صاحب سرحد کی طرف گئے، تو یہ بھی اُن کے ہم رکاب تھے۔ آخر اپنے مُرشد سے اجازت اور سندِ خلافت لے کر یہ قنوج واپس آ گئے اور یہیں بقیہ عمر مخلوق کی ہدایت اور تعلیم میں گذار دی۔ ان کی شخصیت علم و عمل کے امتزاج کا عجیب و غریب نمونہ تھی۔ اُن کی تقریباً پندرہ تصنیفات دستیاب ہوئی ہیں جو سب کی سب مذہبی مسائل سے متعلق ہیں۔ کبھی کبھی شعر بھی کہتے اور حسنؔ تخلص کرتے تھے۔

سید اولاد حسن نے مفتی محمد عوض (ساکن بانس بریلی) کی صاحبزادی نجیب النساء بیگم سے نکاح کیا۔ اس عقد سے دو صاحبزادے۔ سید احمد حسن عرشیؔ اور سید صدیق حسن اور تین لڑکیاں ہوئیں۔ سید اولاد حسن ۱۸۳۸ء (۱۲۵۳ھ) میں فوت ہوئے "مات بخیر" تاریخِ وفات ہے۔ محلہ شیخ پورہ قنوج میں اپنے مکان کے متصل، اپنے موروثی باغ میں دفن ہوئے۔

سید احمد حسن عرشیؔ ۱۹ ار رمضان ۱۲۴۶ھ (۳ر مارچ ۱۸۳۱ء) کو پیدا ہوئے۔ سید صدیق حسن جو آگے چل کر "نواب والا جاہ، امیر الملک سید صدیق حسن خان بہادر" کہلائے ان سے ڈیڑھ برس چھوٹے تھے۔ عرشیؔ نے ابتدائی تعلیم قنوج میں حاصل کی۔ پھر بدایوں، کانپور، فرخ آباد، بریلی، علی گڈھ اور دہلی میں اساتذۂ وقت کی خدمت میں رہ کے تکمیل کی۔ علوم کتاب و سنت کی سند شیخ صالح عبد الغنی اور سید فاروقی مجددی اور مولانا سید عبد الغنی مدنی سے لی۔

کمالاتِ معنوی کے علاوہ فنونِ سپہ گری میں بھی طاق تھے۔ شہسواری، شمشیر زنی اور نشانہ بازی میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ گھوڑوں کی شناخت اور ہتھیاروں کے حسن و قبح پر بھی بڑی گہری نظر تھی اور ان کا معقول ذخیرہ جمع کر رکھا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں انھوں نے قنوج کے باشندوں کے جان و مال کی حفاظت میں بہت قابلِ تعریف کام کیا۔ شطرنج بھی خوب کھیلتے تھے۔

عرشیؔ نے دو تین بار حج کا قصد کیا، لیکن ان کی والدہ ماجدہ چاہتی تھیں کہ سب مل کر ایک ساتھ اس مقدس فریضے سے سبکدوش ہوتے۔ اس لیے یہ رکے رہے۔ مگر جب دیکھا کہ سب لوگوں کے لیے سفر کا سامان درست ہونے میں ابھی وقت لگے گا، تو زیارت بیت اللہ کے شوق میں ۱۸۶۰ء (۱۲۷۶ھ) میں اکیلے چل کھڑے ہوئے۔ بڑودہ پہنچ کے ایک ہم نام دوست حکیم سید احمد حسن فناؔ (شاگردِ غالب) کے مکان پر اترے (تذکرۂ علمائے ہند میں ہے کہ مولانا غلام حسین قنوجی کے مکان پر ٹھیرے تھے۔) ارادہ تھا کہ چندے آرام کر کے آگے روانہ ہو جائیں گے۔ اثنائے سفر میں خارش کی شکایت پیدا ہو گئی تھی، بڑودے پہنچ کر تپ اور اسہال کی شدید تکلیف بھی لاحق ہو گئی۔ اسی حالت میں بیس روز بیمار رہ کر روز جمعہ ۹ رجمادی الاولیٰ ۱۲۷۷ھ (۲۳ر نومبر ۱۸۶۰ء) کو واصلِ حق ہوئے۔ وہیں بڑودہ میں تکیہ ماتریہ میں مدفون ہیں۔ وفات کے وقت عمر تیس برس سے کچھ زیادہ تھی۔ لاولد فوت ہوئے۔

مولوی محمد عباس رفعتؔ نے قطعۂ تاریخ لکھا ے

عرشیِ عالی گہر احمد حسن — در طفیلِ مصطفےٰ مغفور باد
رخت بربست از جہاں سوے بہشت — زیرِ طوبیٰ ہم نشین حور باد
گفت رفعت از پے تاریخ او — "با امامِ المتقین محشور باد"

۱۲۷۷ھ

عرشی کو مطالعہ کتب اور پڑھنے لکھنے کے سوائے اور کوئی شغل نہیں تھا۔ بہت پُرگو اور زود نویس تھے۔ ایک ایک نشست میں طولانی قصیدے اور ہر طرح کی نظم لکھنے پر قادر تھے۔ اُردو، فارسی، عربی تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اس کے باوجود سچ تو یہ ہے کہ نسبتِ شاعری ان کے دُونِ مرتبہ ہے۔ وہ علم و فضل اور ظاہری اور باطنی خوبیوں کے باعث اپنے اقران و اماثل سے کہیں بڑھ کر تھے۔ افسوس کہ عمر نے وفا نہ کی۔ اگرچہ شروع میں چندے مولانا فیض احمد رسوا بدایونی سے بھی مشورہ کیا۔ لیکن یہ تعلق زیادہ دن قائم نہ رہا اور بعد میں اُردو اور فارسی دونوں میں غالب سے تلمذ اختیار کر لیا۔ ایک اُردو قصیدے میں یوں اعتراف کرتے ہیں ؎

مغلوب ہیں سب اہلِ جہاں میرے سخن سے — ہوں زلہ رُبا غالبِ اعجاز رقم کا

اُن کا کلام نظم و نثر، اُن کی وفات کے بعد، نواب والا جاہ نے جمع کر کے شائع کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک کتاب "شہابِ ثاقب" مذہبی مناظرہ قسم کی بھی موجود ہے۔ اُردو اور فارسی کا مختصر انتخاب ملاحظہ ہو۔ اُردو کی بہ نسبت فارسی میں رنگینی اور شوخی زیادہ ہے ؎

سحر جو میں نے کہا، ہو قصورِ شب کا معاف — تو ہنس کے بولے کہ "چل دور ہو، ہوا سو ہوا"
اے وضعِ احتیاط! یہ فصلِ بہار ہے — گلبانگِ شوق، زمزمہ خیزِ فغاں نہ ہو
اتنی ہی آرزو ہے ہمیں تجھ سے، اے فلک! — یہ اُن کی اک نہیں بھی نہ ہووے، جو ہاں نہ ہو
مجھے خوشی ہے ترے عشوہ ہاے پیہم کی — رہے نہ کوئی ستم عذرِ امتحاں کے لیے
کیا اک بات میں جامے سے باہر — شبِ وصل اس نے جب مجھ سے حیا کی
خود آرائی نہ چھوڑیں گے یہ کافر — خدائی یوں تو برحق ہے خدا کی

شعلۂ عشق وہ ہے جس سے زمانہ جل جائے   یوں تو پتھر کے بھی سینے میں شرر ہوتا ہے

اب فارسی کا نمونہ دیکھیے ؎

چو عاشق می شود معشوق، کار از چارہ می افتد   گریباں چاکئ گل را نباشد بخیہ گر پیدا

آبے نزند گریۂ من آتشِ دل را   فریاد کہ جانم ہمہ ایں چشمِ ترم سوخت

دردا کہ بسر منزلِ جاناں نرسیدیم   سرگرمئ شوق ایں ہمہ در رہگذرم سوخت

عرشی! چہ بلا سحر، در افسانہ دمیدی   آہنگِ سخن سنجئ تو بے شررم سوخت

گر اضطراب ندارم، ز آرمیدن نیست   شہیدِ عشق ترا، فرصتِ طپیدن نیست

کشم بزیرِ فلک، آہِ شعلہ زن تا چند   برنگِ شمع بفانوس سوختن تا چند

بیار بادہ، کہ آتش زنم بکعبہ و دیر   دماغِ وسوسۂ شیخ و برہمن تا چند

بیا کہ طرحِ جنونِ دگر براندازیم   قدم بہ پیروئ قیس و کوہکن تا چند

زخویشتن بدر آ ہمچو بوئے گل عرشی!

برنگِ بلبلِ شوریدہ در چمن تا چند

مژدہ اے دل! کہ دگر سلسلہ از پا افتاد   کارِ دیوانگیم باز بصحرا افتاد

دلِ دیوانۂ من طاقتِ زنجیر نداشت   کار با سلسلۂ زلفِ چلیپا افتاد

پیش ازیں کیں گنبدِ چرخِ مدور ساختند   حسن را فرماں روائے ہفت کشور ساختند

ہر شرارے، کز دلِ پر شورِ من، سر برکشید   قدسیاں بر آسماں بردند و اختر ساختند

گر دغدغۂ تہمتِ غماز نباشد   از یار نگاہِ غلط انداز نباشد

چشمِ تو بما یا سخنِ عشق سراید   از ضعف مگر طاقتِ گفتار ندارد

یارب! آرامشِ دل را از کجا می آرم   اندریں دشت کہ بانگِ جرسے می آید

وائے بے رحمئ صیادِ جفا کار کہ گفت   وہ چہ خوش نالہ زکنجِ قفسے می آید

عرشی، امروز کہ پیمانہ بکف می آئی   ہیچ بیمے بدلت از عسسے می آید؟

[آثارِ صدیقی حصۂ اول؛ شمعِ انجمن، ص ۳۲۲ - ۳۲۷؛ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۱۴۳، ۲ - ۲۵؛ حیاۃ العلماء، ص ۱۷۷؛ خمخانۂ جاوید (۵) ص ۵۷۹ -]

عزیز ——— مولانا محمد ولایت علی خاں صفی پوری

شیخ صدیقی، اولاد میں خواجہ عثمان ہارونی کی، جو پیر ہیں خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کے۔ یہ خاندان پہلے قنوج میں مقیم تھا۔ وہاں سے ملانواں (ضلع ہردوئی) میں منتقل ہوا۔ چونکہ ان کے بزرگ شاہانِ اودھ کے دربار میں دارالانشاء سے متعلق تھے، اس لیے لکھنؤ میں بھی قیام رہا۔ ان کے پردادا امین الانشاء رونق علی خاں، نواب سعادت علی خاں کے میر منشی تھے۔ دادا امیر الانشاء منشی ثابت علی خاں، غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر کے دربار میں میر منشی تھے اور والد منشی محمد یحییٰ علی خاں، محمد علی شاہ اور واجد علی شاہ کے دربار میں اسی عہدے پر سرفراز اور اخبار گشتی کے داروغہ رہے۔

عزیز اپنی ننھیال صفی پور میں ۸۔ مارچ ۱۸۴۳ء (۶۔ صفر ۱۲۵۹ھ) کو پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم فارسی اور عربی معقول ڈھنگ سے ہوئی۔ ان کے والد کی خواہش تھی کہ یہ بھی اپنا خاندانی پیشہ اختیار کر کے کسی ریاست سے وابستہ ہو جائیں۔ لیکن عزیز کی طبیعت نے اسے قبول نہ کیا۔

عزیز کا اپنے زمانے کے مشاہیرِ علم و فضل میں شمار ہوتا ہے۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں کلام موجود ہے۔ صرف فارسی میں غالب سے مشورہ تھا۔ چنانچہ ایک قطعہ میں لکھتے ہیں:۔

ممنون میں نہیں ہوں کسی کے کمال کا
شاگرد اس زباں[1] میں ہوں اُس ذوالجلال کا

ہاں نظمِ فارسی میں ہوں غالب سے مستفید
منت گذارِ لطف ہوں، دو تین سال کا

بھیجی تھی ایک نثرِ مطوّل بھی چار جزو
ہوں معتقد میں دونوں[2] میں ان کے کمال کا

لکھا کہ اس میں حکّ و تصرّف کی جا نہیں
ہرگز محل نہیں ہے کسی احتمال کا

پس نثر میں بھی مجھ کو تلمذ جو ہے، تو یہ
اس میں بھی معترف ہوں خدا کے نوال کا

یہاں جس نثر کی طرف اشارہ ہے، یہ اُنھوں نے منشی ارادت خاں عالمگیری کے

---

[1] اُردو
[2] یعنی نظم و نثر

پنج رقعہ کے جواب میں ۱۷۔۱۸ برس کی عمر میں پنج رقعہ ولایت کے عنوان سے لکھی تھی۔ اس کے علاوہ مرزا رجب علی بیگ سرور کے مشہورِ زمانہ فسانۂ عجائب کو فارسی نظم میں ترجمہ کیا۔

شروع میں تخلص ولایت تھا۔ لیکن جب حضرت شاہ مخدوم خادم صفیؒ کے ہاتھ پر بیعت کی تو انھوں نے نام بدل کے محمد عزیز اللہ شاہ اور تخلص عزیز کر دیا۔

فارسی میں چار دیوان تھے۔ دیوانِ ولایت، دیوانِ عزیز، نورِ تجلی، نعتِ محبوب، ان کے علاوہ مراۃ الصنائع (قصیدہ نعتیہ)، اعجاز التواریخ و بیان التواریخ، مثنوی ذکرِ جمیل، حسرتِ دل (نعت)، خیر خیبر، اعجازِ محمدی، فتحِ مبیں وغیرہ۔

اُردو میں بھی تین دیوان (طورِ تجلی، نورِ ولایت، نظمِ دلفریب) موجود ہیں۔ ان کے علاوہ فارسی اور اُردو نثر میں بھی مختلف چیزیں لکھی ہیں۔ اُن میں سے ایک "پیشکش شاہجہانی" میں جو والیہ بھوپال نواب شاہجہاں بیگم کے حضور میں پیش کی تھی، یہ التزام کیا ہے کہ خالص پارسی میں لکھی ہے۔ غرض کہ آخری دور میں فارسی کے زبردست عالم، شاعر اور انشا پرداز تھے۔ افسوس کہ اُن کی کما حقہٗ قدر نہیں ہوئی۔ ۲۔ جولائی ۱۹۲۸ء (۱۳۔ محرم ۱۳۴۷ھ) کو صفی پور میں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئے۔

اے ہمہ حیرت ز تو دیدۂ بینائے ما
صورتِ معنی نما، روئے دل آرائے ما

رحمتِ حق بہرِ ماست، گر یہ ولایت با حیاست
روضۂ رضواں بود، بعدِ فنا جائے ما

ہر شب فروغِ بزمِ تو از ماست بجز شمع
سوز و گداز دل ہمہ آمد بکارِ ما

ہر چند کہ آگاہم، شوریدہ و گم راہم
در جوشِ انا اللّٰہم، دیوانہ چنیں باید

چوں شمع برافروزد، شب تا بسحر سوزد
گریاں بہ گداز آید، پروانہ چنیں باید

صد دیر و حرم جوشد، از ہر در و دیوارش
در مشربِ ما رنداں میخانہ چنیں باید

یا کہ بہ پیری جواں بگردانیم
تواں بہ کالبدِ ناتواں بگردانیم

یا کہ گوش بر آوازِ او نہیم، عزیز
رُخ از موذن و دل از اذاں بگردانیم

بہ ہزار رنگ مے بوست، بلبلِ زار محوِ دوست
شاہدِ لالہ رُو کجاست، ترکِ ستم شعار کو

چہ بہ تیغِ یک نظر، می فگنی ہزار سر
ہمچو ولایت، اے صنم! کشتۂ دل فگار کو

شرابِ عشق در پیمانہ کردی | بیک پیمانہ ام مستانہ کردی
بیک غمزہ مرا از خود ربودی | بیک عشوہ مرا دیوانہ کردی
بہ افسونِ نظر دادی فریبم | برسوائی مرا افسانہ کردی
بہ محفل شمع گشتی، گُل بہ گلشن | ستم بر بلبل و پروانہ کردی
مرو سوئے حرم اکنوں، ولایت! | کہ عمرے خدمتِ بت خانہ کردی

اُردو کلام کا رنگ یہ ہے:۔

بُلا کے بات بھی کی اور مُسکرا بھی دیا | کیا شہید بھی قاتل نے، خوں بہا بھی دیا
سنبھلتے حضرتِ موسیٰ، مگر ستم یہ ہوا | دکھا کے جلوۂ دیدار، کچھ سنا بھی دیا

حلق پر خنجر چلا، اور تھم رہا | جان دینے پر بھی اس کا غم رہا
ہم نے اک عالم کو چھوڑا، عشق میں | لیکن اُن کا اور ہی عالم رہا
جان دی میں نے تو پائی مر کے جان | دم میں جب تک دم رہا، بے دم رہا
کعبہ کیسا! سجدہ کیا! کیسی نماز! | عمر بھر سر اُن کے در پر خم رہا

اُلفتِ زندگی نہیں جاتی | جان بے عشق دی نہیں جاتی
جائے گی ایک دن فراق میں جان | کیا ہوا گر ابھی نہیں جاتی
جان جائے تو آرزو جائے | یہ بلا جیتے جی نہیں جاتی
ہوش جاتے ہیں، جب وہ آتے ہیں | دل کی حالت کبھی نہیں جاتی
کیا کہوں، طرفہ ماجرا ہے، عزیزؔ! | دل گیا، بے خودی نہیں جاتی

ناتوانی سے نہیں اُٹھتے ہیں پاؤں | دست گیری کر کرم سے ہم رہا!
کون جانے حال اُس محبوب کا | خلوتِ ادنیٰ میں جو محرم رہا
پیری آئی، جاگ، توبہ کر، عزیزؔ! | اب تو جینے کا زمانہ کم رہا

[زمانہ (کانپور) اکتوبر ۱۹۲۷ء، ص ۱۷۹-۱۸۶؛
دیباچۂ عرفانِ عزیز (دیوان)]

عزیزؔ ——— میرزا یوسف علی خاں بنارسی ثم دہلوی

بزرگوں کا وطن بنارس تھا۔ ان کے والد میرزا نجف علی خاں جنوںؔ (خلف میرزا محمد علی خاں دیوانہ بنارسی) تھے۔ جنوںؔ بنارس چھوڑ کے علی گڑھ میں آ رہے تھے اور وہاں کچھ جایداد بھی پیدا کر لی تھی۔ وہ مدتوں دہلی کے اطراف میں سر رشتہ داری اور تحصیلداری کے عہدوں پر مقرر رہے۔ جب جنوری ۱۸۵۴ء میں اُن کا انتقال ہو گیا تو عزیز اُن کے وارث ہوئے۔ لیکن یوں معلوم ہوتا ہے کہ اپنی ناتجربہ کاری یا کسی اور وجہ سے یہ ساری جایداد کھو بیٹھے اور بہت جلد انھیں روزی کی فکر لاحق ہو گئی۔ آخر دہلی پہنچے اور یہاں کوشش کرنے لگے۔ بے کاری کے ایام میں غالبؔ نے ان کا کچھ ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا اور اپنے دوستوں کو بھی کہہ کے اِن کی ملازمت کی کوشش کرتے رہے۔ چندے بلّی ماران کے ایک ہندو رئیس کے لڑکوں کو پڑھانے کا شغل بھی رہا۔

مرثیہ گوئی اور سوز خوانی دونوں کا بہت شوق تھا اور ان میں اچھی دستگاہ تھی۔ اسی واسطے غالبؔ انھیں قلعہ میں لے گئے اور احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خاں بہادر، مدار المہام شاہی نے انھیں ابو ظفر بہادر شاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ وہاں سے انھیں خلعتِ چار پارچہ اور گوشوارہ عطا ہوئے "سراج الشعراء سراج الذاکرین" خطاب ملا اور تیس روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر ہو گیا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جب وظیفہ بند ہو گیا، تو محض مدرسی ذریعۂ معاش رہ گئی۔

طبیعت میں مزاق تھا اور اپنی زبان دانی کا بھی بہت خیال تھا چنانچہ انیسؔ اور دبیرؔ تک کے کلام پر اصلاح دینے سے نہیں چوکے۔ آخر عمر میں تلاشِ روزگار میں بھوپال گئے اور وہیں ۱۸۷۲ء (۱۲۸۹ھ) میں راہیٔ ملکِ عدم ہوئے۔ غالبؔ کی وفات کے بعد سیف الحق ادیبؔ نے چندے انہی سے اصلاح لی تھی اور یہ ایک شاگرد ہی استاد کا نام زندہ رکھنے کو کافی ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

بدطالعی سے نیک نہ ہوگا مآلِ کار ۔۔۔ بگڑی میں کوئی کام بنایا نہ جائے گا

ناصح کی، ناتوانی میں ہم سن کے کیا کریں — سر اُن کے آستاں سے اُٹھایا نہ جائے گا
ہم یہ، کہ اپنی مرگ کو، تم بن طلب کریں — تم وہ، کہ ہم کو تم سے بلایا نہ جائے گا
بندہ نہیں بندہ، بتِ بے شرم و حیا کا — اُمّت میں محمدؐ کے ہے، بندہ ہے خدا کا
کیا کہوں، کوچۂ قاتل میں کیا کیا، جا کر — ہم نشیں! خاک میں ملنا تھا مجھے، مل آیا
اب خاکِ گل رخوں سے کروں ارتباطِ عشق — وہ دل نہیں، دماغ نہیں، وہ جگر نہیں
نے تو رفو کی جا ہے، نہ مرہم کا ہے مقام — کوئی علاجِ زخمِ دل، اے بخیہ گر! نہیں
باغ میں سن کر غزل خوانی مری — بلبلِ شیدا ہے دیوانی مری
ہو گئے شوقِ کوئے یار میں خاک — یہ نہ دیکھا، ہوا کدھر کی ہے

[گلستانِ سخن، ص ۳۶۵ - ۳۶۶؛ اُردوئے معلیٰ،
ص ۳۲ - ۳۳؛ نادراتِ غالب (۲) ص ۵۰، ۵۱؛
خم خانۂ جاوید (۵) ص ۵۸۷ - ۵۸۸؛
گلستانِ بے خزاں، ص ۱۶۸ - ۱۶۹۔]

عطاؔ ــــــ شیخ عطا حسین مارہروی

حضرت خواجہ حسن ملتانیؒ سے دسویں پشت میں حکیم نجف علی مارہروی (خلف اشرف علی) کے صاحبزادے تھے۔ معلمی پیشہ تھا۔ مرزا غالب ایک خط میں چودھری عبدالغفور سرور مارہروی کو لکھتے ہیں:-

> صاحب! یہ مثنوی تو میرے واسطے ایک مرثیہ ہو گئی۔ ہے ہے، اس بزرگوار کے جگر میں کیا کیا گھاؤ پڑے ہوں گے، تب یہ تراوشِ خونابہ ظہور میں آئی ہوگی۔ مزا یہ ہے کہ عنوانِ بیان سے حق بجانب انھیں کے معلوم ہوتا ہے۔ چونکہ اصل کار میری نظر میں نہیں، اور حقیقتِ حال مجھ پر مجہول ہے، اس واسطے انجام و آغاز، اندازہ و انداز کچھ نہیں سمجھا۔

حک و اصلاح کو آپ بنظرِ اصلاح ملاحظہ فرمائیں۔ میں نے بحسبِ دستور ہر جگہ منشاءِ اصلاح لکھ دیا ہے۔ شیخ صاحب سے میرا سلام کہیے گا اور کہیے گا کہ کیا کروں، دور ہوں، معذور ہوں، مدد نہیں کر سکتا۔ اعانت کے مراسم تقدیم کو نہیں پہنچا سکتا۔ خدا تمہارا نگہبان رہے۔ والسّلام (اُردوے معلیٰ، ص ۹۸)

یہاں جس مثنوی کی طرف اشارہ ہے اور جس پر غالب نے اصلاح دی تھی۔ وہ ان ہی عطا کی لکھی ہوئی تھی۔ اس کا نام "شکایتِ سعایت" ہے۔ یہ ۱۲۷۱ھ میں لکھی گئی تھی۔ اس میں بعض لوگوں کی نمامی اور سازشوں کا ذکر ہے جنہوں نے اُن کے خلاف کارروائی کی تھی۔ چونکہ غالب سے اس مثنوی پر اصلاح لی تھی۔ اس لیے میں نے انہیں تلامذہ میں شامل کر لیا ہے۔

عطا کی فارسی کی استعداد بھی بہت اچھی تھی۔ نہایت خوش مزاج اور بذلہ سنج تھے۔ نوجوان اکلوتے صاحبزادے کی جوانا مرگی نے اُن کی کمر توڑ دی۔ ایامِ زندگانی تلخ ہو گئے۔ اسی حال میں ۲۲- نومبر ۱۸۷۹ء (۷- ذی الحجہ ۱۲۹۶ھ) کو انتقال کیا۔

کہیں جو شیشۂ مے ساقیا ذرا ٹوٹا — تو جانیو کہ مرا دل ہزار جا ٹوٹا
مصاحب آئینہ ٹھہرا ہے، اُس خود آرا کا — اب اپنی دید کا بھی اُس کا آسرا ٹوٹا
کسی کا بال بھی ٹوٹے، تو سانس لیتا ہے — یہ میرا شیشۂ دل تھا، کہ بے صدا ٹوٹا
مری شکستہ دلی کی دلیل ہے یہ، عطاؔ! — کہ ہے ردیفِ غزل میں بھی جابجا ٹوٹا

[المشاہیر، ص ۲۳۶-۲۳۹؛ نیز، ص ۲۸۰]

علائیؔ ـــــ نواب علاؤالدین احمد خاں بہادر والیٔ لوہارو

ان کے خاندان کا مفصّل حال نیّرِ رخشاںؔ کے ترجمے میں لکھا گیا ہے۔ نواب احمد بخش خاں بہادر کے تین صاحبزادے تھے۔ اُنھوں نے اپنی زندگی ہی میں اپنی جایداد کی تقسیم یوں کی تھی، کہ اُن کے بعد فیروزپور جھرکہ سب سے بڑے شمس الدین احمد خاں کو ملے اور لوہارو دونوں

چھوٹے لڑکوں ــــــ امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں کے حصے میں آئے۔ نواب احمد بخش خاں کی وفات (اکتوبر ۱۸۲۷ء) کے بعد بھائیوں میں آپس میں اختلاف پیدا ہو گیا اور شمس الدین احمد خاں نے چاہا کہ کسی طرح لوہارو بھی مجھے مل جائے۔ بہر حال بہت کچھ مناقشے کے بعد لوہارو انہی دونوں بھائیوں کے پاس رہا۔ بعد میں سرکارِ انگریزی نے لوہارو پر نواب امین الدین احمد خاں کا قبضہ بلا شرکت غیرے تسلیم کر لیا۔ اور چھوٹے بھائی نواب ضیاء الدین احمد خاں کے لیے ریاست کے خزانے سے سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔

امین الدین احمد خاں ۱۲۲۹ھ (خندہ از لطفِ الہیٰ زد بہنگامِ سحر یعنی ۱۸۱۴ء (دولت و اقبال و بخت و سال ایں باد اجواں) میں فیروز پور جھرکہ میں پیدا ہوئے۔ اُن کی وفات بروز جمعہ ۳۱۔ دسمبر ۱۸۶۹ء (۲۷۔ رمضان ۱۲۸۶ھ) نصف شب کو ہوئی۔ وفات کی تاریخ آیتِ قرآنی "سُبحٰنَ الّذی اسریٰ بعبدہٖ لیلاً" سے نکلتی ہے۔ قطب صاحب میں نواب علاء الدین احمد خاں کی ہڑوار میں دفن ہوئے۔ لوح پر کندہ تھا: "مدفن امین الدین احمد خان بہادر" (۱۲۸۶ھ)۔

نواب امین الدین احمد خاں کا نکاح نواب غضنفر الدولہ محمد وزیر بیگ عرف مینڈھو خاں رسالدارِ سلطنتِ اودھ کی صاحبزادی ولی النساء بیگم سے ہوا تھا۔ اس بیگم سے علاء الدین احمد خاں ۲۵۔ اپریل ۱۸۳۲ء (۴۔ ذی الحجہ ۱۲۴۸ھ) کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم شروع سے غالب کی نگرانی میں ہوئی۔ اور میرزا انھیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ فارسی، ترکی اور عربی کی استعداد عالمانہ تھی۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ فارسی سے اُردو کی بہ نسبت زیادہ مزاولت اور شغف تھا چنانچہ فارسی میں کلام بھی زیادہ ہے۔ غالب نے انھیں ایک سند میں اپنے بعد فارسی اور اُردو دونوں میں اپنا خلیفہ اور جانشین بھی مقرر کیا تھا۔ ناظم ہروی کا مشہور قطعہ ہے، جس میں عنصری سے لے کر جامی تک تمام سربر آوردہ شعراء کا ذکر ہے۔ اس کا آخری شعر ہے ؎

ز خسرو چو نوبت بہ جامی رسید | ز جامی سخن را تمامی رسید

غالب نے ایک شعر کا اضافہ کر کے اس سلسلے کو اپنے تک یوں منتہی کیا تھا ؎

زجامی بہ عرفی و طالب رسید　　ز عرفی و طالب بہ غالب رسید

علائی نے اِسی سندِ جانشینی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس پر اور اضافہ کیا اور کہا ؎

علائی چو بر جاے غالب نشست　　ورق بر درید و قلم در شکست

غرض کہ انھیں پڑھنے لکھنے کے سوائے اور کوئی مشغلہ نہیں تھا۔ لوہارو میں ایک چھاپہ خانہ بھی فخر المطابع کے نام سے قائم کیا تھا۔ جہاں سے علمی و ادبی کتابیں شائع کرتے رہے۔ ایک پندرہ روزہ اخبار بنام امیر الاخبار بھی یہیں سے چھپتا تھا۔

اس کے علاوہ شطرنج بھی خوب کھیلتے تھے۔ ریورنڈ وہٹلی صاحب جب دہلی میں آگئے تو انھوں نے شہر کے ان اصحاب سے راہ و رسم پیدا کی، جنھیں شطرنج سے دل چسپی تھی۔ چنانچہ یکم نومبر ۱۸۶۶ء کو ایک جلسہ ہوا۔ اس کے بعد ایک شطرنج سوسائٹی (یا جلسۂ شطرنج) کی بنا ڈالی گئی۔ فیصلہ ہوا کہ بلا ناغہ بروز دوشنبہ مغرب کے بعد سوسائٹی کا جلسہ ہوا کرے گا۔ یہ جلسے علائی کے مکان واقع بلی ماراں میں ہوا کرتے تھے۔ رات کے دس دس بجے تک یہ کھیل اور خوش گپیاں جاری رہتیں۔ دل چسپی سے خالی نہ ہوگا، اگر سوسائٹی کے عہدہ داروں کے نام یہاں لکھ دیے جائیں۔

شیخ وارث علی	پریذیڈنٹ	یعنی	میر مجلس
میرزا علاء الدین احمد خاں بہادر	سکرٹری	〃	منصرم
جناب ریورنڈ وہٹلی صاحب بہادر	ممبر	〃	رکن
جناب ہمت وایٹ صاحب بہادر	ممبر	〃	ایضاً
میرزا قربان علی بیگ خاں سالک	ممبر	〃	ایضاً
میرزا غلام حسن خاں محو	ممبر	〃	ایضاً
میرزا شمشاد علی بیگ خاں رضوانؔ	ممبر	〃	ایضاً

یہ جلسے بہت دنوں جاری رہے۔ اس سوسائٹی کی روداد اکمل الاخبار دہلی میں بھی چھپتی رہتی تھی اور انگریز ممبروں کے ذریعے سے کھیل کے نقشے یورپ بھی بھیجے جاتے تھے۔

آخری ایام میں امین الدین احمد خاں بہت بیمار رہنے لگے تھے بلکہ کچھ دماغ پر بھی اثر تھا۔ علائیؔ ۲۶ برس کی عمر میں اپنے والد کی حیات ہی میں لوہارو کی گدی پر بٹھا دیے گئے تھے۔ "ریاست خداداد" اس کی تاریخ ہے۔ ۱۵- اگست ۱۸۷۴ء کو لارڈ نارتھ بروک وائسرائے کے عہد میں البتہ پورے اختیارات اور خاندانی خطاب "فخر الدولہ، دلاور الملک، رستم جنگ" ملے۔ "خطاب خوب ملا" (۱۲۹۱ھ) اس کی تاریخ ہے۔ لیکن علمی سرگرمیوں اور دوسری مشغولیتوں کے باعث یہ ریاست کے کاروبار کی طرف پوری توجہ نہیں دے سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ معاملات روز بروز خراب ہوتے گئے۔ خرچ میں بھی اعتدال قائم نہ رہ سکا اور ریاست کی مالی حالت بہت سقیم ہو گئی۔ ۱۸۸۱ء میں ریاست پر ایک لاکھ سے زیادہ قرض تھا۔ آخرکار حکومت انگریزی نے مداخلت کی۔ جس پر انھیں انتظام ریاست سے دست بردار ہو کے فرخ نگر میں مقیم ہونا پڑا۔ اٹھارہ ہزار روپیہ سالانہ ان کا وظیفہ مقرر ہوا اور ریاست کا انتظام ان کے بڑے صاحبزادے سر امیر الدین احمد خاں (عرف فرخ مرزا) کے سپرد کر دیا گیا۔

علائیؔ کا نکاح نواب جلال الدین خاں (نبیرۂ نواب نجیب الدولہ) کی صاحبزادی شمس النساء بیگم سے ۱۸- فروری ۱۸۵۵ء (۳۰- جمادی الاول ۱۲۷۱ھ) کو نجیب آباد میں ہوا۔ اس بیوی سے ان کے پانچ بیٹے اور پانچ بیٹیاں ہوئیں۔ علائیؔ کی وفات بروز جمعہ ۳۱- اکتوبر ۱۸۸۴ء (۱۱- محرم ۱۳۰۲ھ) کو ہوئی۔ قطب صاحب ہی میں اپنے والد کے پہلو میں دفن ہوئے۔ امیرؔ مینائی نے تاریخ کہی۔

مزار سایۂ یزداں علاؤ الدین احمد خاں

- (اس میں واؤ مشدد ہونے کے سبب دو دفعہ شمار کی گئی ہے)

کلام کو مدون کرنے کی طرف کبھی توجہ ہی نہیں کی اور واقعہ یہ ہے کہ اپنے علم و فضل کے مقابلے میں کوئی قابلِ قدر علمی یادگار نہیں چھوڑی۔ قلمی بیاض سے کچھ کلام انتخاب کر کے ذیل میں درج کرتا ہوں۔

الطافِ حق کو وقتِ مصیبت تو یاد رکھ ہرگز نہ ہو بلا و عنا میں تو ناصبور

روتا ہے، وقتِ رنج و بلا بھول کیوں گیا ‏ ‏ آرام و عافیت وہ تمام عیش اور سرور
کُتّا بھی ڈرے اپنے خداوند کے کبھی ‏ ‏ دو چار پانچ فاقوں میں ہوتا نہیں ہے دور
بس شرم کر کہ تھوڑی سی زحمت میں ہائے ہائے ‏ ‏ کر یاد لطفِ سابقہ، اے بندۂ کفور

اللہ ری بے ثباتیِ عمرِ فنا پسند ‏ ‏ بجھتا ہے یہ چراغ پلک کی ہوا کے ساتھ
شکوہ ہے کیوں قبول میں، گر ہو مضایقہ ‏ ‏ آخر کسی کا نام تو لوں میں دعا کے ساتھ
درماں پذیر درد اگر ہے، تو خاک ہے ‏ ‏ دیں جاں کیوں نہ درد کے بدلے، دوا کے ساتھ

مشتِ خاکستر ہے وہ بُلبل، کہ گلشن میں نہیں ‏ ‏ داغ ہو وہ دل، کہ خوں کے ساتھ دامن میں نہیں

دنیا کی خیر و خوبی میں، لیل و نہار کو ‏ ‏ کب جانتی ہے خلق، کہ کیوں کر گذر گئے
راتیں جو تھیں تمام ہوئیں، ناے و نوش میں ‏ ‏ دن یوں کٹے، کہ گھر سے ادھر کو اُدھر گئے
جب عافیت کا قافیہ ہوتا ہے تنگ تر ‏ ‏ روتے ہیں ان دنوں کو، کہ ہے ہے کدھر گئے

آوارگانِ گل کدۂ آرزو! ‏ ‏ حاشا، اگر تمھیں سر سیر و فراغ ہے
رکھیو سنبھل کے پاؤں، جو بینا ہو چشمِ دل ‏ ‏ کیجو سمجھ کے کام جو روشن دماغ ہے
وہ گل جو آج ہے قدحِ موج خیز رنگ ‏ ‏ وہ لالہ جو کہ باغ کا چشم و چراغ ہے
ل چور ہو گا، سنگِ جفاے سپہر سے ‏ ‏ گویا کہ غم کدے کا شکستہ ایاغ ہے
ور لالہ، تُند بادِ حوادث سے خاک و خوں ‏ ‏ گویا دل و جگر کا کسی کے وہ داغ ہے
بس جا کہ تھا، ترانۂ بلبل نشاط خیز ‏ ‏ اس جا پہ آج دل شکن آوازِ زاغ ہے
فرِ و جاہ سے یہ کہو تم، علا تیا! ‏ ‏ کل ایک سطحِ خاک ہے جو آج باغ ہے

فارسی کلام یہ ہے:-

براہ بود پیش ازیں خود عیانِ ما ‏ ‏ برداشت پردہ گریہ ز رازِ نہانِ ما
ل بیں چگونہ زخویشش خبر دہیم ‏ ‏ کآتش بنامہ در زدہ سوزِ بیانِ ما
سوزش است رونقِ ما، چوں نہالِ شمع ‏ ‏ عینِ بہارِ ماست، ہمانا خزانِ ما
دجرس زنالہ سر نکنم بہ کوے دوست ‏ ‏ محتاجِ راہبر نشود کاروانِ ما
از خیتیم، کہ از تاب جاں دہیم ‏ ‏ بر شاخِ شعلہ بستہ فلک آشیانِ ما

تلخی دردِ ہجر، زبس در تنم نشست — زیں پس ہُما ہمی نخورد استخوانِ ما

لیلیٰ کند ملامتِ ما زاں سبب، کہ قیس — گم کردہ راہِ شوق، ز شورِ فغانِ ما

گوئی، کہ مجمر است علائیؔ! دلِ حزیں

ریزد شرارہ جائے سخن از زبانِ ما

روزے نشد، کہ اشک ز فرقم گذر نکرد — از سر گذشت و دامنِ افلاک تر نکرد

در مرگ، نیست بر سرِ من منت، از اجل — تیرِ تو کار کرد، دعائے سحر نکرد

تا سہل تر بمیرم و بسمل تپم بخاک — از غمزہ کُشت، لیک بسویم نظر نکرد

ہاں خدارا! زود تر گوئید با جانانِ من — کے رسی آخر؟ کہ جاں بر لب رسید اے جانِ من!

دعویِ الفت مکن، اے قیس! کاندر راہِ عشق — بر تو دشوار است تمکین، واں بود آسانِ من

نازم شبِ وصلِ صنم، مہ جلوہ جاناں در بغل — من گشتہ از خود بے خبر، اُو خفتہ آساں در بغل

زنّ وصد مشکِ ختن، چشمے و چندیں سحر و فن — روئے و گُل در آستیں، بوئے و بُستاں در بغل

رباعی

صدرہ بہ خطا ز مردِ معذوری بہ — صدرہ بہ عیوبِ دوست مستوری بہ

فتویٰ کہ ز پیرِ دل گرفتم، اینست — قربے کہ بہ عاقل بنود، دوری بہ

رباعی

اے چرخ! چرا ستیزہ با ما داری — دانم کہ غلط نہٗ، نہ بیجا داری

خواہی کہ دہی نقشِ وجودم بر باد — آرے، کہ مرا بہ ہر یکتا داری

[بیاضِ علائیؔ (قلمی)؛ اُردو، جولائی ۱۹۴۴ء

ص ۳۰۹ — ۳۲۸؛ بساطِ فرنگ۔]

فدا ——— صاحبزادہ محمد فدا علی خاں بہادر رام پوری

ان کے والد نواب محمد کاظم علی خاں بہادر والیِ رام پور نواب محمد سعید خاں کے چھوٹے صاحبزادے تھے، گویا فدا نواب فردوس مکان محمد یوسف علی خان بہادر ناظم کے بھتیجے ہوئے۔ یہ ۱۸۳۶ء (۱۲۵۲ھ) میں پیدا ہوئے۔ شروع میں چندے نواب مرزا خاں داغؔ[1] سے

---

[1] داغؔ۔ نواب مرزا خاں نام، نواب شمس الدین احمد خاں رئیس لوہارو کے بیٹے تھے۔ ۲۵۔ مئی ۱۸۳۱ء (۱۲۔ ذی الحجہ ۱۲۴۶ھ) کو بلی ماران دہلی میں پیدا ہوئے۔ جب ان کی والدہ وزیر بیگم عرف چھوٹی بیگم نے مرزا فخرو ولی عہد سے نکاح کر لیا اور نواب شوکت محل خطاب پایا تو یہ بھی اپنی والدہ کے ساتھ قلعہ معلےٰ میں اٹھ آئے۔ یہاں مرزا فخرو کے تعلق سے انھیں جملہ علوم و فنون بہترین اساتذہ سے حاصل کرنے کا موقع مل گیا۔ جب شاعری کا شوق ہوا تو پہلے غالباً عارف سے اصلاح لی۔ بعد میں ذوق کے شاگرد ہوئے۔ غدر کے بعد رام پور پہنچے۔ اور نواب خلد آشیاں کی زندگی بھر یہاں سے نہیں نکلے۔ جب وہ فوت ہوئے تو یہ ۱۸۸۶ء میں دہلی آئے۔ پھر مختلف مقامات کی سیر کرتے ہوئے ۱۸۸۸ء میں حیدرآباد پہنچے۔ قسمت یاور تھی۔ ۸۔۹ مہینے کی امیدواری کے بعد ۱۸۹۱ء میں نواب محبوب علی خاں بہادر آصف جاہ ششم نے نوازش کی۔ ساڑھے چار سو روپیہ مشاہرہ مقرر ہوا جو اضافے کے بعد ایک ہزار تک پہنچا۔ خود نظامِ دکن شاگرد ہوئے اور صلہ و ستائش کی کمی نہ رہی۔ ۱۳۱۱ھ میں "بلبلِ ہندوستان جہان استاد دبیر الدولہ فصیح الملک بہادر داغؔ دہلوی ناظم جنگ" خطاب عطا ہوا۔ وہیں حیدرآباد میں ۱۴ فروری ۱۹۰۵ء (۹۔ ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ) کو بعارضۂ فالج وفات پائی۔ یوسف صاحب شریف صاحب کی درگاہ میں دفن ہوئے "نواب مرزا داغؔ" سے تاریخ نکلتی ہے۔ چار دیوان اور ایک مثنوی فریادِ داغؔ یادگار ہیں۔ اکلوتا بیٹا مرزا احمد زندگی ہی میں داغ دے گیا تھا۔ ایک لڑکی لاڈلی بیگم کو گود لے لیا تھا۔ داغؔ کی بیوی تین بہنیں تھیں۔ فاطمہ بیگم، داغؔ کی بیوی۔ دوسری اولیا بیگم یہ میرٹھ میں نواب عبد القدوس صاحب سے بیاہی گئیں۔ اُن کے بطن سے کلثوم بیگم پیدا ہوئیں، جن کا عقد بھی میرٹھ کے ایک وکیل میر تصدق علی سے ہوا۔ ان کی دو بیٹیاں تھیں اصغری بیگم، اور لاڈلی بیگم؛ یہی لاڈلی بیگم داغؔ کی لے پالک بیٹی ہیں جو نواب سائلؔ دہلوی کے عقد میں آئیں۔ تیسری بہن عزیز النسا بیگم تھیں جن کا نکاح ایک نومسلم انگریز محمد جان سے ہوا۔ (جان گل اصلی نام تھا) لاڈلی بیگم بفضلہٖ تعالیٰ ابھی تک حیات ہیں۔ آج کل لاہور میں قیام ہے۔

(خم خانۂ جاوید ج ۳، ص ۱۰۴-۱۳۴؛ داغؔ)

اصلاح لی۔ پھر غالبؔ سے فیض یاب ہوئے۔ ان کا ایک شعر ملا۔

یاد آتی ہے جب کاوشِ مژگاں مرے دل کو　　دیتا ہے تسلی ترا پیکاں مرے دل کو

[انتخاب یادگار (۲) ص ۲۸۲]

فگار ــــــ میر حسین دہلوی

یہ فقیر اللہ فقیر کے پوتے تھے، جو عہد شاہ عالم میں دربار سے وابستہ تھے اور اُردو کے علاوہ شاہ عالم کی طرح ہندی میں بھی دوہے اور گیت لکھتے تھے۔ فگار عاشق تن آدمی تھے۔ شیفتہ نے انھیں غالبؔ کا شاگرد لکھا ہے اور سخن شعرا میں وہ مومنؔ کے شاگرد بیان کیے گئے ہیں۔ ممکن ہے دونوں سے استفادہ کیا ہو۔ واللہ اعلم

دیکھ آئینہ کو اُس نے کیا اس لیے ٹکڑے　　یعنی مجھے کس واسطے مجھ سا نظر آیا

کرتا ہے غنچہ تیرے دہاں کی برابری　　شاید یہ اپنی بھول گیا ہے دہن کی بو

[گلشن بے خار، ص ۱۵۲؛ سخن شعرا، ص ۳۷۲؛

بزم سخن، ص ۹۲۔]

فنا و جمالی ــــــ حکیم سید احمد حسن سہسوانی

بزرگوں کا وطن سہسوان تھا، اور یہ نواب ابراہیم علی خاں وفا کے عزیزوں میں تھے۔ ان کے والد قاضی سید حسن صابی تھے۔ فنا کی ابتدائی تعلیم وطن میں ہوئی اور اس کی تکمیل دہلی میں کی۔ فارسی اور عربی کی تحصیل کے بعد طب حکیم ہاشم علی خاں موہانی سے بڑودہ جا کر پڑھی۔ اور ریاست میں ملازمت کا تعلق پیدا کر کے وہیں سکونت اختیار کر لی۔ بہت عالم بزرگوار تھے۔

ان کا کتب خانہ مختلف علوم کی کتابوں کا ذخیرہ تھا۔ بڑودہ ہی میں ۱۸۹۴ء (۱۳۱۰ھ) میں بعمر ۶۵ سال انتقال کیا۔ یادگار رجمانی ایک صاحبزادہ سید محمود حسین چھوڑا۔ یہ بھی شاعر تھے۔ افسر تخلص تھا۔ پہلے ظہیر دہلوی سے اور بعد میں ذاکر حسین یاس سے اصلاح لی۔ والد کی طرح طبابت پیشہ تھے۔

فنا، نواب ابراہیم علی وفا کے مصاحب اور ہم نشین تھے۔

تمہارے غم میں آخر دہج بنا، ہم نے فقیرانہ
اٹھایا شہر سے بستر، بسایا جا کے ویرانہ

کہا رو رو کے، میں نے شب، جو اپنے غم کا افسانہ
تجاہل دیکھیے کہتے ہیں، "تو کس کا ہے دیوانہ"

لپٹ جاتا ہے فرطِ شوق سے، کیا بے حجابانہ
فنا ہم دیکھ کر جلتے ہیں، وصلِ شمع و پروانہ

ہو سکے، تو کیجیے ڈھب آخری دیدار کا
لب تک آ پہنچا ہے دم اس ناتوان و زار کا

ہم ہی کچھ مرتے نہیں ہیں آپ کی اس چال پر
اک جہاں پامال ہے، اس نازکی رفتار کا

عاشقوں کا کوچۂ قاتل میں ہے یہ ازدحام
روز پہر امتحاں، ہوتا ہے خون دو چار کا

[حیرۃ العلماء، ص ۱۷، معاصر (ط)، ص ۱۳۸۔]

فوق ـــــــ ڈاکٹر میرزا محمد جان اکبر آبادی

میرزا شجاعت علی بیگ کے بیٹے تھے۔ اگرچہ رہنے والے اکبر آباد کے تھے لیکن نقل مکان کر کے میرٹھ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ڈاکٹری کا پیشہ ذریعہ معاش تھا۔ انگریزی حکومت میں ملازمت تھی۔ جہاں سے پنشن پائی۔ غالب کے علاوہ صہبائی سے بھی سلسلۂ تلمذ رکھتے تھے۔

لہ اس مضمون (غالب کے گجراتی احباب و تلامذہ) کے مصنف ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی نے ان کے دو تخلص تحریر فرمائے ہیں۔ فدا اور جمانی۔ جمانی کی سند تو انہیں سے ملی، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ فدا، فنا کی تصحیف ہے۔ خم خانہ جاوید (۲:۹۹۴) میں جہاں افسر (سید محمود حسین) کا نام ہے وہاں بھی صراحت سے ان کے والد کا نام سید احمد حسن فنا لکھا ہے۔

۱۳۰۲ھ میں زندہ تھے۔

سر پٹکتا ہوں ایک مدت سے — دارویے دردِ سر نہیں ملتی
صبح سے شام تک پۓ عشق اتنا — نبض دو دوپہر نہیں ملتی
دیکھتے وہ جو ہیں، کن انکھیوں سے — کیوں نظر سے نظر نہیں ملتی
وائے افسوس، نوجوانی پر — جب گئی عمر، پھر نہیں ملتی
ترکِ الفت ہی کیوں نہ کر دو فوقؔ — ہاں، طبیعت اگر نہیں ملتی

[یادگارِ ضیغم ۔ ص ۲۷۶]

قدرؔ ——— میر غلام حسنین بلگرامی

یہ زیدی سید تھے۔ حضرت زید، بیٹے تھے حضرت سجاد بن حضرت حسین علیہ السلام کے۔ قدرؔ کے والد سید خلف علی بن سید کرامت علی بلگرام (محلہ سلیپٹرہ) کے رہنے والے بڑے متقی اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ قدرؔ ۱۲۴۹ھ (۱۸۳۳ء) میں پیدا ہوئے۔ "غلام حسنین" تاریخی نام ہے، جو آپ کے چچا نے رکھا تھا۔

قدرؔ کی شادی قصبہ کوانھ (ضلع شاہ آباد) میں ہوئی، جو آرہ سے ۲۵-۳۰ میل کے فاصلے پر ہے۔ یہ شادی کے بعد بلگرام اور پھر وہاں سے لکھنؤ گئے اور وہاں سحرؔ کے شاگرد ہوئے اور ان ہی ایام میں مرزا فخر الدولہ برقؔ اور امداد علی بحرؔ سے عروض وغیرہ حاصل کیے۔ چنانچہ ایک رباعی میں اپنے چاروں استادوں کا ذکر کیا ہے ؎

سیکھے سحرؔ و برقؔ سے بندش کے بند — پھر غالبؔ و بحرؔ نے بتائے پیوند
مجھ سا بھی زمانے میں نہ ہوگا اے قدرؔ — "بدنام کنندۂ نکو نامے چند"

جب ہر طرف ہاتھ پاؤں مارنے کے بعد کہیں اور جگہ نہ ملی، تو سرکاری محکمۂ تعلیم میں ملازمت اختیار کر لی۔ پہلے ہردوئی میں مدرس رہے۔ پھر وہاں سے تبدیل ہو کر کیننگ کالج لکھنؤ

میں فارسی اور عربی کے استاد مقرر ہوئے اور بقیہ عمر یہیں بسر کردی۔ یوں ساری عمر مدرسی اور عسرت میں کٹی چنانچہ ایک مرتبہ بطور تفنن صفیر بلگرامی سے کہا کہ میری قسمت میں صرف مدرسہ پڑھانا لکھا ہے کیونکہ مدرس اور قدر کے عدد برابر برابر ہیں۔

جب ۱۳۰۰ھ (۱۸۸۲ء) میں نظام دکن کلکتہ کی نمائش دیکھنے آئے، تو نواب آغا مرزا سرور الملک بہادر کے ایما پر قدر نے ایک قصیدہ عزا لکھ کے حضور نظام میں گذرانا جس پر نظام دکن انھیں اپنے ساتھ حیدر آباد لے گئے۔ چار سو روپیہ ماہانہ مشاہرہ مقرر ہوا لیکن افسوس عید ہوئی ذوق دلے شام کو۔ یہ فارغ البالی انھیں راس نہ آئی۔ حیدر آباد پہنچتے ہی بہت بیمار ہو گئے۔ ضیق النفس اور ضعف معدہ کی پرانی شکایت تھی یہ عود کر آئی۔ جب طبیعت کسی طرح رو براہ نہ ہوئی۔ تو اسی سال کے اواخر میں علاج کے لیے لکھنؤ تشریف لائے۔ یہاں پہنچے، تو پہلو میں دنبل نکل آیا۔ اسی تکلیف میں بروز شنبہ ۱۴۔ ستمبر ۱۸۸۴ء (۲۳۔ ذی قعدہ ۱۳۰۱ھ) کی سہ پہر کو رہ گرائے عالم جاودانی ہوئے۔ لاولد فوت ہوئے۔ جب حضور نظام کو وفات کی خبر ملی، تو ریاست کی طرف سے اُن کی بیوہ کا ۲۰۰ روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر ہو گیا۔

کلیات (مفید عام آگرہ ۱۳۰۸ھ) کے علاوہ ایک مثنوی قضاوقدر بھی موجود ہے۔ قواعد العروض میں عروض وقوافی کے اصول بیان کیے ہیں۔ اس کا نام تاریخی ہے، جس سے ۱۲۸۸ھ برآمد ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ چند درسی رسالے اور بھی ہیں۔ مثلاً شرح مجموعہ نخن، شرح قصائد عرفی، نظم الارکان، ابیات گلستاں، مصطلحات اردو، عطر مجموعہ وغیرہ۔ بعض اور چیزیں بھی لکھی تھیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ حلیۂ طبع سے مزین نہیں ہوئیں۔ اب چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

نہیں جنت نہ سہی، خیر جہنم ہی سہی	اتنا تھوڑا ہے، مجھے تو کسی قابل سمجھا
اے قدر! ایسا آدمی اپنی پسند ہے	جو دل میں آیا کہہ دیا، جو کچھ کہا، کیا
قدردان مردہ پرستوں نے مجھے تڑپا دیا	غم یہی ہے میری شہرت جابجا تھی، میں نہ تھا
آنکھ سے دل تک جلوخانہ ہے اس کے حسن کا	یہ گلی دل چسپ ہے کیسی بسان کوے دوست
ہمارا نام بھی داخل ہے کب سے دفتر میں	کوئی نکالے تو مجنوں کے وقت کا کاغذ
دخل ہو جائے تو جانوں سچ ہے، اے دعدہ خلاف!	ورنہ یہ ہوں ہوں غلط، ہاں ہاں غلط، اچھا غلط

کوئی حکمت نہیں چلتی، خدا کے کارخانے میں — دھری رہتی ہے سب تدبیر جب تقدیر پھرتی ہے

وہ مجھے دیکھ کے ہنس دیتے ہیں — آنکھ چھپتی نہیں ہے یاری کی

ابھی تھا وصل کا اقرار، اور ابھی انکار — چلو ہٹو، انھیں باتوں سے قدر جلتے ہیں

تم اسی سمت کو جاؤ، تو خدا کو پاؤ — جس طرف لوگ بتائیں، کہ اِدھر کچھ بھی نہیں

تُو میرے بوسہ لینے پہ، اتنا خفا ہوا! — بوسہ بھی کوئی چیز ہے، تو سو بار لے

یہ عشق، یہ جوانی، کیا روگ لگ گیا ہے! — ہم بھی کبھی کہیں گے، ہم بھی کبھی جوان تھے

[جلوۂ خضر (۲) ص ۲۲۶ - ۲۳۶ ؛
تزکِ محبوبیہ (۲) دفتر ہفتم، ص ۱۴۲ - ۱۴۳]

کاشف ـــــ سیّد بدرالدین احمدؒ عرف فقیر صاحب دہلوی

کوکب ـــــ منشی محمد تفضل حسین خاں

اِن کے حالات نہیں ملے۔ البتہ 'فغانِ دہلی' کی تقریظ نوشتہ سالک سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ آدمی با استعداد اور صاحبِ علم تھے، اور مختلف علوم میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے خونیں ہنگامے کے بعد دہلی والوں نے ایک مشاعرہ کیا تھا، جس میں اس وقت کے بیشتر اساتذہ نے شہر کی تباہی کا رونا رویا تھا۔ ان سب منظومات کا مجموعہ کوکب نے مرتب کر کے فغانِ دہلی کے نام سے ۱۲۷۹ھ (۶۳-۱۸۶۲ء) میں اکمل المطابع سے شائع کیا تھا۔ اس مجموعے میں کوکب کی بھی ایک طرحی غزل ہے۔ اسی کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

مٹ گئے ہائے مکین اور مکانِ دہلی — نہ رہا نام کو بھی نام و نشانِ دہلی

اس کی ویرانی میں اک بات ہو دیکھو انکب | مٹ گئے پر بھی تو باقی رہی آنِ دہلی
جو مکیں رہ گئے بے گور و کفن مر مر کر | ڈھانچے پردہ گرے اُن کا مکانِ دہلی
غالب و ثاقب و سالک ہی نہیں ہیں غمگیں | کوکبِ خستہ بھی کرتا ہے فغانِ دہلی

[فغانِ دہلی، ص ۱۹۱-۱۹۲، ۲۰۵]

لطیف ——— شیخ لطیف احمد عثمانی

بلگرام کے مولوی زادوں میں سے تھے۔ ان کے والد کا نام کفایت اللہ تھا، اور دادا شیخ باد اللہ۔ بادؔ، میر غلام علی آزادؔ کے ہم عصر بتلائے جاتے ہیں۔ لطیفؔ نے عربی کی تحصیل لکھنؤ میں کی تھی اور فنِ مناظرہ سے بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی کے مرید تھے۔ ملازمت کے سلسلے میں کانپور میں بھی ایک مدت تک رہے۔

پہلے سرورؔ لکھنوی کے شاگرد تھے۔ پھر غالبؔ سے اصلاح لی۔ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی کہتے تھے۔ کلام میں صرف یہ اردو غزل ملی ہے:

جب تلک جان میں ہے جان، یہی دھیان رہے | دل رہے یا نہ رہے، یار کا ارمان رہے
یا خدا! موردِ جور اپنی سارا جہان رہے | دل میں اس بت کے نہ باقی کوئی ارمان رہے
حسن اور عشق کا اٹھ جائے کہیں جلد حجاب | پردہ لیلیٰ کا، نہ مجنوں کا گریبان رہے
یا الٰہی! وہ کسی دن تو ہوں محوِ دیدار | خود بھی حیران ہوں، آئینہ بھی حیران رہے
کس سے وعدہ کیا، کی رات کہاں جا کے بسر؟ | ہم تڑپتے رہے، تم غیر کے مہمان رہے
جی میں ہے ریت لوں، خود اپنے گلے پر خنجر | میری گردن پہ نہ جلاد کا احسان رہے
بھڑکے سینے میں مرے آتشِ موسیٰ، یا رب! | اور آنکھوں سے رواں نوح کا طوفان رہے
واہ کیا فہم! کہ بندے تو بتوں کے ہو، لطیفؔ! | اور خدا سے ہے مناجات، کہ ایمان رہے

[ہندستانی جلد (۳) ص ۴۸۱-۴۸۳]

مائلؔ ـــــــ میر عالم علی خاں سہسوانی

میر مودود بخش خاں کے صاحبزادے تھے۔ بزرگوں کا وطن سہسوان تھا۔ لیکن میر مودود بخش نقل مکان کرکے بڑودہ میں مقیم ہو گئے، وہاں کے عمائد میں شمار ہوتے تھے۔ ریاست میں بڑے عہدوں پر متمکن رہے اور سردار بہادر کا خطاب پایا۔ انگریزوں نے ان کی خدمات کے انعام میں خانی کا خطاب دیا۔ مائلؔ نے عین جوانی میں انتقال کیا۔ میر ابراہیم علی خاں وفاؔ ان کے عزیزوں میں تھے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

مائلؔ، ہے اب بھی جی میں ترے کچھ ہوس رہی؟ ۔۔۔ منھ رکھ کے میرے منھ پہ وہ کہتے ہیں، بیار ہے
سنا ہے ان کو غصّے میں لپٹ جانے کی عادت ہے ۔۔۔ خطا ثابت کریں گے اپنی ہم، اور ان کو چھیڑیں گے
کیا لطف ہے، کہ عین خزاں میں بہار ہے ۔۔۔ گل پوش بعدِ مرگ بھی، اپنا مزار ہے

[طور کلیم، ص ۸۸ ؛ بزم سخن، ص ۱۰۲]

مجروحؔ ـــــــ میر مہدی حسین دہلوی

میر حسین نگارؔ کے بیٹے اور دہلی کے رہنے والے تھے۔ ان کی پیدائش ۱۸۳۳ء کے لگ بھگ ہوئی۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں پانی پت چلے گئے تھے۔ جب فساد فرو ہوا، تو واپس دہلی چلے آئے لیکن "ہم نے یہ مانا رہے دلّی میں، پر کھائیں گے"
اب یہ وہ دہلی نہیں تھی جسے چھوڑ کے پانی پت گئے تھے۔ ناچار تلاشِ روزگار میں نکلے۔ بارے الور میں مہاراجہ شیو دھیان سنگھ قدر دانِ کمال داہلِ کمال موجود تھے۔ وہاں چند دن کے لئے ٹھکانا مل گیا۔ پہلے نائب تحصیلدار اور بعد میں تحصیلدار رہے۔ لیکن ان کی وفات کے بعد یہاں سے بھی نکلنا پڑا۔ پھر کچھ دن جے پور میں رہے۔ خوش قسمتی سے نواب حامد علی خاں بہادر والیِ رام پور نے قدر دانی کی اور اپنے پاس بلا لیا یوں ان

کے آخری ایام آرام سے گذر گئے۔ موت سے کچھ مدت پہلے بینائی بالکل جاتی رہی تھی۔
بروز جمعہ ۱۵۔ مئی ۱۹۰۳ء (۱۷۔ صفر ۱۳۲۱ھ) کو وفات پائی۔ اتفاق کی بات کہ وفات سے پہلے چند بار اغفرلی الٰہی کہا اور اسی حالت میں جان جان آفریں کے سپرد کردی یہی "اغفرلی" ان کی تاریخ وفات ہے۔ درگاہ قدم شریف دہلی کے صدر دروازے کے باہر فصیل کے متصل جنوب میں قبر ہے۔ لوحِ مزار پر نواب احمد سعید خاں طالب کا لکھا ہوا یہ قطعۂ تاریخ کندہ ہے ؎

یادگارِ غالبِ معجز بیاں	میر مہدی، سیدِ والا تبار
بُد کلامش سر بسر آہ و فغاں	چوں تخلص بود مجروحِ فگار
کرد از دنیا چو آہنگِ سفر	گفت "اغفرلی الٰہی" چند بار
طالبا دیگر مرنجاں فکر را	رازِ فوتش خود ز "اغفرلی" برار

۱۳۲۱ھ

اُستاد کے نہایت محبوب شاگردوں میں سے تھے۔ اُردوے معلےٰ اور عودِ ہندی میں بیسیوں خط ان کے نام ہیں۔ مرزا کی وفات پر جو مرثیہ لکھا تھا، وہ خاص پایے کی چیز ہے۔ میرن صاحب کی کوشش سے ۱۸۹۹ء میں اُن کا دیوان مظہر معانی کے نام سے پہلی بار چھپا تھا جس میں بیشتر غزلیں ہیں۔ اس کے علاوہ دو نثری رسالے بھی یادگار چھوڑے۔ ایک حضرت رسولِ کریم کے معجزات کے بیان میں انوار الاعجاز اور دوسرا ائمہ کے بیان میں ہدیۃ الائمہ۔ دونوں اب کم یاب ہیں۔ ایک تذکرہ بھی طلسم راز لکھا تھا، یہ بھی اب نایاب ہے۔ اس پر غالب نے جو تقریظ فارسی میں لکھی تھی وہ اُن کی کلیات نثر میں موجود ہے۔
مجروح کا کلام دلی کی صاف ستھری نکھری ہوئی زبان میں ہے۔ جس میں کوئی ایچ پیچ درگنجلک نہیں خصوصاً چھوٹی بحروں میں جو غزلیں لکھی ہیں وہ بہت دلآویز ہیں۔ اگرچہ وضوع اور طرزِ ادا وہی ہے جو اُن سے پہلے رائج تھا اور جدت بھی اُن کا طرۂ امتیاز نہیں لیکن اس کے باوجود اُن کے کلام کی سادگی اور پختگی دل نشیں ہے۔
کلام کا مختصر انتخاب درج کیا جاتا ہے ؎

نہ وہ نالوں کی شورش ہے، نہ غل ہے آہ وزاری کا — وہ اب پہلا سا ہنگامہ نہیں ہے بے قراری کا

طلب کیسی، بلانا کیا، وہاں خود جا پہنچتے ہیں — اگر عالم یہی چندے رہا، بے اختیاری کا

غیروں کو بھلا سمجھے اور مجھ کو برا جانا — مجھے بھی تو کیا سمجھے، جانا بھی تو کیا جانا

کچھ عرض تمنا میں، شکوہ نہ ستم کا تھا — میں نے تو کہا کیا تھا اور آپ نے کیا جانا

ہجر کے رنج، وصل کی راحت — لطف ہر ایک کا جدا دیکھا

جان بھی مفت میں گئی، مجروحؔ! — دل لگانے کا کچھ مزا دیکھا

بھولے بھولے سے جو رہتے ہو، کہو خیر تو ہے؟ — یہ تو کچھ عشق کا انداز ہے پایا جاتا

ایذائیں یہ پائی ہیں، مقدور اگر ہوتا — میں رسم تعشق کو دنیا سے اٹھا جاتا

اچھا ہوا، محفل میں مجروحؔ نہ کچھ بولا — وہ حال اگر کہتا، تو کس سے سنا جاتا

تو تو کچھ اور ہو گیا، مجروحؔ! — دل تو اٹکا نہیں کہیں؟ اے یار!

یہی انداز تو ہیں، دل کے اڑا لینے کے — ان کی تم نیچی نگاہوں پہ نہ جانا ہرگز

اس کا انجام کس نے دیکھا ہے! — جان جانا ہے، عشق کا آغاز

یونہی گذرا بہار کا یہ برس — ہم اسی طرح ہیں اسیر قفس

اس میں طول امل، ہزار ہزار — زندگی کا مدار ایک نفس

کیوں میری بود و باش کی پرسش ہے ہر گھڑی — تم تو کہو کہ رہتے ہو، دوپہر کہاں

کچھ کچھ چلن ہے حشر میں رفتار یار کا — ہے وہ بھی فتنہ خیز، مگر اس قدر کہاں

جوش وحشت میں مزا، کچھ سر و ساماں میں نہیں — اس گریباں کی کیا قدر، جو داماں میں نہیں

دل کو شاید تری مژگاں کا تصور نہ رہا — اب وہ پہلی سی کھٹک کاوش مژگاں میں نہیں

در و دیوار کو توڑا ہے، ترے وحشی نے — اب تو گھر میں وہ مزا ہے، جو بیاباں میں نہیں

دل کی بے چینیاں گئیں، نہ کہیں — اک کھٹک سی رہی کہیں نہ کہیں

مہر کیا چیز ہے؟ وفا کیسی؟ — یہ تو باتیں ہی اب رہیں نہ کہیں

بزم سے، کب ہیں چھوڑنے والے! — ہوں گے مجروحؔ، یاں کہیں نہ کہیں

یہ جو چپکے سے آئے بیٹھے ہیں — لاکھ فتنے اٹھائے بیٹھے ہیں

یہ بھی کچھ جی میں اگئی ہو گی — کیا وہ میرے بٹھائے بیٹھے ہیں

دل میں قوت، جگر میں تاب کہاں — اب وہ پہلا سا اضطراب کہاں

وہ سمائے ہوئے ہیں نظروں میں — اپنی آنکھوں میں جائے خواب کہاں

اس تغافل شعار کو ہمدم — خط تو لکھوں، مگر جواب کہاں

درِ مے خانہ یہ رہا، مجروح! — آپ جاتے ہیں، اے جناب، کہاں؟

جانا زبس ضرور تھا، اُس جلوہ گاہ میں — ہم دیر و کعبہ چھوڑ گئے دونوں راہ میں

اُس نے ملائی آنکھ، نہ گھر میں، نہ راہ میں، — کیا کیا سبک ہوا ہوں، عدو کی نگاہ میں

مجروح! کہیے، میں نہ ہنسوں بولوں، تا بہ کے — تم تو سدا رہو گے اسی آہ آہ میں

اس دل ہی نے، سب کام بگاڑے ہیں وگرنہ — وہ راہ پر آ جائے، اگر صبر کیا جائے

مجروح! میں خوش ہوتا ہوں یوں آپ میں ہو کر — اک کھوئی ہوئی چیز کو جیسے کوئی پا جائے

کسی سے عشق اپنا کیا چھپائیں — محبت ٹپکی پڑتی ہے نظر سے

کہاں کی پیروی، جب قصد یہ ہو — کہ آگے بڑھ کے چلیے راہبر سے

مری ٹوٹی ہوئی توبہ کے ٹکڑے — ق — کوئی لا دے درِ پیرِ مغاں سے

کہ اُن کو جوڑ کر میں توڑ ڈالوں — پھر اک جامِ شرابِ ارغواں سے

میں اس بےنگی سے خوش ہوں، مجروح! — کہ فارغ ہو گیا سود و زیاں سے

اک کام ہمارا ہے، کہ بن جائے تو بگڑے — اک غیر کا مطلب ہے، کہ بگڑے تو سنور جائے

اچھا ہے جو مجروح کو روکے کوئی اُٹھ کر — یہ جینے سے بیزار ہے، کیا جانے کدھر جائے

رہ کے مسجد میں کیا ہی گھبرایا — رات کاٹی خدا خدا کر کے

سب ہی کرتے ہیں محبت، پہ یہ شورش کیا ہے — رحم اے عشق! نہ کر جینے سے بیزار مجھے

دل میں مجروح کے کچھ درد ہوا ہے، شاید — آج تو اُس نے پکارا ہے کئی بار مجھے

[گلِ رعنا، ص ۴۳۱-۴۳۶؛ گلدستۂ مذاقِ سخن، مئی ۱۹۰۳ء]

محشر ـــــــ مرزا عبداللہ خاں رامپوری ثم دہلوی

فقیر منش اور دریا دل آدمی تھے۔ جو آتا لٹا دیتے، یا کسی کو دے ڈالتے۔ تاریخ میں مہارت تھی۔ افیون بلکہ شراب تک سے دلچسپی تھی۔

اصل میں ریختی کے شاعر تھے اور اس میں خانم تخلص کرتے تھے۔ اور پڑھتے بھی خوب بنا بنا کے تھے، ایسا کہ دیکھنے اور سننے سے تعلق رکھتا تھا۔ مدتوں شمالی ہند کے شہروں میں گھوما کیے اور آخر میں کلکتے گئے، جہاں عبدالغفور نساخ سے ملاقاتیں رہیں۔ نساخ لکھتے ہیں کہ ان میں یہ بہت بڑا عیب تھا کہ دوسروں کا کلام اپنے نام سے پڑھ دیتے تھے۔

ہجر میں تسکین دیتا ہیں، کہ سر کو پیٹتا ــــ ایک دل پر ہاتھ تھا میرا، جگر پر دوسرا
کہیں تم چھچلے ہیں، بھید کچھ ان سے نہ کہہ دینا ــــ مری اچھی بُوا، یہ مردوئے مطلب کے ہوتے ہیں

کیا بوے ہیں، یہ، جلے دل کے جلانے والے — اور یہ آگ ہیں، آگ آئے لگانے والے
ہاتھ باندھا کرو، مہندی نہ لگا ؤ گی کبھی — پاؤں پڑ پڑ کے، یہ ہیں رنگ جمانے والے
جاؤ گے ٹنڈیاں کسواکے، ذرا چھوٗ دیکھو — لوٹرے آئے مرے ہاتھ لگانے والے
کہنے سُننے میں کسی کے نہ تم آنا، خانم! — آگ پانی میں لگاتے ہیں لگانے والے

[سخن شعرا، ص ۴۲۰-۴۲۱؛ مقدمۂ دیوانِ جان صاحب، ص ۴۳-۴۵؛ مقدمۂ دیوانِ باقر، ص ۱۱۱-۱۱۴؛ تذکرۂ ریختی، ص ۳۷؛]

محمود ـــــــ منشی محمد حسین دہلوی

ان کی ایک مثنوی، تحفۂ محمود مطبوعہ موجود ہے، انہی کے خاتمے کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کنور سوچیت سنگھ صاحب بہادر اور جناب سردار بکرماں سنگھ صاحب بہادر

سی ایس آئی اہلووالیہ رئیس جالندھر کی جائداد اور ریاست کے ناظم تھے۔ یہ دونوں صاحبان کپورتھلہ ریاست کے حکمران مہاراجہ رندھیر سنگھ بہادر کے بھائی تھے۔

اس سے زیادہ محمود کے حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ ایک غزل کے چند شعر درج ہیں۔

خون گھٹا اپنا، نہ جوشِ ستمِ یار گھٹا — کند کیوں ہو کے دمِ خنجرِ خونخوار گھٹا

نطق میں ہے مرے، کیا فیضِ زبانِ منصور — دارِ مژگاں پہ انا الحق کا نہ اقرار گھٹا

یادِ گیسو میں جو دل اپنا اُمنڈ کر آیا — بن گئی آہ بھی اک رشکِ شبِ تار گھٹا

عینِ باراں میں جو ساقی نے دکھائیں آنکھیں — ہو گئی مے کے پیاسوں کی عزادار، گھٹا

داخلِ خلد ہوئے حضرتِ آدم، محمود! — پر شرر کینۂ ابلیس نہ زنہار گھٹا

[اکمل الاخبار ۳ : ۳۴-۲۵- اگست ۱۸۶۹ء]

محمود ——— حکیم مولوی محمد محمود الحق دہلوی

پرتاب گڑھ میں تحصیلدار تھے۔ ملازمت کے اختتام پر سرکارِ انگریزی سے پنشن پاتے رہے۔ عالم آدمی تھے اور طب میں بھی اچھی دستگاہ تھی۔ ۱۳۰۲ھ میں زندہ تھے۔

بنا ہے گریہ مری چشمِ خوں فشاں کے لیے — کبھی بہار کو روئے، کبھی خزاں کے لیے

بھی ہو اُلفتِ دل، دخترِ رزسے، اے ساقی! — شراب خانے میں جاتے نہیں مغاں کے لیے

فراقِ یار میں محمود کا وصال ہوا — تو ہم بھی روئے بہت مرگِ نوجواں کے لیے

[یادگارِ ضیغم، ص ۳۰۴]

محوؔ ــــــ نواب غلام حسن خاں دہلوی

نواب غلام حسین خاں مسرورؔ کا نکاح معروفؔ کی چھوٹی صاحبزادی بنیادی بیگم سے ہوا تھا لیکن میاں بیوی میں نبھ نہ سکی اور نا چاقی ہو گئی۔ چنانچہ اُن سے علیحدگی کے بعد اُنھوں نے ایک عورت سنگی بیگم سے نکاح کر لیا تھا۔ اس بیوی سے اُن کے چار صاحبزادے ہوئے۔ غلام حسن خاں محوؔ اُن میں سب سے بڑے تھے۔ اس طرح یہ گویا زین العابدین خاں عارفؔ کے علاتی بھائی ہوئے۔ انھیں سرکارِ انگریزی سے کچھ ماہانہ وظیفہ ملتا تھا۔ محوؔ نے ذوقؔ اور غالبؔ دونوں سے استفادہ کیا۔ شطرنج کا بھی شوق تھا۔ یہ بھی اس سوسائٹی کے رکن تھے جو جلسۂ شطرنج کے نام سے نواب علاؤالدین احمد خاں نے ۱۸۶۶ء میں قائم کی تھی۔

انھوں نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے متعلق ایک کتاب "نصرت نامۂ گورنمنٹ" کے نام سے لکھی تھی۔ اسی کا خلاصہ خواجہ حسن نظامی نے "غدر کا نتیجہ" کے عنوان سے چھاپا ہے۔

دل لگانے کا مزا دیکھ لیا آخر کار ۔۔۔ ہم نہ کہتے تھے کہ اے محوؔ! پشیماں ہوگا

قیدِ ہستی سے رہائی غیر ممکن تھی ہمیں ۔۔۔ آج دم دے کر اجل کو ہو گئے آزاد ہم

گھبرائے ہوئے پھرتے ہیں اب بام پہ وہ بھی ۔۔۔ اتنا تو ہوا ہے مرے نالوں کے اثر سے

اندازِ جنوں کون سا ہم میں نہیں، مجنوں! ۔۔۔ پر تیری طرح عشق کو رسوا نہیں کرتے

[غدر کا نتیجہ، ص ۶-۷؛ طورِ کلیم، ص ۱۰۴؛
سخن شعرا، ص ۴۲۲-۴۲۳]

مدہوشؔ ــــــ خان بہادر مولوی سخاوت حسین بدایونی

(خط قاضی غلام سجاد سبحانی بنام مولف)

مشتاق ــــــــ منشی بہاری لال دہلوی

خاندان کے کائستھ ماتھر تھے۔ والد کا نام رائے من بھاون لال تھا، جن کا انتقال فروری ۱۸۶۸ء میں ہوا۔ مشتاق ۱۸۳۵ء میں پیدا ہوئے۔ فارسی کی ابتدائی تعلیم مولوی امین الدین (مولف قاطع القاطع) سے حاصل کی اور غالباً شاعری شروع کرنے کے بعد کچھ دن تک اُن سے مشورہ بھی کرتے رہے۔ فن خوش نویسی میں بھی مہارت تھی اور اس میں مرزا عبید اللہ بیگ کے شاگرد تھے۔ حکیم محمود خاں اور حکیم غلام رضا خاں دونوں کی خدمت میں بھی آنا جانا تھا۔ اسی واسطے سے غالب کے پاس پہنچے۔

حکیم محمود خاں نے ایک اخبار ہفتہ وار اکمل الاخبار کے نام سے نکالا تھا۔ مشتاق اس میں کاتب اور ایڈیٹری کے فرائض سر انجام دیتے رہے۔ ۱۸۸۷ء میں یہاں سے علیحدہ ہوئے تو لالہ سری کرشن داس گڑوالے کے ہاں حساب کتاب رکھنے پر منشی مقرر ہو گئے۔ گڑوالے دہلی کا مشہور اور متمول کاروباری خاندان تھا۔ ۷۲-۷۳ برس کی عمر تھی جب ۱۹۰۸ء میں انتقال کیا۔

مشتاق کے نانا منشی گھنشام لال بھی اچھے خاصے شاعر تھے۔ عاصی تخلص تھا اور شاہ نصیر کے ممتاز شاگردوں میں اُن کا شمار ہوتا تھا۔ دہلی کا نستھ اُردو سبھا کی طرف سے اُن کا دیوان شائع ہو چکا ہے۔ اسی سبھا نے ۱۹۲۸ء میں مشتاق کے دیوان کا مختصر انتخاب بھی شائع کیا ہے۔ مشتاق کے چھوٹے بھائی منشی گوری شنکر قصیر تھے۔ اور بیٹے منشی چندو لال شفق۔ مشہور اخبار نویس منشی رام رچھپال سنگھ شیدا، ان ہی مشتاق کے شاگرد تھے۔

مشتاق نے غالب کی وفات کے بعد حالی سے بھی اصلاح لی۔ اُردو اور فارسی دونوں میں کہتے تھے۔

کھُل کر کہو، کہ تم نے کسے بے وفا کہا ــ میں بے وفا، کہ غیر! یہ چپکے سے کیا کہا

کر رہبر کا میں رہنما ہو گیا ــ اُٹھے شوق میں یوں قدم تیز تیز

کہنے کی بات ہے کہ کوئی راز داں نہ تھا ــ سب جانتے ہیں اُن کے اشاروں کو بزم میں

غیروں نے بیٹھنے نہ دیا جب کہیں مجھے
میں انجمن میں، منتظمِ انجمن ہوا!

تم ہو اپنی طرف کیے جاتے
ذکر کرتا ہوں میں زمانے کا

یہ کہنا اور یہ کہنا، یہ کہتے ہوئے ہم آپ
قاصد کے ساتھ ساتھ گئے تا بکوئے دوست

مشتاق لاکھ ضبط کرو، رازِ عشق کو
چہرے سے ہے تمہارے عیاں جستجوئے دوست

مدعا گر یہ ہے کچھ عشق کا اظہار نہیں
کیا کہوں تم سے، کہ کہنے میں دلِ زار نہیں

سب طرح سے تو وہ اچھے ہیں، پر اچھے کیا ہیں
اک یہی عیب ہے کیسا، کہ وفادار نہیں

یاں یہ منظور، کہ مطلب کو زباں پر لائیں
واں ہے انگشت لبوں پر، کہ خبردار نہیں

سچ تو یہ ہے، کہ ہے مشتاق عدو سے اچھا
ورنہ بندہ تو کسی کا بھی طرفدار نہیں

تو ساتھ ہو ہمارے، تو دوزخ بہشت ہے
گر تو نہیں، تو خلد جہنم سے کم نہیں

ساتھ مشتاق کے چلتے ہو، رفیقو! لیکن
دشتِ وحشت میں نہ کہنا، کہیں منزل آئے

تم اپنی تیزیِ رفتار دیکھو
نہ پوچھو کچھ مری عمرِ رواں کی

وہ میرے رازِ دل کو جانتے ہیں
نہیں مشتاق! کچھ حاجت بیاں کی

فارسی کا نمونہ یہ ہے:

رموزِ عشق را اسرارِ مے معشوق پرس از من
حدیثِ زہد و تقویٰ را نمی دانم، نمی دانم

غم مخور از حشر، پیش از مرگ را دیلا چرا
برامید بخشش حق، شاد باید زیستن

بدیں امید خود را خاک کردم
کہ خاکم گردِ صحرائے تو باشد

[دیباچۂ دیوانِ مشتاق]

مغلوب ـــــ سید افتخار الدین رام پوری

سید کفایت اللہ کے بیٹے تھے۔ ۱۸۶۵ء میں عین جوانی میں صرف ۲۸ برس کی عمر میں وفات پائی۔

غالب کے علاوہ میر احمد علی رسا[1] سے بھی اصلاح لی تھی۔

کون سے ناز کا مغلوب ہے بسمل، قاتل! ۔۔۔ جس کی ہچکی میں بھی آواز ہے "قاتل قاتل"

ایک مغلوب کا جھگڑا تھا، سو وہ مر ہی گیا ۔۔۔ جس سے جی چاہے ترا، اُس سے تو اب مل قاتل!

کس کے عارض کا تصور دلِ ناداں! ہے تجھے ۔۔۔ آئینہ کس نے دکھایا ہے، کہ حیرانی ہے

تم اگر ایک ہو صورت میں، تو وہ اُلفت میں ۔۔۔ تم جو یکتا ہو، تو مغلوب بھی لاثانی ہے

[انتخاب یادگار، ص ۳۴۵-۳۴۶]

مفتوںؔ ــــــ پنڈت لچھمی نرائن مشران فرخ آبادی

پنڈت گوردھن داس مشران کے صاحبزادے تھے اور فرخ آباد کے رؤسا میں شمار تھا۔ ان کے بزرگ کشمیر میں اعلیٰ عہدوں پر مامور رہے اور طوائف الملوکی کے زمانے میں وہاں سے نقلِ مکان کر کے ہندستان چلے آئے اور فرخ آباد میں سکونت اختیار کر لی۔ پنڈت گوردھن داس کلکٹری میں سررشتہ دار مال تھے۔ اُنھوں نے اپنی فرض شناسی اور حُسنِ کارکردگی سے بہت نیک نامی حاصل کی۔ ملازمت سے فارغ ہونے کے بعد تجارت کرتے رہے۔ اس میں بھی بہت کامیابی ہوئی۔ بہادر شاہ کی طرف سے اُنھیں "انتظام الدولہ، ممتاز الملک مہاراجہ گوردھن داس

---

[1] میر احمد علی رسا جناب سید امام الدین رام پوری کے صاحبزادے تھے۔ بزرگوں کا وطن بخارا تھا جہاں سے ان کے پردادا سید محمود علی ہندستان آئے۔ سلسلۂ نسب امام علی نقی سے ملتا ہے۔ نواب کلب علی خاں کے عہد میں ریاست سے تیس روپیہ ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ تاریخ میں اچھی مہارت تھی۔ نہایت وارستہ مزاج اور شوقین طبع شخص تھے۔ کلام پر شیخ علی بخش بیمار سے اصلاح لی، لیکن اپنی آزاد طبعی کے اقتضا سے دیوان مرتب نہیں کیا۔ ۱۴ اگست ۱۸۹۱ء (۷ محرم ۱۳۰۹ھ) کو تقریباً ۷۵ برس کی عمر میں عالمِ فانی سے کوچ کیا۔ رام پور میں حضرت جمال اللہ صاحب کے مزار کے باہر دفن ہیں۔ اُن کے بیٹے سید محمد عابد حسین اوج تخلص کرتے تھے۔ (انتخاب یادگار، ص ۱۴۶؛ مسدسِ بے نظیر، ص ۴۹-۵۲)۔

بہادر دیوان اعلیٰ" خطاب ملا تھا۔ چندے نواب تجمل حسین خاں والیِ فرخ آباد کی سرکار میں مدار المہامی کے فرائض سرانجام دیے۔ یہ وہی تجمل حسین خاں ہیں جن سے متعلق غالب کا شعر ہے ؎

دریا پہ خلق کو بھی، تا اُسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لیے

نواب تجمل حسین خاں کے جانشین تفضل حسین خاں بھی ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے معتوب ہوئے تھے۔ اُنھوں نے دیارِ حجاز میں پناہ لی اور وہیں بہت عسرت کی حالت میں وفات پائی۔ ریاست انگریزوں نے ضبط کر لی۔

مفتوںؔ بھی اپنے والد کی طرح انگریزی حکام کے حلقے میں بہت معزز اور صاحبِ اثر تھے۔ اپنے زمانے میں فرخ آباد کے میونسپل کمشنر رہے۔ آنریری مجسٹریٹ کے اختیارات بھی حاصل تھے۔ ۱۸۷۷ء کے دربارِ دہلی میں سندِ خوشنودی عطا ہوئی تھی۔ ۶۶ برس کی عمر تھی، جب یکم نومبر ۱۸۸۷ء کو وفات ہوئی۔

مفتوںؔ کی علمی استعداد بہت اچھی تھی۔ فارسی پر فاضلانہ نظر تھی۔ خوش نویسی اور خطِ نستعلیق میں مشہورِ زمانہ استاد میر علی بخش حسینی کے شاگرد تھے۔ فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے اور غالب سے اصلاح لیتے تھے۔

اِن کے صاحبزادے پنڈت شام نرائن مشران مدتوں ریاست بڑوانی میں تحصیل دار رہے۔ اُردو، فارسی، انگریزی کی اعلیٰ قابلیت کے علاوہ عربی اور سنسکرت میں بھی دخل تھا۔ شاعری ورثہ میں پائی۔ یکتاؔ تخلص تھا۔ اور اُردو فارسی دونوں زبانوں میں کہتے اور اپنے والد ہی سے مشورہ کرتے تھے۔ اُن کا ۶۳ برس کی عمر میں ۲۸ اگست ۱۹۰۴ء کو انتقال ہوا۔

کلامِ مفتوںؔ کا مختصر انتخاب یہ ہے:۔

دل افسردہ ہوا ہے ہجرِ خوباں کے لے مفتوںؔ!
نہ ہو باور، تو ہے اللہ واقف حق و باطل کا

کیا کیا نہ آئیں دل میں مرے بد گمانیاں
شب دیکھ کر کھُلے ہوئے بندِ قبائے دوست

بدخواہ اپنا کون ہے، ہمدم! سوائے دل
دشمن ہمارا کون ہے مفتوںؔ! سوائے دوست

عمر گذری، کہ تری راہ میں ہم بیٹھے ہیں
پر ابھی شوق یہ کہتا ہے، کہ کم بیٹھے ہیں

واہ قسمت! کہ لبِ بحر پہ ہم مثلِ حباب
خالی کاسہ لیے با دیدۂ نم بیٹھے ہیں

کیونکر بیت الصنم عشق سے اٹھیں، مفتوںؔ! — اب تو اللہ کی ہم کھا کے قسم بیٹھے ہیں

سامری آخر اسیرِ دامِ اُلفت ہو گیا — چشمِ فتّاں میں تری جادو کا سرمہ دیکھ کر

یک نفس گر بگذرد، موجِ شمیمِ زلفِ تو — خانۂ عطّار گردد رخنۂ دیوارِ ما

وشت از یادِ رُخِ پرنور روشن کردہ ایم — مشعلِ طور است خارِ وادیِ پُر نارِ ما

از نویدِ وصل تا بر خویشتن بالیدہ ام — مثلِ چشمِ اغنیا تنگ است پیراہن مرا

مومن! بیا ببیں، کہ دل افروزِ قدسیاں — چوں شمعِ کعبہ است، چراغِ کنشتِ ما

روے اُو ہر کہ دیدہ می آید — پیرہن را دریدہ می آید

دستِ من کے رسد بدامانش — او کہ دامن کشیدہ می آید

چہ خوشا! کہ قاتلِ من — پے قتلم دویدہ می آید

بتِ بے رحم بر سرِ مفتوںؔ — تیغِ ابرو کشیدہ می آید

جاں نثارش کنم اینک از ام، اے مفتوںؔ! — کارِ امروز چرا باز بفردا فگنم

[بہارِ گلشنِ کشمیر (۲) ص ۳۰۳ — ۳۰۸؛

ایضاً، ص ۱۱۷ - ۱۲۰]

مقصودؔ ——— مولوی مقصود عالم رضوی پہانوی

خاندانِ سادات میں سے تھے۔ ان کے والد مولوی سیّد صدرِ عالم بھی شاعر تھے۔ مسرورؔ تخلص تھا اور لکھنؤ کے مضافات میں قصبہ پہانی کے رہنے والے تھے۔ یہ وہی پہانی ہے جہاں کے میران صدرِ جہاں تھے جو اکبر بادشاہ کے عہد میں اوّل ممالکِ محروسہ کے منصبِ افتا پر اور بعد میں عہدۂ صدارت پر مقرر ہوئے۔ جہانگیر نے ایامِ شاہزادگی میں اُن سے چہل حدیث کا درس لیا تھا۔

مقصودؔ نے فارسی میں اپنے والدِ بزرگوار سے اور اُردو میں نواب عاشور علی خاں بہادر

لکھنؤ سے مشقِ سخن کی۔ سنِ کہولت میں غالب کی خدمت میں اصلاح کی درخواست لے کر پہنچے۔ غالب نے انھیں شمس الشعرا خطاب دیا اور اُن کا کلام بنظرِ اصلاح دیکھا۔ پچاس برس کی عمر میں وفات پائی۔

معلوم ہوتا ہے کہ علمی اور ادبی نوک جھوک سے بھی خاصی دل چسپی تھی۔ ۱۸۶۱ء میں لکھنؤ میں یہ بحث چھڑی تھی کہ لفظ ابتشار (بشارت سے افتعال کا وزن) درست ہے یا نہیں۔ اس میں بہت لوگوں نے حصہ لیا۔ ایک استفتا تیار کر کے مجتہد العلماء سید محمد صاحب، مفتی میر عباس، غالب، دبیر وغیرہ کے پاس بھیجا گیا تھا۔ یہ سارا مجموعہ معارضۃ النشر (مرتبہ مقبول عام مقبول) کے نام سے ۱۸۶۱ء (۱۲۷۸ھ) میں مطبع نولکشور لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔ اس علمی مباحثہ میں مقصود سب سے پیش پیش تھے۔ غالب کے بعض خطوط بھی مقصود کے نام اس مجموعے میں شامل ہیں۔

مثنوی شکرستانِ معنی، سکندر نامہ، مقصود الصنائع وغیرہ پچاس کے قریب کتابیں لکھیں۔ ان کے صاحبزادے سید خورشید عالم بھی شاعر تھے۔ خورشید اور عبرتی دو تخلص کرتے اور انھیں سے اصلاح لیتے تھے۔

مقصود اُردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔

چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

سرو و شمشاد سے ہے وہ قدِ آزاد الگ　　جیسے مضموں کسی شاعر کا خداداد الگ

دوست وہ ہو کہ رہے دوست کا مشکل میں شریک　　مجھ سے فرقت میں نہ ہوا اے دلِ ناشاد الگ

ملائے خاک بھلا، آنکھ آدمی تم سے　　خفیف حور ہے تم سے، خجل پری تم سے

یہ کیا ستم ہے، زمانہ بنا ہے دشمنِ جاں　　غضب میں جان پڑی، کی جو دوستی تم سے

ہنسی کی بات پہ تم، اس قدر بگڑتے ہو　　تو جاؤ، آج سے موقوف ہے ہنسی تم سے

فارسی میں رنگ یہ ہے :-

خارِ بیابانِ جنوں، خاکِ دیارِ بے کسی　　گاہ بہ زیرِ پا، گہے زیرِ سر، آں ہم گذشت ایں ہم گذشت

گہ بہ بہار از گلستاں، گاہ بہ خزاں از بوستاں　　ہم رنگِ آب، اثر، آں ہم گذشت، ایں ہم گذشت

منصورا ای قیسِ حزیں، ذیں قلبِ وحشت آفریں ‏ ‏ ‏ ‏ در دشت بے خوف و خطر آنہم گذشت، ایں ہم گذشت

[سخن شعرا، ص ۴۵۴؛ خم خانۂ جاوید (۳)، ص ۸۲؛
ایضاً (۵)، ص ۵۷۳؛ صبحِ گلشن، ص ۴۴۰ - ۴۴۱]

منصور ــــــ حافظ مصلح الدین اکبر آبادی

ان کے والد آگرہ کمشنری میں محرر تھے۔ مولوی رحیم الدین صدر دیوانی کے وکیل ان کے چھوٹے بھائی تھے۔ منصور نے ۱۳۰۰ھ کے لگ بھگ انتقال کیا۔

اُردو فارسی دونوں میں شوق فرماتے تھے۔ اُردو میں غالب اور فارسی میں محمد احسن احسن[1] بلگرامی سے استفادہ کیا۔

منصور کیوں نہ بہکے، ذرا غور کیجیے! ‏ ‏ ‏ ‏ بھرے کے پینے والے کو دے دی کڑی شراب
دار پر کھینچ کے بھی منصور کی عادت نہ گئی ‏ ‏ ‏ ‏ اب رگِ جاں سے بھی آواز انا آتی ہے

مرہمِ زنگار را در باغِ زخم ‏ ‏ ‏ ‏ سبزۂ بیگانہ می دانیم ما

[نہالستانِ نثار، ص ۲۰؛ روزِ روشن، ص ۶۵۶]

---

[1] مولوی محمد احسن احسن خلف محمد احمد بلگرامی، سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے ۱۲۴۴ھ میں بلگرام میں پیدا ہوئے۔ لیکن صفی پور میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ابتدائی تعلیم ۱۸ برس تک اپنے والدِ ماجد سے لی اور تکمیل لکھنؤ میں کی۔ اُردو فارسی نظم و نثر میں دستگاہِ کامل تھی اور ان میں علی الترتیب مولوی احسان اللہ ممتاز نانا اور گل محمد خاں ناطق مکرانی سے اصلاح لی۔ پہلے نواب مختار الملک مدار المہام حیدرآباد کی سرکار سے وابستہ تھے، پھر بھوپال آ کے نواب صدیق حسن خان بہادر کے صاحبزادوں کی تعلیم پر مقرر ہوئے۔ کبھی کبھی اُردو میں کہتے تھے لیکن زیادہ مزاولت فارسی سے تھی۔ (صبحِ گلشن، ص ۱۵ - ۱۶)

مونس ——— پنڈت شیوجی رام دہلوی

ان کا ایک مختصر دیوان گیان پریس دہلی سے ۱۸۸۱ء میں چھپا تھا۔ اگرچہ تمام اصنافِ سخن میں کلام موجود ہے لیکن کوئی خاص بات نہیں۔ جابجا غالبؔ سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔

بے سبب کچھ تو! پر نہیں معلوم
کیوں ہے دل آج بیقرار اپنا

شعر کہنا سخت مشکل ہے، مگر غالبؔ گواہ
مونسؔ ہے شاگرد، استادِ زماں مغفور کا!

مونسؔ! نہیں سنا ہے، کسی کا کسی طرح
حاصل بتوں سے دل کا کبھی مدعا ہوا

تیرے مرنے کی خبر سن کر وہ مونسؔ! غیر سے
کہتے ہیں، "اچھا ہوا، وہ مر گیا خانہ خراب"

کیوں کروں میں حالِ دل اپنا بیاں
ہے مری صورت سے ہر صورت عیاں

میں [illegible] بھی نہ رکھوں گا لگی!
مجھ سے مت کھلواؤ تم میری زباں

کلبۂ احزاں میں گر آجائیں آپ
ہم کو پھر مل جائے گنجِ شائگاں

کیوں نہ ہوں فرہاد، اور مجنوں خجل!
عشق کی میرے سنیں گر داستاں

مونسِ دل خستہ کے احوال کو
کیا کوئی جانے، مگر وہ رازداں

یار سے ملنے کی مری کوئی تدبیر نہیں
کیا چلے پیش وہ تدبیر، جو تقدیر نہیں

کافی نگاہِ لطف تری ہے، اگر رہے
تو مہرباں نہیں، تو کوئی مہرباں نہیں

کس طرح دل کو غم و رنج سے آزاد کریں
نہ رہی بات وہ جس بات پہ دل شاد کریں

ہم کہیں، تم نہ سنو، تم کہو، ہم دل سے سنیں
جز تمہارے، کہو کس شخص سے فریاد کریں

جلوہ دکھا رہے ہیں وہ بیٹھے نقاب میں
معنی میں ظاہر ہیں وہ، بصورت حجاب میں

ہو گیا عشق میں یہ حال ہمیں
آپ اپنا نہیں خیال ہمیں

کیا بات ہے، کہ دیکھ کے دیدارِ یار کو
رہتی نہیں ہے تاب دلِ بے قرار کو

تھیں تو سچ ناصح کی باتیں، پر وہ جوشِ عشق میں
خوش نہ آئی ایک بھی اس نے جو سمجھائی مجھے

ہم نشیں! حالِ شبِ فرقت نہ پوچھ
دل پہ جو گزری، گزر کر رہ گئی

ناصحا! کہہ نہ بار بار مجھے　　اُس سے اُلفت ہے بے شمار مجھے

[بہارِ سخن، ص ۲۴۴ - ۲۴۵]

میکش ــــــ میر احمد حسین دہلوی

میر کرار حسین کے خلف رشید اور دہلی کے سید زادوں میں سے تھے۔ پہلے صہبائی سے اصلاح لیتے رہے۔ بعد میں غالب سے مشورہ رہا۔ غدر ۱۸۵۷ء میں ایک گورے کی گولی کا شکار ہوئے۔

منشی جواہر سنگھ جوہر کے ترجمے میں غالب کی جو حسب ذیل رباعی نقل کی گئی ہے اس میں میکش سے یہی مراد ہیں۔

تا میکش و جوہر دو سخنور داریم　　شانِ دگر و شوکتِ دیگر داریم

در میکدہ پیریم، کہ میکش از ماست　　در معرکہ تیغیم، کہ جوہر داریم

میکش زیادہ تر فارسی میں کہتے تھے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

گفتمش دی با کہ می رفتی خراماں سوے باغ　　گفت "میکش بودہ باشد، کاں گرفتارِ من ست"

اے آں کہ در شب ہائے غم اندر دلِ من بگذری　　خون ست ایں جا موج زن، دامن نگہ دار از تری

از ہر دو جانب موے تو، آویختہ بر روے تو　　اے بستۂ گیسوے تو ہم زہرہ و ہم مشتری

بر اوجِ شوکت نارسا، پروازِ عالی فطرتی　　در مُلکِ عشقت نارَوا، پروانۂ نیک اختری

[گلستانِ سخن، ص ۴۴۹؛ نگارستانِ سخن، ص ۱۱۴؛ روزِ روشن، ص ۶۶۸ - ۶۶۹؛ اُردوے معلیٰ، ص ۱۶۸۔]

میکش و محوی ——— ارشاد احمد دہلوی

شیخ عبدالقادر (میر قادر علی - آثار الشعراء) ساکن قصبہ پھلت ضلع مظفر نگر (من مضافاتِ دہلی) کے صاحبزادے تھے لیکن میکش کی ساری عمر دہلی میں گذری۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں کا شوق تھا۔ اردو میں میکش اور فارسی میں محوی تخلص کرتے تھے۔ غالب کے علاوہ صہبائی سے بھی مشورہ کرتے رہے۔ آخر عمر میں بھوپال چلے گئے تھے اور وہاں نواب نظیر الدولہ سلطان دولہ میاں احمد علی خان بہادر (جناب نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ کے شوہر) کی ملازمت اختیار کرلی تھی۔

ربطِ نہانِ غیر کا پردہ ہے ورنہ آپ ——— دشمن کے ساتھ صرفہ کریں رسم و راہ میں

ستانے میں فلک کو مشورہ ہے ——— کسی بے رحم کی چینِ جبیں سے

مرے اشکِ گرم کی حدت کو پوچھو ——— مرے دامن سے اپنی آستیں سے

یہی فتنے سب قیامت کے ——— لیکن آگے تمھارے قامت کے!

اب فارسی کے چند شعر بھی ملاحظہ ہوں ؎

بازلف دراز او در آویخت ——— یارب! چہ بلاست، ایں دلِ ما

واعظ! زبانِ خویش نداری نگاہ، ہاں ——— انصاف می دہی کہ بدارم نگاہ دل

کردہ است بر احوالِ غیر رحم، بگو ——— گرفتم ایں کہ تو ہرگز ستم شعار نہ باش

مطرب! از سرودن، کہ کشودن نتواں ——— غنچۂ خاطرِ افسردہ، بزورِ نفسے

[صبح گلشن، ص ۴۰۸؛ آثار الشعرا، ص ۲۱۰؛ خود کلیم، ص ۱۰۷-۱۰۸]

مینا ——— مولانا احمد حسین مرزاپوری

میرے خیال میں یہ اور تمنا مرزاپوری (جن کا ذکر پہلے ہوچکا ہے) ایک ہی شخص ہیں۔

میناؔ اور تمناؔ میں تصحیف ہوگئی ہے۔ اور اس طرح یہ دو الگ الگ شخص ہوگئے ہیں۔ صفدر مرزاپوری کے مرتبہ "مرقع ادب" میں یہ دو شعر نظر پڑے ؎

ادائے یوسفی ہے لوٹ قاتل کے لڑکپن پر	سوادِ دیدۂ یعقوب کے دھبّے ہیں دامن پر
نزاکت ان کی وقتِ قتل، مقتل میں یہ کہتی ہے	یہ اتنے خونِ ناحق جس سے اٹھیں، اس کی گردن پر

[مرقع ادب (۲) ص ۱۹ - ۲۰ ؛]

نادمؔ ـــــــ فخرالدین رام پوری

اردو، فارسی دونوں زبانوں میں شوق فرماتے تھے۔ اخبار الصنادید میں اُن کی مندرجۂ ذیل تاریخیں نظر سے گذریں۔ نواب حامد علی خان بہادر مرحوم والیِ رام پور کے صاحبزادے حسن علی خاں کی تاریخِ ولادت ہے ؎

طلوعِ اخترِ اقبال گر دید	بہ برجِ خسروِ جم شیرِ دوراں
فلک شد انجمن آرائے انجم	بہ چرخِ سوہمیں ناہید رقصاں
عطارد مشتری را مژدہ بخشید	"ببرجِ مہر ہیں شد ماہ تاباں"
	۱۳۱۸ھ

قلعہ رام پور کی تاریخِ تعمیر کہی ؎

قلعہ جو بنایا ہے سرکار نے	کہ ہر وقت جس میں برستا ہے نور
لکھی اس کی تاریخ نادمؔ نے یوں	"بنا خوب قلعۂ رام پور" (کذا)
	۱۳۲۰ھ

اسی قلعہ میں ایک امام باڑہ تعمیر ہوا تو اس کی تاریخ کہی ؎

سرِ ادب سے یہاں آؤ مومنو دیکھو	"یہ جائے عیش نہیں، گھر بنا ہے ماتم کا"

+ ۱۳۱۹ = ۱۳۲۰ھ

[اخبار الصنادید (۲) ص ۳۸۰، ۴۵۶، ۴۵۷]

ناصر ـــــــ سید ناصر الدین حیدر خاں عرف یوسف مرزا لکھنوی

یہ نواب حسام الدین حیدر خاں کے نواسے اور ناظر حسین مرزا کے بھانجے تھے۔ ناظر حسین مرزا سے بڑی ایک بہن قدسیہ بیگم عرف حسینی صاحبہ تھیں۔ یہ سید محمد نصیر عرف نواب جان سے بیاہی گئیں۔ (غالب نے مجروح کے نام ایک خط میں غلطی سے اُن کا نام نصیر خاں لکھا ہے) یہ بھی ۱۸۵۷ء کی شورش کے بعد بغاوت کے جرم میں ماخوذ ہوئے تھے۔ ۱۸۵۹ء میں باندہ سے گرفتار ہو کر لکھنؤ لائے گئے۔ پہلے حبسِ دوام کی سزا ملی، لیکن بعد میں پھانسی میں تبدیل ہو گئی (۱۸۶۰ء)۔ یوسف مرزا انھیں کے بیٹے تھے۔

یوسف مرزا بھی ۱۸۵۷ء کے بعد بہت دن تک پریشان حال پھرتے رہے۔ آخر الور میں پناہ ملی۔ یہ مہاراجہ کے مزاج میں بہت دخیل ہو گئے تھے اور وہ ان سے بہت خوش تھے۔ ان کا پچاس روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر تھا اور اس بات کی کوئی پابندی نہیں تھی کہ لازماً الور ہی میں رہیں، البتہ یہ شرط ضرور تھی کہ اگر باہر رہیں تو سال میں دو ایک مرتبہ ضرور یہاں آئیں۔

طبیعت میں ظرافت بہت تھی۔ ایک لطیفہ سنیے۔ ان کے ایک چچا کا نام سید محمد رضا تھا۔ اُن کے ایک دوست نواب محمد رضی خاں تھے۔ یوسف مرزا نے رضی کی ی کو یائے تانیث قرار دیا۔ اور چونکہ سید محمد رضا اُن کے چچا تھے۔ اس لئے نواب محمد رضی خاں کو چچی کہنے لگے۔ غریب نواب تمام لکھنؤ میں "محمد رضی خاں چچی" کے نام سے مشہور ہو گئے۔

۱۳۰۰ھ (۱۸۸۲ء۔۱۸۸۳ء) میں وفات ہوئی۔ نور باڑی لکھنؤ میں دفن ہوئے۔

میر مہدی مجروح کی لکھی ہوئی تاریخِ وفات کا آخری شعر ہے ؎

چنیں گفت رضواں سنین وفات ۔۔۔ بیا سیدم در بہشت بریں
۱۳۰۰ھ

افسوس کہ کلام دستیاب نہیں ہوا۔

[خاندانی حالات (قلمی)]

ناظم ـــــــ نواب محمد یوسف علی خاں بہادر فردوس مکان والیِ رامپور

ریاست رام پور کی بنیاد نواب علی محمد خان بہادر خلد مکاں کے ہاتھوں اٹھارویں صدی کے شروع میں رکھی گئی تھی۔ آپ نسباً حسینی سیّد[1] تھے۔ بسلسلۂ نسب ۳۶ واسطوں سے سیّد الشہدا حضرت امام حسین علیہ السلام سے جا ملتا ہے۔ محمد شاہی میں آپ کو منصب پنج ہزاری ذات اور علاقہ کٹیہر کی جاگیر عطا ہوئی۔ اپنی دانش مندی اور بہادری سے اپنے ہم عصروں سے گوے سبقت لے گئے اور بہت نام پیدا کیا۔ ۴۴ برس کی تھی جب بمرض استسقا ۵۔ ستمبر ۱۷۴۹ء (۳؍شوال ۱۱۶۲ھ) کو انتقال کیا۔ آنولہ میں دفن ہوئے۔ کاظم خان شیدائی نے تاریخ وفات کہی: ہے ہے افغان۔

ان کی وفات کے وقت ان کے دونوں بڑے بیٹے۔ محمد عبد اللہ خان بہادر، اور محمد فیض اللہ خان بہادر قندھار میں تھے۔ اس لیے تیسرے صاحبزادے نواب محمد سعد اللہ خان بہادر ان کے جانشین ہوئے۔ جب کچھ مدت کے بعد دونوں بھائی واپس آئے، تو بھائیوں میں آپس میں اختلاف رائے ہونا قدرتی امر تھا۔ آخر تصفیہ یوں ہوا کہ پانچ لاکھ سالانہ کی جاگیر اوجھیانی وغیرہ نواب عبد اللہ خان بہادر کے حصے میں آئی اور اتنی ہی مالیت کا علاقہ رام پور وغیرہ نواب محمد فیض اللہ خان بہادر کو ملا۔ اور باقی حصۂ ملک پر نواب محمد سعد اللہ خاں بہادر کا قبضہ تسلیم کر لیا گیا۔ جب ۲۷ برس کی عمر میں ان کا بھی بعارضۂ سل ودق یکم مارچ ۱۷۶۲ء (۵؍شعبان ۱۱۷۵ھ) کو انتقال ہو گیا تو قوم نے بالاتفاق، اُن کے سب سے بڑے بھائی نواب محمد عبد اللہ خان بہادر کو رئیس تسلیم کر لیا۔ افسوس کہ

---

[1] یہ محمد نجم الغنی مولف اخبار الصنادید کا بیان ہے۔ اس کے برخلاف بعض تاریخ نویسوں نے یہ بھی لکھا ہے، کہ نواب علی محمد خاں کی اصلیت معلوم نہیں۔ (دیکھیے سیر المتاخرین، دبستان اودھ، حیات حافظ رحمت خاں وغیرہ) کاظم خاں شیدائی نے اُن کی جو تاریخِ وفات کہی ہے: ہے ہے افغان۔ اس سے بھی خیال ہوتا ہے، کہ یہ خاندان سیّد نہیں بلکہ پٹھان تھا۔

ان کی عمر نے بھی وفا نہ کی اور یہ بھی پانچ برس بعد سانپ کے کاٹنے سے ۳۔ جولائی، ۱۷۶۷ء (۵۔ صفر ۱۱۸۱ھ) کو قصبہ اوجھیانی میں رحلت کر گئے۔ فارسی میں شعر بھی کہتے تھے۔ عاصی اور آزاد اور مبتلا تین تخلص کرتے تھے۔ آپ کے بعد آپ کے چھوٹے بھائی نواب محمد فیض اللہ خان بہادر عرش منزل وسادہ آرائے حکومت ہوئے۔ اُن کے عہد میں ریاست نے بہت ترقی کی اور رام پور بھی اسی زمانے میں دارالحکومت قرار پایا۔ آپ بیس برس تک داد و دہش کے ساتھ حکمرانی کرنے کے بعد جمعرات کے دن ۱۷۔ جولائی ۱۷۹۴ء (مطابق ۱۸۔ ذی الحجہ ۱۲۰۸ھ) کو رام پور میں فوت ہوئے اور یہیں عیدگاہ دروازے کے باہر ایک خاص مقبرے میں مدفون ہیں۔ لفظ عذب سے تاریخِ وفات نکلتی ہے۔

نواب عرش منزل کی وفات کے بعد اعیانِ قوم نے چاہا کہ آپ کے دوسرے بیٹے غلام محمد خان بہادر کو گدی پر بٹھا دیں۔ لیکن وہ نہیں مانے اور سب کو ہموار کر کے اپنے بڑے سوتیلے بھائی نواب محمد علی خاں کو رئیس بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ نواب محمد علی خاں کے مزاج میں شورش بہت تھی اور کوئی بھی اُن سے خوش نہیں تھا۔ آخر کار وہ ایک سازش کا شکار ہوئے۔ مسند نشینی کے صرف ۲۴ دن بعد مخالفوں نے اُن پر قاتلانہ حملہ کیا۔ جس سے جان تو بچ گئی لیکن بہت سخت زخمی ہوئے۔ علاج معالجہ سے افاقہ اور صحت کی صورت ہو چلی تھی، کہ دوسری سازش ہوئی اور اب کے وہ موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ اگرچہ اس ناشدنی حادثہ میں نواب غلام محمد خاں بہادر کا کوئی ہاتھ نہیں تھا اور یقین تھا کہ وہی ان کے بعد گدی پر بیٹھیں گے۔ لیکن اُن کے حاشیہ نشینوں نے اپنی ضد اور کوتاہ اندیشی سے کام بگاڑ دیا۔ اُس وقت تک رام پور کا علاقہ حکومتِ اودھ کے تحت تھا۔ آخر نوبت کشت و خون تک پہنچی۔ نواب آصف الدولہ نے انگریزوں کی مدد سے انھیں شکستِ فاش دی اور فیصلہ یہ ہوا کہ مسند پر نواب محمد علی خان بہادر کے خورد سال فرزند نواب احمد علی خاں کو بٹھایا جائے۔ اُن کی نابالغی کے زمانے میں نواب محمد نصر اللہ خان بہادر (خلف نواب محمد عبد اللہ خان بہادر) مدارالمہام مقرر ہوئے۔ نواب غلام محمد خاں ریاست کو چھوڑ کے بنارس چلے گئے اور وہاں سے حج بیت اللہ کے لیے کلکتہ کے رستے حجاز کی راہ لی۔

انھوں نے ۱۸؍فروری ۱۸۲۳ء (۶؍جمادی الثانی ۱۲۳۸ھ) کو جمعرات کے دن فالج سے انتقال کیا۔ نادوتن میں ایک عالی شان مقبرے میں دفن ہیں۔ "رضوان مقام" تاریخِ وفات ہے۔

نواب احمد علی خان بہادر نے ۲۶؍جولائی ۱۸۴۰ء (مطابق ۲۵؍جمادی الاولیٰ ۱۲۵۶ھ) کو انتقال کیا۔ وہ اُردو میں شعر بھی کہتے تھے۔ احمد اور رند تخلص کرتے تھے۔ چوں کہ لاولد فوت ہوئے تھے۔ اس لیے اُن کی وفات کے بعد انگریزوں نے "نواب غلام محمد خاں بہادر عرش جناب کے فرزندِ اکبر نواب محمد سعید خان بہادر جنت آرام گاہ کو بدایوں کی ڈپٹی کلکٹری سے بُلا کے رام پور کی گدی پر بٹھا دیا۔ ایامِ جلاوطنی میں اُنھوں نے بہت دن بنارس اور لکھنؤ میں بسر کیے تھے۔ اپنے خاندانی مقدمے کی پیروی کے لیے کلکتے بھی گئے۔ اس سیر و سیاحت سے بھی آپ نے بہت کچھ تجربہ حاصل کر لیا تھا۔ گزشتہ کتنے زمانے سے ریاست کے معاملات بہت ابتر تھے۔ امن نام کو نہیں رہا تھا۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے اصول کا دور دورہ تھا۔ آپ نے آکے از سرِ نو امن و امان قائم کیا۔ ریاست کی آمدنی بڑھائی۔ مختلف محکمے قائم کر کے لوگوں کو ایک متمدن حکومت کی برکتوں سے مالا مال کیا۔ غرض کہ ان کے عہد میں ریاست کا وقار بہت بڑھ گیا۔ آخر پندرہ برس تک دادِ جہانبانی دے کر ۷۱ برس کی عمر میں ۱۹؍مئی ۱۸۵۵ء (۱۳؍رجب ۱۲۷۱ھ) کو بعارضۂ سل عالمِ فانی سے رحلت فرمائی۔ امامیہ مذہب کے پیرو تھے۔ کوٹھی خورشید منزل کے قریب اپنے تعمیر کردہ امام باڑہ میں دفن ہوئے۔ "غروبِ کوکب ہے" تاریخ ہے۔ طب میں اچھی مہارت تھی۔ فارسی نثر عاری بھی خوب لکھتے تھے۔ اور اس میں قتیل سے مشورہ کرتے تھے۔ اپنے پیچھے پانچ بیٹے اور چار بیٹیاں یادگار چھوڑیں۔ صاحبِ تذکرہ جناب ناظم ان ہی کے سب سے بڑے صاحبزادے اور جانشین تھے۔

نواب سید فیض اللہ خان بہادر (خلفِ بانیِ ریاست) کی ایک سوتیلی بہن نیاز بیگم بڑیچ کے خان زادہ شاہ محمد خان کے عقدِ نکاح میں تھی۔ اُن کے صاحبزادے محمد نور خان مظفر بلند اختر فتح النساء بیگم سے نواب محمد سعید خاں بہادر نے نکاح کیا تھا۔ یہی جناب بیگم فتح النساء بیگم صاحبہ، نواب یوسف علی خان بہادر ناظم کی والدہ ماجدہ تھیں۔ اُن کی وفات مارچ ۱۸۵۹ء میں ہوئی۔ غالب نے قطعۂ تاریخِ وفات کہا ؎

جنابِ عالیہ از بخششِ حق	بہ فردوسِ بریں چوں کرد آرام
سخن پرداز غالب سالِ رحلت	"خلودِ خلد" گفت از روے الہام

۱۲۷۴ + آ - ۱۲۷۵ھ

ناظم ۵- مارچ ۱۸۱۶ء (مطابق ۵ ربیع الثانی ۱۲۳۱ھ) کو پیر کے دن پیدا ہوئے۔ اس زمانے میں اُن کے والدِ مرحوم، نواب جنت آرام گاہ انگریزی علاقے میں مقیم تھے۔ ناظم زمانۂ طالب علمی میں دہلی آئے اور مرزا غالب سے فارسی پڑھی۔ اِن ہی ایام میں مفتی صدرالدین آزردہ اور مولانا فضل الحق خیرآبادی سے عربی اور دیگر علومِ عقلیہ منطق وغیرہ پڑھے۔ غالب کے علاوہ خلیفہ غیاث الدین رام پوری سے بھی فارسی پڑھی تھی۔

ناظم اپنے والد کے جانشین ہوئے۔ ابھی اس واقعہ پر مشکل سے دو برس گذرے تھے کہ مئی ۱۸۵۷ء میں مشہور ہنگامہ برپا ہو گیا۔ ریاست رام پور بھی زغے میں گھر گئی لیکن انھوں نے نہایت حزم و احتیاط سے کام لیا۔ اور کسی شورش میں شریک نہیں ہوئے بلکہ انگریزوں کی بہت قابلِ قدر خدمات سر انجام دیں۔ اِن ہی کارگزاریوں کے صلے میں لارڈ کیننگ گورنر جنرل نے ۱۵- نومبر ۱۸۵۹ء کو فتح گڑھ کے دربار میں بیس ہزار روپے کا خلعت عطا کیا اور سلامی گیارہ کی جگہ تیرہ ضرب توپ مقرر ہوئی نیز "فرزندِ دل پذیر" کا خطاب ملا۔ اور سرکاری مراسلت میں القاب و آداب مقرر ہوا "نواب صاحب مشفق، بسیار مہربان کرم فرماے مخلصاں سلامت بعد از شوقِ ملاقاتِ مسرت آیات مشہودِ خاطرِ الطاف ذخائر می وارد" اس کے بعد اُن ہی خدمات کے صلہ میں سرکار انگریزی نے جون ۱۸۶۰ء میں ۴۶ گاؤں کا ایک علاقہ جدید ضلع بریلی میں بطور جاگیر عطا کیا۔ اسی عطیے کے موقع پر نواب صاحب موصوف نے یہ قطعہ موزوں فرمایا تھا۔

جب گورمنٹ سے ہوا حاصل	ملک مجھ کو بصیغۂ انعام
ناظم از روے ہمتِ عالی	سالِ بخشش "ہے بخششِ حکام"

۱۲۷۶ھ

غالب نے بھی اس عطیے کی تہنیت میں ایک قطعہ لکھا تھا جو اُن کے کلیات میں

شامل ہے (قطعہ ۲۰) اس کے آخری تین شعر ہیں ؎

نواب مہر مہر، منو چہر چہر را ‏ ‏ حاصل جمالِ یوسف و قرب کلیم باد

چون غنچہ کہ پہلوے گل بشگفد بباغ ‏ ‏ ملکِ جدید شاملِ ملکِ قدیم باد

ہردم ترا بخلوتِ راز و ببزمِ اُنس ‏ ‏ روح الامین مصاحب و غالب ندیم باد

ملکہ وکٹوریہ کے عہد میں (جولائی ۱۸۶۱ء) اسٹار آف انڈیا کا ایک خاص آرڈر قائم ہوا تھا۔ اسی سلسلے میں یکم نومبر ۱۸۶۱ء کو الہ آباد میں ایک عظیم الشان دربار منعقد ہوا۔ اس موقع پر لارڈ کیننگ گورنر جنرل اور وائسرائے نے بعض دوسرے والیانِ ریاست کے ساتھ نواب یوسف علی خاں بہادر کو بھی نائٹ کا خطاب اور تمغہ دیا۔ ۱۸۶۲ء میں کیننگ کے بعد لارڈ الگن اُن کے جانشین ہوئے لیکن جلد ہی نومبر ۱۸۶۳ء میں بعارضہ قلب اُن کا انتقال ہوگیا اور اُن کی جگہ سرجان لارنس مقرر ہوئے۔ ۱۸۶۴ء میں لارنس نے نواب صاحب موصوف کو اپنی مجلسِ واضعِ قوانین کا رکن مقرر کیا۔ چنانچہ اسی سلسلے میں یہ کلکتہ تشریف لے گئے۔ لیکن وہاں کی آب و ہوا انھیں راس نہ آئی اور یہ بیمار پڑ گئے۔ مجبوراً گورنر جنرل کی رضامندی سے واپس رام پور چلے آئے۔ لیکن مرض نے طول کھینچا اور بڑھ کر سرطان کی شکل اختیار کرلی۔ نوبت یہاں تک پہونچی کہ نومبر ۱۸۶۴ء میں ان کی حالت بہت تشویش ناک ہوگئی۔ بارے صحت ہوئی۔ مرزا غالب نے اس موقع پر دو قصیدے کہے، ایک فارسی میں ایک اُردو میں۔

لیکن مرض پورے طور پر رفع نہیں ہوا تھا۔ اس نے پھر حملہ کیا اور اب کے جان لیوا ثابت ہوا۔ ۲۱۔ اپریل ۱۸۶۵ء (۲۴۔ ذی قعدہ ۱۲۸۱ھ) کو جمعہ کے دن دوپہر کے وقت خالقِ حقیقی سے جاملے۔ آپ بھی اپنے والدِ ماجد کی طرح امامیہ مذہب کے پیرو تھے۔ اسی مشرب کے مطابق تجہیز و تکفین ہوئی۔ امام باڑے کے بیرونی دالان میں اپنے والدِ بزرگوار کے پہلو میں محوِ خواب ہیں۔

تاریخِ وفات ہے ع ‏ ‏ یوسف از جہاں رفت و سکندر آمد

امیر مینائی کے قطعہ کا مصرعِ تاریخ ع ‏ ‏ مسند آرائے جہاں شد یوسفِ دورانِ من

ناظم نے فیروز النساء بیگم عرف نواب بہو بیگم سے نکاح کیا تھا جو اُن کے چچا جناب عبدالعلی خاں (والدِ بیتاب) کی صاحبزادی تھیں۔ اس بیوی سے "تین بچے" ہوئے، ایک اُن کے جانشین نواب کلب علی خاں بہادر خلد آشیاں اور دو صاحبزادیاں۔ ان کے علاوہ تین لڑکے اور چار لڑکیاں بعض بیگیات ممتوعہ اور خواصوں کی اولاد یادگار چھوڑے۔

ناظم فروری ۱۸۵۷ء میں غالب کے شاگرد ہوئے۔ اس سے پہلے کبھی شعر نہیں کہا تھا۔ دراصل شعر گوئی غالب کی سرپرستی کا بہانہ بن گئی۔ امیر مینائی نے "انتخاب یادگار" میں لکھا ہے کہ وہ غالب سے پہلے موتمن سے اصلاح لیتے رہے تھے۔ یہ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ جب پہلی بار نواب صاحب نے اپنا کلام بغرضِ اصلاح غالب کے پاس بھیجا ہے تو اس کے ساتھ خط میں لکھا کہ مجھے آج تک کبھی ایک مصرع تک موزوں کرنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ اگر وہ اس سے پہلے شعر کہتے ہوتے اور موتمن سے اصلاح کا سلسلہ ہوتا تو یہ بات پوشیدہ رہنے والی نہ تھی اور نواب صاحب کو اس غلط بیانی کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

ناظم کا دیوان دو مرتبہ شائع ہوا۔ پہلے ۱۲۷۸ھ میں دوسری مرتبہ ۱۲۸۶ھ میں۔ پہلے دیوان میں سراسر غالب کا اصلاحی کلام ہے اور دوسرے میں امیر کا دیکھا ہوا بھی موجود ہے، جن سے وہ غالب کے بعد مشورہ کرتے رہے۔ امیر مینائی لکھتے ہیں کہ ناظم نے مجھ سے بھی اصلاح لی۔ واللہ اعلم۔ ناظم کی طبیعت میں شوخی اور رنگینی اور مضمون آفرینی کا مادہ خوب ہے۔ بالخصوص جہاں وہ گفتگو کی طرز میں مصرعے کے مصرعے موزوں کر جاتے ہیں تو بہت پُرلطف معلوم ہوتا ہے۔

یہ شبہہ عام طور پر وارد کیا گیا ہے کہ ناظم کے دیوان میں غزلوں کی غزلیں ایسی ہیں جن پر غالب کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے۔ وہی اندازِ فکر، وہی اسلوبِ بیان، وہی مضمون آفرینی اور خاص خاص الفاظ اور ترکیبیں، جو غالب کے کلام کی خصوصیات ہیں، ہمیں ناظم کے دیوان کی کئی غزلوں میں اس حد تک ملتی ہیں کہ ہم انھیں محض استاد کی اصلاح تک محدود نہیں کر سکتے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ "کلامِ خوش" استاد نے خود کہہ کے شاگرد کے حوالے کر دیا تھا۔ اس شبہے کو تقویت ایک اور بات سے بھی ہوتی ہے کہ ناظم ۱۸۵۷ء کے شروع میں غالب کے

شاگرد ہوئے اور ان کا ضخیم دیوان چار برس بعد ۱۸۶۱ء میں شائع ہوا۔ ایک بالکل مبتدی کے لیے جس نے اس سے پہلے کبھی ایک مصرع تک نہ کہا ہو، اتنی قلیل مدت میں، اتنے وافر کلام کا مالک ہو جانا حیرت ناک ضرور ہے۔

اب مختصر انتخاب ملاحظہ کیجیے۔

ہونے دیا نہ شاد، یہ دن پھر کہاں مجھے
"ہے ہے تمھیں رقیب کے مرنے کا غم ہوا"

تو نہ آیا پر اجل وقت سے پہلے آئی
آدمی اس کی مگر اتنی تمنا کرتا

ہے یہ ساقی کی کرامت، کہ نہیں جام کے پاؤں
اور پھر بزم میں سب نے اُسے چلتے دیکھا

واعظ و شیخ سبھی خوب ہیں، کیا بتلاؤں!
میں نے مے خانے سے کس کس کو نکلتے دیکھا

کیا تم نہ جانتے تھے کہ بے خانماں ہوں میں
پھرتا ہے نامہ بر، مرا گھر پوچھتا ہوا

فقیر بن کے گیا واں، تو کیا سوال کروں
مگر کہوں، کہ "بھلا کر ترا بھلا ہوگا"

تیرے گھر وہ آئے ناظم، تو یہ اضطراب کیا ہے؟
کوئی پادشاہ آیا! کوئی شہریار آیا

آدمی کے ساتھ سو آزار ہیں، یہ کیا کہ بس
آہ کی اور رازِ اُلفت آشکارا ہوگیا

ہوتے ہی دردِ دل کا بیاں اُٹھ کھڑے ہوئے
یعنی یہ ایسے ہیں، کہ نہ اِن سے سُنا گیا

جب کہا اُن سے کہ ہے کچھ مجھے کہنا، تو کہا
"سُن لیا ہم نے، کوئی شکوہ بے جا ہوگا"

معتقد ہوں کعبہ کا ناظم، مگر جا کر وہاں
عبرت آتی ہے، کہ کیا بت خانہ ویراں ہوگیا

تم میں شہرہ جو وہ آفتِ زمانہ ہوا
فلک کو عذرِ ستم کے لیے بہانہ ہوا

یہ غصہ ہے کہ دلِ مضطرب نشانہ تھا
ہوا جو تیر خطا، میں گنہ گار ہوا

انداز نیا ہے، دل لگی کا
ہنستے ہیں، پتا نہیں ہنسی کا

یہ خوشی کیا ہے، کہ ہے ذکر ہمارا ہوتا
ہوتے ہم اور ہمیں بات کا یارا ہوتا

ہی تم ہو، وہی خنجر ہے، پر انصاف کرو
ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہو کیا میرے بعد

بدل آکے کہو در پہ، کہ وہ گھر میں نہیں ہیں
کیا ہم نہیں پہچانتے" سرکار کی آواز

ہم نے کہا کہ دعوائے اُلفت مگر غلط
کہنے لگے کہ ہاں غلط اور کس قدر غلط

لیتے ہو کہ "وہ بھی یہی کہتے ہیں، کروں کیا
کہتے ہو کہ دل جوئیِ اعدا نہ کرو تم"

ہم تم کو بُرا کہتے ہیں، یا خُو کو تمہاری
لو خُو کے بھی اچھے سہی، جھگڑا نہ کرو تم

اب لکھیں گے شکوۂ بیداد، ہم دل کھول کر
نام اُن کا آسماں ٹھیرا لیا تحریر میں

فسانۂ ستمِ ہجر ہے، سوال نہیں
نہ دو جواب، سُنے جاؤ، کچھ ملال نہیں

وفا شعاریٔ ناظم یقین نہیں، نہ سہی
یہ کون شخص ہے، اس کا بھی کچھ خیال نہیں

میری وفا کی داد، نہ جُرمِ عدو کی بحث
کیا خوبیاں ہیں میرے تغافل شعار میں

سب کے اس عمر میں ہو جاتے ہیں ایسے ہی حواس
تجھ سے کچھ شکوہ، اے فلکِ پیر نہیں

ہوئے ہو اک بتِ دل فریب پر عاشق ق
زبس کہ آپ کو ناکردہ کار سمجھے ہو

صلاح و مشورہ رکھتے ہو مجھ سے، اور مجھے
فنونِ عشق کا آموزگار سمجھے ہو

شریکِ دولتِ ناز و نیاز رکھتے ہو
انیسِ خلوتِ شب ہائے تار سمجھے ہو

اگرچہ خوش ہوں، پر آتا ہے رحم بھی تم پر
کہ مجھ سے غم زدہ کو غم گسار سمجھے ہو

کہتے ہو کہ ہم غیر کو آنے نہیں دیتے
سچ ہو بھی، پر میں نے سُنا اور ہی کچھ ہے

وفا کی ہم نے، اور تم نے جفا کی
تم اچھے، ہم بُرے، قدرت خدا کی

جانتے ہم بھی کہ ہے خلد میں راحت کیسی
ملتی اس میں سے اگر ہم کو یہاں تھوڑی سی

کہے یہ کون کہ تم کیوں وفا نہیں کرتے
وہ کیا کہیں گے، مگر یہ کہ "جا نہیں کرتے"

نہ تھی تم سے توقع، یوں عدو کے دم میں آنے کی
کہاں جاتی رہی وہ خُو، محبت آزمانے کی

اس سے کیا بحث، کہ ہوگی شبِ فرقت کیسی
موت اس میں نہیں آتی، یہ مصیبت کیسی

نہ گذر دوست تک اپنا، نہ بغیر اس کے قرار
کس پہ آئی ہے اور آئی ہے طبیعت کیسی

حشر کو کھینچوں ترا دامن، بھلا دیکھوں کہ تو
واں بھی جھنجھلا کے کہے "یوسف علیخاں چھوڑ دے"

جو کہیے، دردِ دل سنیے، تو کہتے ہیں کہ "ہاں کہیے"
اسی کو دردِ دل کہتے ہیں، جو گفتار میں آئے

نالے کے مجھے طور بہت یاد ہیں، لیکن
طاقت کا گماں بھی ہو دلِ غمزدہ پر کچھ

ہو رات، تو جیتے رہیں اُمیدِ سحر پر
یہ روزِ سیہ ہے، شبِ دیجور نہیں

[اخبار الصنادید؛ انتخابِ یادگار (۱) ص ۶۹-۸۲؛
نقدِ غالب، ص ۲۸۶ - ۳۱۳]

نامیؔ ـــــــ محمد علی خاں مونگھیری

مونگھیر کے رؤسا میں ان کا شمار تھا۔ ان کے کلام میں صرف یہ ایک فارسی قطعۂ تاریخ مل سکا جو انھوں نے غالب کے ایک دوسرے شاگرد خواجہ فخر الدین حسین سخن کے دیوان کے لیے لکھا تھا ؎

جنابِ خواجہ فخر الدین بہادر	کہ زندہ باز از و نامِ سخن شد
بطرزِ عاشقانہ گفت دیواں	کہ مطبوعِ دلِ ہر اہلِ فن شد
زمینِ شعرِ او، ہم اوجِ گردوں	نقاطش رشکِ پروین و پرن شد
بفکرِ تازہ، دادِ نظم دادہ	کز و متروک مضمونِ کہن شد
بہ گل بندیِ الفاظِ نگاریں	بیاضِ صفحہ صد رشکِ چمن شد
ببیں سحرِ حلالش بہرِ حاسد	کہ در وصفش زباں قفلِ دہن شد
سرِ اعدا زدہ تاریخ گفتم	ز دل مقبولِ دیوانِ سخن شد

۱۳۰۳ - ۱ = ۱۳۰۲ ھ

{ دیوانِ سخن }

نشاطؔ ـــــــ بابو ہر گوبند سہائے اکبر آبادی

والد کا نام منشی خوب لال تھا۔ قوم کے ماتھر کائستھ تھے۔ ۸؍ دسمبر ۱۹۲۸ء کو کوئل میں پیدا ہوئے۔ اگرچہ بزرگوں کا اصلی وطن پٹنہ تھا، لیکن ۱۸۰۳ء میں منشی خوب لال وہاں سے بل ضلع علی گڈھ آ گئے۔ بعد میں یہاں سے بھی نقلِ مکان کر کے آگرے آ رہے۔ ان کے الد علی گڈھ اور متھرا میں اچھی خاصی جائداد چھوڑ مرے تھے جس میں زمین معافی، لمکانات، غات وغیرہ تھے۔ جب یہ آگرے آئے تو یہاں جان بیٹس صاحب کی کوٹھی اور باغ

خرید کر اُس جگہ اپنے نام پر "ہر گوبند گنج" آباد کیا۔ آج کل آگرہ میونسپل کمیٹی کے دفتر اور سمن گنج اِسی جگہ میں ہیں۔

پہلے پانچ برس تک دہلی صدر امینی میں عہدۂ نظارت پر مامور رہے لیکن ۱۸۵۵ء میں یہاں سے استعفیٰ دے کر گوالیار چلے گئے اور وہاں میر منشی ہو گئے۔ ابھی زیادہ زمانہ نہیں گذرا تھا کہ ۱۸۵۷ء کا مشہور انقلاب ہو گیا۔ اس لیے یہ نوکری چھوڑ کے علی گڑھ چلے آئے۔ یہاں ۱۸۵۸ء سے ۱۸۶۴ء تک عدالت دیوانی میں نائب سررشتہ دار رہے۔ یہیں اُنھوں نے انگریز سیشن جج مسٹر جان شور کے کہنے پر وکالت کا امتحان دیا، جس میں کامیاب ہو گئے۔ اور پھر ۱۸۶۲ء میں وکیل دیوانی بن کے آگرے آئے اور یہ شہر کچھ ایسا پسند آیا کہ یہیں کے ہو رہے۔ ۱۸۶۸ء میں آگرے میں میونسپل کمشنر چُنے گئے۔ اُسی زمانے میں لاٹ صاحب کے درباروں میں شرکت کا اعزاز حاصل ہوا۔ اپنے حُسنِ لیاقت کے باعث ۱۸۷۵ء میں ریاست کوٹہ میں جج مقرر ہوئے تھے لیکن چونکہ صحت خراب رہنے لگی تھی، سال بھر بعد وہاں سے مستعفی ہو کر گوشہ نشین ہو گئے۔ آخری زمانے میں خیالات زیادہ تر مذہب کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ چنانچہ دریائے گنگا کے کنارے راج گھاٹ میں ایک دھرم شالہ کی تعمیر کی اور اس کی غور و پرداخت اور خرچ کے لیے ایک وقف قائم کیا۔ یہاں ۱۸۷۷ء میں اُنھوں نے دور و نزدیک سے ۸۰۰ عالموں اور پنڈتوں کو جمع کر کے بڑے پیمانے پر ایک یگیہ بھی کیا تھا۔

اسی جگہ ۳۔ مئی ۱۸۹۱ء کو انتقال کیا۔ اولاد جسمانی میں کئی لڑکیاں اور دو صاحبزادے بابو رام نرائن اور بابو برج نرائن یادگار چھوڑے دونوں کی اولاد موجود ہے۔ آج کل اس خاندان کے اکثر افراد ڈیرہ دون میں مقیم ہیں۔

اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں کہتے تھے۔ تصنیفات میں نشاط المحاسین عبادی کی کتاب منظوم، تالیف ہر گوبند (۱۸۷۰ء)، تعلیم اخلاق اور اُردو فارسی کا مشترکہ دیوان "نشاط الاحباب" (۱۸۷۷ء)، کائستھ نکتادلی وسندھیو پاسن (۱۸۷۷ء)، الہامِ ضمیر (۱۸۸۹ء) وغیرہ یادگار ہیں۔

کلام کا نمونہ یہ ہے۔

ذکرِ خیر اوروں کا، اور ہے گلہ اپنا ۔۔۔ بات پا گئے ہم بھی، گم ہے مدعا اپنا

ناتمی صحت ہوں، مرگ ہے شفا اپنی | چارہ سازِ بے پروا، دردِ لا دوا اپنا
اُن لبوں سے مرا گلہ نکلا | منہ کو تکتا ہوں میں، یہ کیا نکلا
ہم نے سجدے کو سر جھکایا تھا | بارے واں اُن کا نقشِ پا نکلا
غیر سے مذکور ہمارا کیا | خوب کیا آپ نے، اچھا کیا
شیشۂ مے نہاں بغل میں، نشاطا! | اور دعویٰ ہے پارسائی کا
نشاط انگیز ہے یہ طرزِ گفتار | "پیو مے" اب بنو گے پارسا کیا"
خواہشوں کا چھوٹ جانا ہے نشاط | روتے ہیں ناداں کو دانا دیکھ کر
یہ دلِ دیوانہ بس مسرور ہے | اپنے گھر میں شکلِ صحرا دیکھ کر
وعدوں ہی کو تمھارے نہ سمجھے ہیں ہم دروغ | تم جھوٹے، عہد جھوٹے، تمھاری قسم دروغ
آئینہ رونمائے سکندر ہی گرچہ ہو | ہستی باعتبارِ وجودِ عدم دروغ
دشمن کی مرگ کی بھی نہ ہم آرزو کریں | کس طرح لوحِ زیست پہ کھنچیں قلم دروغ
نشاطا! دل سے پہنچے تا درِ کعبہ، دلے واں بھی | نشانِ یار گم پایا، پڑا تھا صاف ویرانہ
بے جرم پائمال عدو کو نہ کیجیے | اتنا خیال بس مرے سر کی قسم رہے
تبسم پر اگر چینِ جبیں کا فیصلہ ٹھیرے | ادائے معنیِ دع ما کدر، خذ ما صفا ٹھیرے
غم و اندوہ و حسرت یا نشاط و شادی و فرحت | وہی تسلیم ہے ہم کو، تری جس میں رضا ٹھیرے

[شعر و سخن، ص ۱۲۴ - ۱۲۶؛ ماتھر پیتر کا،
اپریل ۱۹۲۶ء؛ آج کل، فروری ۱۹۵۵ء]

نظام ——— نواب محمد مردان علی خاں مرادآبادی

قوم کے یوسف زئی افغان تھے۔ ان کا خاندان مرادآباد کے رؤسا میں شمار ہوتا تھا۔ بزرگ خاندانِ مغلیہ اور شاہانِ اودھ کے زمانے میں مناصبِ جلیلہ پر متمکن رہے۔ ان کی تعلیم

گھر پر ہوئی۔ ۱۸۵۰ء میں ملازمتِ سرکارِ انگریزی میں داخل ہوئے۔ سب سے پہلے راول پنڈی (پنجاب) میں کمشنر صاحب بہادر کے دفتر میں پیشکار مقرر ہوئے۔ بتدریج ترقی کر کے تھانہ داری اور پھر تحصیل داری کا عہدہ پایا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے دوران میں یہ حسن ابدال (ضلع اٹک پنجاب) میں تحصیل دار تھے۔ اس زمانے میں انھوں نے مری کے علاقے کا انتظام خاطر خواہِ حکام کیا جس کے لیے بعد میں سندِ خوشنودی وغیرہ عطا ہوئی۔ لیکن یہ اپنی ملازمت اور قلیل معاش سے خوش نہیں تھے، اس لیے اگلے ہی برس یعنی ۱۸۵۸ء (دسمبر) میں انگریزی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا جو منظور کر لیا گیا۔

سال بھر بعد ریاست مالیر کوٹلہ میں نواب صاحب کے مدار المہام مقرر ہوئے۔ یہاں چار برس بہت نیک نامی سے رہے۔ جنوری ۱۸۶۱ء میں والیِ ریاست کپور تھلہ کے چھوٹے بھائی کنور بکرما سنگھ کے سکتر بن کے چلے گئے۔ تین سال تک یہاں بھی معتمد علیہ رہے۔ اس دوران میں حالات ایسے پیدا ہو گئے کہ انھیں مہاراجہ شیو دھیان سنگھ والیِ الور کی طرف سے توقع دلائی گئی کہ اگر الور آئیں تو...... معقول عہدے پر مقرر کر دیے جائیں گے۔ چناں چہ انھوں نے اپریل ۱۸۶۴ء میں کپور تھلہ کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ اتفاق سے وہ توقع بھی پوری نہ ہوئی اور یہ بے روزگار ہو گئے۔ تگ و دو کے بعد ۱۸۶۷ء میں مارواڑ میں نائب دیوان مقرر ہوئے۔ بعد میں دیوان ہو گئے۔ اسی زمانے میں مہاراجہ بہادر کی طرف سے "نظام الدولہ منتظم الملک نواب محمد مردان علی خاں بہادر تحت قائم جنگ" خطاب عطا ہوا۔ ساتھ ہی جاگیر اور نقارہ و نشان کا اعزاز بھی ملا۔ اوّل درجے کے سرداروں کی تعظیم مقرر ہوئی۔ غرض کہ یہاں بہت تزک و احتشام اور اعزاز و اکرام سے رہے۔

انھوں نے ریاست کا انتظام ایسا عمدگی سے کیا، کہ ہر شعبے میں ترقی ہوئی۔ شروع سے معدنیات سے دل چسپی تھی۔ پنجاب کے قیام کے دوران میں بھی چند مفید چیزیں مثلاً ثعلب مصری، سنگِ غربال، سنگِ طبع وغیرہ برآمد کیے تھے۔ لیکن مارواڑ کی دیوانی کے زمانے میں بارہ مختلف کانیں دریافت کیں۔ ان میں چاندی، لوہا اور مس زیادہ اہم تھیں۔ اس کے علاوہ سڑکیں بنوائیں۔ ٹکسال قائم کی۔ ان کے حسنِ انتظام سے ریاست نے بہت

ترقی کی۔ میو کالج اجمیر میں جو گھنٹہ ہے وہ بھی ساڑھے تین ہزار کے خرچ پر ان ہی نے لگوایا تھا۔
ریاست جودھپور کی ملازمت سے فارغ ہو کر ۱۸۷۶ء (۱۲۹۲ھ) میں حج بیت اللہ و زیارتِ مدینہ منورہ سے مشرف ہوئے اس کی تاریخ نکالی "نظام حاجی الحرم"۔ ساری عمر مجرد رہے۔ بروز دوشنبہ ۲۔ جون ۱۸۷۹ء (۱۱۔ جمادی الثانی ۱۲۹۶ھ) کو سری نگر (کشمیر) میں ہیضہ سے وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔ تاریخ مرزا محمد علی بیگ عاقل نے کہی ؎

تھی فکر مجھے ہو سالِ رحلت — ہاتف نے معاً مجھے بتایا
عاقل لکھو یہ بے سرِ بیم — داغِ دلِ دوستانِ رعنا

۲ - ۱۸۸۱ = ۱۸۷۹ء

علم دوست آدمی تھے۔ شروع میں مضطر تخلص کیا۔ بعد میں اُسے بدل کر رعنا کر لیا۔ جب نوابی کا خطاب ملا، تو نظام لکھنے لگے۔ چنانچہ ایک رباعی میں ان تینوں کا ذکر کیا ہے ؎

آغازِ سخنوری میں مضطر تھا نام — رعنا تھا شبابِ شاعری کے ہنگام
ہے زیرِ نگیں جو کشورِ نظم، تو اب — نواب خطاب اور تخلص ہے نظام

صاحبِ تصنیف تھے۔ علم جفر میں جفر جامع اور جفر کبیر کے علاوہ ایک ضخیم کتاب شاہِ ایران کے نام پر ظلِ ناصری (۱۲۸۱ھ) تالیف کی۔ تاریخ میں ایک مبسوط کتاب "تاریخ البلاد (۱۲۷۷ھ) لکھی۔ علم موسیقی میں بھی دو کتابیں یادگار ہیں نغمۂ صنم اور غنچۂ راگ (۱۲۷۹ھ) ریاست جودھپور کی تاریخ "تواریخِ مارواڑ (۱۸۶۹ء)" کے نام سے لکھی۔ دو کتابیں مسمریزم کے مضمون پر بھی لکھیں۔ سیرِ غایت (۱۲۸۳ھ) اور طلسم نظر (۱۲۸۹ھ) اُردو میں اس موضوع پر غالباً یہ پہلی کتابیں ہیں۔ انگریزی کی مشہور کتاب تاڈ راجستھان کا اردو ترجمہ بھی اُن ہی کی توجہ سے چھپا۔
ان کی مدح میں مختلف شاعروں نے جو قصیدے لکھے تھے۔ اُن کا انتخاب منشی غلام محمد خان تپش نے مرتب کر کے قصاید مدحیہ نظام کے نام سے مطبع نولکشور لکھنؤ میں ۱۸۷۱ء میں چھاپا تھا۔ اس کے شروع میں مختصر سوانح عمری بھی ہے۔ ان کے اپنے اُردو فارسی کلام کا مجموعہ بھی اسی مطبع سے کلیات نظام کے نام سے دسمبر ۱۸۷۵ء میں

چھپا۔ یہ مشتمل ہے دیوانِ اول و دوم اور مہر نبوت (نعت، منقبت و سلام وغیرہ) اور واسوخت، مسدس ضبطِ عشق پر۔ اس واسوخت کا نام تاریخی ہے (۱۲۸۱ھ) اور اس میں ۳۲۴ بند ہیں۔ منشی فدا علی عیش نے ۱۸۶۹ء میں لکھنؤ سے دو جلدوں میں واسوختوں کا ایک مجموعہ شعلۂ جوالہ کے نام سے شائع کیا تھا۔ نظام کا یہ واسوخت (ضبطِ عشق) اس کی دوسری جلد میں شامل ہے۔

کلام پر غالب کے بعد دبیر الدولہ منشی مظفر علی خان اسیر مرحوم سے بھی اصلاح لی۔ اگرچہ بہت پُرگو تھے، لیکن کلام میں کوئی خاص بات نہیں۔ وہی پُرانا ناسخی رنگ ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

یہ رات آئی، کہ سر پر مرے عذاب آیا | کٹا تھا روزِ مصیبت خدا خدا کر کے
لگے ہاتھ، اگر بر سرِ عتاب آیا | وہ زود رنج ہے اس کو نہ چھیڑ نار عنا
موت آجاتی تو اس زیست سے بہتر ہوتا | ہجرِ محبوب میں کیا کیا نہ اذیت کھینچی!
ہر گلِ باغِ جہاں سے ہے تری بُو پیدا | جلوہ ہر رنگ میں دیکھا ترا گلرو پیدا
دل میرا آشنا ہے، نہ میں آشنائے دل | ہیں دل سے بے نیاز ہوں، دل مجھ سے بے نیاز
بہ گلستاں صفتِ ابرِ بہاراں رفتم | یاد آں روز کہ در کوے تو گریاں رفتم
بر درِ جانِ جہاں، وہ بہ چہ ساماں رفتم | سر بکف، آہ بدل، بارِ ندامت بر دوش
پہنچے آغازِ محبت میں ہی انجام کو ہم | کھو چکے پہلے ہی ناموس کو اور نام کو ہم
کون دل ہے، جو پائمال نہیں | غم سوا عشق کا مآل نہیں
تھا روح کا ہمدم، نہ پھرا جا کے وطن سے | گذرا ہے مرا نالۂ دل چرخِ کہن سے
اب جانِ حزیں چھوٹ گئی رنجِ دمحن سے | گھٹ گھٹ کے غمِ ہجر میں، جی نکلا ہے تن سے
کسی سے تم جو نہیں آج گفتگو کرتے | کھو خیال میں کس کے اُداس ہو رعنا!

[مقدمۂ ردِ کد ملازمت اور رعنا ص ۳۸۔ ۴۰؛
مقدمہ قصاید مدحیہ نظام؛ اودھ اخبار ۱۳ / ۱۶ جون
۱۸۷۹ء؛ مقدمۂ کلیات نظام]

نیرّ رخشاں ——— نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر دہلوی

چھٹی صدی ہجری میں ساداتِ علوی میں سے ایک بزرگ خواجہ احمد یسوی (متوفی ۵۶۲ھ) باب ارسلان (ترکستان) کے مشہور ولی اللہ گزرے ہیں۔ یہ حضرت علیؑ کے چھوٹے صاجزادے محمد بن الحنفیہ کی نسل میں سے تھے۔ اُنھوں نے سلسلۂ نقشبندیہ کے مشہور شیخ حضرت خواجہ یوسف ہمدانی سے اکتسابِ فیض کیا اور اُنھیں سے سندِ خلافت لی۔ ترک اُنھیں ادب اور عقیدت سے "اتا یسوی" سے خطاب کرتے تھے۔ اُن کی اولاد میں دین و دنیا کے مشاہیر پیدا ہوئے۔ اُنھیں میں سے ایک خواجہ محمد امین حکومتِ بخارا میں سلطان بیگی کے عہدۂ جلیلہ پر فائز تھے۔ خواجہ محمد امین کے صاجزادے خواجہ عبدالرحمٰن بلخ میں منتظمِ دیہات اور مہتمم دارالضرب شاہی رہے۔ اگرچہ یہ خاندان نسب کے لحاظ سے خاندانِ سادات میں سے تھا مگر شاہی منصب دار ہونے کے باعث مورخوں اور تذکرہ نگاروں نے اُن کا ذکر مرزا اور خاں کے القاب سے کیا ہے۔

خواجہ عبدالرحمٰن کے تین صاجزادے تھے۔ قاسم جان۔ عالم جان۔ عارف جان۔ مرزا عارف جان سب سے چھوٹے تھے۔ یہ تینوں بھائی احمد شاہ (۱۷۴۸-۱۷۵۴ء) کے عہد میں ترکوں کا ایک مسلح دستہ ساتھ لیے بخارا سے ۱۷۵۰ء کے قریب ہندستان آئے۔ ان دنوں حکومتِ دہلی کی طرف سے مرزا محمد بیگ اٹک کے صوبہ دار تھے۔ یہ قافلہ چند دن اُن کے پاس ٹھیرا۔ اسی اثنا میں صوبہ دار موصوف نے مرزا عارف جان کو اپنی فرزندی میں لے لیا اور اپنی دخترِ بلند اختر اُن کے حبالۂ عقد میں دے دی۔ اس کے بعد ایک عرصے تک مرزا عارف جان یہاں رہ کر علاقے کے نظم و نسق میں مرزا محمد بیگ کی مدد کرتے رہے۔ آخر اُن کی شجاعت اور قابلیت کی شہرت اس دور دست علاقے سے نکل کر پایۂ تخت دہلی تک جا پہنچی اور یہ حسبِ طلب شاہ عالم کے عہد میں (۱۷۵۹ء-۱۸۰۶ء) دارالخلافے میں حاضر ہوئے۔

مرزا عارف جان کے چار بیٹے تھے۔ نبی بخش خاں، احمد بخش خاں، الٰہی بخش خاں اور محمد علی خاں۔ ان میں سے احمد بخش خاں اور الٰہی بخش خاں نے شہرتِ دوام کے خلعت حاصل کیے۔ یہی وہ الٰہی بخش خاں ہیں جو اُردو زبان میں معروف کے تخلص سے مشہور ہیں اور جو حضرت مولانا فخرالدین

چشتی (متوفی ۱۱۹۹ھ) کے مرید خاص اور خلیفہ تھے۔ معروف نے اگر علم و فضل اور تصوف و سلوک کے میدان میں شہرت حاصل کی، تو اُن کے بڑے بھائی احمد بخش خاں نے ریاست و جہانبانی کی دنیا میں اپنا سکہ جاری کیا۔

احمد بخش خاں اٹک میں ۱۷۵۶ء میں پیدا ہوئے۔ جب خاندان وہاں سے دہلی منتقل ہوا تو یہ بھی یہاں آگئے۔ جوانی کا زمانہ یہیں گذرا۔ پہلے گوالیار میں بزمرۂ سواراں ملازم ہوئے۔ معقول بسر اوقات تھی لیکن کسی سبب سے یہ روزگار ہاتھ سے جاتا رہا۔ تو اس کے بعد گھوڑوں کی تجارت کرنے لگے۔ ایک دفعہ اسی سلسلے میں دہلی آرہے تھے کہ راستے میں مہاراجہ بختاور سنگھ بہادر والیِ الور سے ملاقات ہو گئی جس کے نتیجے میں انھوں نے دربارِ الور کی ملازمت قبول کرلی۔

مہاراجہ بختاور سنگھ ان کی فرض شناسی اور حسن کارکردگی سے بہت خوش ہوئے اور انھیں دہلی میں لارڈ لیک کے یہاں اپنا وکیل مقرر کر دیا جو آج کل کی سفارت کے مرادف تھا۔ یہاں بھی انھوں نے اپنے فرائضِ منصبی کو اس خوش اسلوبی سے ادا کیا، کہ ایک طرف انگریز اُن کی معاملہ فہمی کے مداح تھے تو دوسری طرف مہاراجہ بہادر بھی اُن کی وفاداری سے ہر طرح مطمئن تھے۔

۱۸۰۱ء میں انگریزوں نے ریاست بھرتپور میں قلعہ ڈیگ پر چڑھائی کی۔ احمد بخش خاں کی درخواست پہ دربارِ الور نے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ یہ بڑی گھمسان کی لڑائی تھی۔ ایک موقع پر انگریز جرنیل فریزر کی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ احمد بخش خاں اپنی جان پر کھیل کر اُسے دشمنوں کے نرغے میں سے نکال لائے۔ میدان تو انگریزوں کے ہاتھ رہا لیکن جرنیل فریزر کے زخم مہلک ثابت ہوئے اور وہ جانبر نہ ہو سکے۔ مرنے سے پہلے انھوں نے احمد بخش خاں کو ایک سندِ خوشنودی لکھ دی جس میں حکومتِ انگریزی سے سفارش کی کہ احمد بخش خاں کی خدمات کا مناسب صلہ دیا جائے۔ چناں چہ جب دہلی میں فتح کا دربار ہوا تو لارڈ لیک نے انھیں فیروز پور جھرکہ، سانگرس، پونا پانہ، بچھور، اور نگینہ کا علاقہ استمراری جاگیر میں عطا کیا اور فرمان میں اُن کا نام لکھوایا "فخر الدولہ، دلاور الملک نواب احمد بخش خان بہادر رستم جنگ" مہاراجہ بختاور سنگھ نے اس پر اپنی طرف سے پرگنہ لوہارو کا اضافہ کر دیا۔

نواب احمد بخش خاں نے اپنے پیچھے چار بیٹے چھوڑے۔ ایک بیوی سے نواب

شمس الدین احمد خاں (متوفی ۱۸۳۵ء) اور ابراہیم علی خاں، اور دوسری سے نواب امین الدین احمد خاں اور نواب ضیاء الدین احمد خاں۔ شمس الدین احمد خاں اپنے والد ماجد کی حینِ حیات ۱۸۲۶ء میں فیروز پور جھرکہ کے حکمران ہو گئے تھے۔ لوہارو کی جاگیر نواب احمد بخش خاں نے اپنے دوسرے بیٹوں کے نام لکھ دی۔ ہماری زبان کے مشہور شاعر نواب مرزا داغ ان ہی نواب شمس الدین احمد خاں کے بیٹے تھے۔

نواب احمد بخش خاں اکتوبر ۱۸۲۷ء (ربیع الاول ۱۲۴۳ھ) میں فوت ہوئے۔ "مینو مقام فخر الدولہ" تاریخِ وفات ہے۔ دہلی کے باہر مہرولی میں درگاہِ حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ (متوفی ۶۳۳ھ) میں مولانا فخر الدینؒ کے مزار کے پائیں مدفون ہیں۔

نواب ضیاء الدین خاں اپنے والدِ بزرگوار کی وفات کے وقت ۶ برس کے تھے۔ یہ فیروز پور جھرکہ میں اکتوبر ۱۸۲۱ء میں پیدا ہوئے۔ تقسیم جایداد کی رُو سے پرگنہ لوہارو ان کے ساتھ، ان کے بڑے بھائی نواب امین الدین احمد خاں، دونوں کے حصے میں آیا تھا جب تک ضیاء الدین خاں سنِ بلوغ کو نہیں پہنچے، جائداد کا نظم و نسق بڑے بھائی کے ہاتھ میں رہا۔ اور ان کے حصے کی آمدنی خزانے میں جمع ہوتی رہی۔ بالغ ہونے پر نواب ضیاء الدین خاں نے مطالبہ کیا کہ مجھے بھی ریاست میں برابر کا شریک بنایا جائے، ورنہ ریاست دو حصوں میں تقسیم کر دی جائے۔ حکومتِ انگریزی نے یہ دونوں تجویزیں نامنظور کیں اور چونکہ بھائیوں میں کشمکش روز بروز بڑھتی جا رہی تھی اس لیے ۱۸۴۸ء میں فیصلہ کیا کہ آئندہ نواب ضیاء الدین خاں کو خزانۂ ریاست سے اٹھارہ ہزار روپیہ نقد سالانہ وظیفہ ملتا رہے اور وہ ریاست کے معاملات میں دخل نہ دیں۔ اس پر یہ لوہارو سے نقلِ مکان کر کے مستقلاً دہلی میں مقیم ہو گئے۔ ان کی وفات کے بعد یہ وظیفہ گھٹا کر بارہ ہزار سالانہ کر دیا گیا تھا۔ جو ملک کی آزادی تک ان کے خاندان میں جاری رہا۔

نواب ضیاء الدین احمد خاں کی تعلیم و تربیت گھر پر ہوئی۔ علمِ تفسیر و حدیث حضرت شاہ عبدالقادر (ابن حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی) کے شاگردِ رشید مولوی کریم اللہ سے، ادب و فقہ جناب مفتی صدر الدین آزردہ سے اور فلسفہ و منطق مولانا فضل حق خیرآبادی سے

حاصل کیے۔ فارسی میں غالب کے شاگرد تھے اور مشق سے خود اس زبان کے استادِ بے بدل ہو گئے۔ عربی اور ترکی بھی اچھی جانتے تھے۔ ان کی فارسی میں استادانہ حیثیت کا اعتراف اُن کے معاصرین کو بھی تھا جس کا ثبوت مولانا شبلی مرحوم کی زندگی کے ایک واقعہ سے ہوتا ہے۔

مولانا شبلی نے علی گڈھ کے قیام کے ابتدائی زمانے میں (۱۸۸۴ء) شیخ علی حزیں کی ایک طرح میں غزل کہی: حیراں چہ کنم، فراواں چہ کنم۔ بعض لوگوں نے اعتراض کیا کہ اُستاد کی غزل پر غزل لکھنے سے حاصل؟ آخر یہ ٹھیری کہ حزیں اور شبلی دونوں کی غزلیں اہلِ بڑے حضرات کے پاس محاکمے کے لیے بھیجی جائیں۔ خواجہ عزیز الدین عزیز لکھنوی اور نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر درخشاں (اور غالب کے ذو القدر خان بہادر غلام غوث خاں بے خبر بھی) حکم ٹھیرے۔ دونوں غزلیں مقطعے حذف کر کے ان اصحاب کی خدمت میں بھیجی گئیں۔ سب نے فیصلہ کیا کہ شبلی کا کلام اہلِ زبان کی شان رکھتا ہے اور سلف کے کلام کا ہم پلہ ہے۔

نواب ضیاء الدین احمد خاں نجوم اور ہیئت میں بھی بہت اعلیٰ واقفیت رکھتے تھے۔ تاریخ اور جغرافیہ میں ان کی دستگاہ کا اعتراف سب نے کیا ہے۔ بالخصوص ایشیا کے مختلف ممالک کی تاریخ پر ایسا عبور تھا کہ حیرت ہوتی تھی۔ تمام عمر مطالعۂ کتب میں گذری۔ اُن کے کتب خانے میں ہر طرح کے علوم کی بڑھیا سے بڑھیا کتابیں موجود تھیں۔ افسوس کہ یہ سارا سرمایہ ۱۸۵۷ء میں وقفِ تاراج ہو گیا۔ غالب ایک خط میں لکھتے ہیں کہ یہ بیس ہزار سے کم مالیت کا نہ ہوگا۔ غدر کے بعد پھر جمع کرنے لگے۔ جب حکومتِ ہند کے سکرٹری الیٹ صاحب نے اپنی مشہور تاریخ لکھی جس میں ہندوستان کے فارسی اور عربی مورخوں کی کتابوں کے ترجمے شائع کیے ہیں تو نواب ضیاء الدین خاں نے انھیں فراہمیِ کتب اور ترجمے میں بہت مدد دی تھی جس کا اعتراف صاحب موصوف نے کتاب کے دیباچے میں کیا ہے۔ نواب صاحب کا یہ کتب خانہ جو غدر کے بعد جمع ہوا تھا اُن کی وفات کے بعد اُن کے صاحبزادے نواب سعید الدین احمد خاں نے ندوۃ العلماء کو دے دیا۔

غالب کے جو تعلقات اس خاندان سے تھے، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ غالب کی بیوی امراؤ بیگم نواب الٰہی بخش خاں معروف کی بڑی صاحبزادی تھیں جس زمانے

میں نواب شمس الدین احمد خاں فیروز پور جھرکہ کے حکمراں تھے، انھوں نے کوشش کی کہ کسی طرح لوہارو بھی مجھے مل جائے وہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہو گئے اور یہ پرگنہ بھی انھیں مل گیا۔ اس معاملے میں غالب نے اِن دونوں بھائیوں کا ساتھ دیا اور لوہارو کے نواب شمس الدین احمد خاں کی تحویل میں دیے جانے کی سخت مخالفت کی۔ چنانچہ اس علاقہ کی ان دونوں بھائیوں کے نام بحالی میں غالب کی مساعی کا بھی کچھ دخل تھا۔

نواب ضیاء الدین احمد خاں کی تعلیم و تربیت میں غالب نے قدرتاً بہت دلچسپی لی۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ فارسی میں نیرؔ اور اردو میں رخشاںؔ تخلص تھا۔ اپنے استاد کے مایۂ ناز شاگرد ثابت ہوئے اور میرزا کو اُن پر فخر تھا۔ انھوں نے ایک زوردار فارسی قصیدہ نیرؔ رخشاںؔ کی مدح میں کہا ہے (قصیدہ ۶۳) غالب نے اپنی زندگی میں سندِ خلافت لکھ دی تھی۔ خلیفۂ اول نیرؔ رخشاںؔ مقرر ہوئے۔ اور خلیفہ دوم نواب علاء الدین احمد خاں علائیؔ۔ نیرؔ رخشاںؔ کا تمام کلام نظم و نثر بھی غدر میں ضائع ہو گیا تھا۔ بعد میں جو کچھ جمع ہو سکا، اُسے ان کے صاحبزادے نواب سعید الدین احمد خاں طالبؔ نے "جلوۂ صحیفۂ زریں نیرؔ رخشاںؔ" کے تاریخی نام سے (۱۹۱۵ء) میں شائع کرایا تھا۔

مدت سے ضیق النفس کا عارضہ تھا جس سے آخر عمر میں بہت مضمحل ہو گئے تھے" موت سے پہلے صرف دو تین روز تپ رہی تیسرے دن شدت اور اس کے ساتھ بے ہوشی بھی ہو گئی۔ ایک رات اور آدھے دن یہی حالت رہی" آخر ۱۳۔ رمضان ۱۳۰۲ھ (مطابق ۲۷ر جون ۱۸۸۵ء) بروز شنبہ دوپہر کے وقت رحلت فرمائی۔ اسی دن شام کے پانچ بجے اجمیری دروازے کے باہر نماز جنازہ ہوئی اور مہرولی میں حضرت خواجہ بختیار کاکی قدس سرہٗ کی درگاہ میں اپنے والدِ ماجد اور برادرِ بزرگوار کے پہلو میں دفن ہوئے۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعون۔

مولوی رضی الدین احمد خاں دہلوی نے بے مثل مادۂ تاریخ بہم پہنچایا۔ جس پر مولانا حالیؔ نے مصرعے لگائے۔

چوں ضیاء الدین احمد خاں کشید — رخت از دنیا سوے دار السلام
گفت ہاتف بارضیؔ سالِ وفات — "روزِ شنبہ، سیزدہ شہرِ صیام"
۱۳۰۲ھ

یہی کتبہ لوحِ قبر پر کندہ ہے۔ خود مولانا حالیؔ نے اس موقع پر دو رباعیاں کہی تھیں۔

غالبؔ ہے، نہ شیفتہؔ، نہ نیرؔ باقی ۔۔۔ وحشتؔ ہے نہ سالکؔ ہے، نہ انورؔ باقی
حالیؔ، اب اسی کو بزمِ یاراں سمجھو ۔۔۔ یاروں کے جو کچھ داغ ہیں دل پر باقی

قمری ہے نہ طاؤس نہ کبکِ طناز ۔۔۔ آتے ہی خزاں کے سب کر گئے پرواز
تھی باغ کی یادگار، اک بلبلِ زار ۔۔۔ سو اُس کی بھی کل سے نہیں آتی آواز

شمس العلماء مولانا شبلیؔ نے فارسی زبان میں مرثیہ لکھا تھا۔ جو اُن کے کلیات میں موجود ہے۔

نواب ضیاء الدین احمد خاں کا نکاح شرف الدولہ قاسم جان کی پوتی اور مرزا قدرت اللہ خاں کی صاحبزادی امتیاز زمانی بیگم عرف حاجی بیگم (وفات ۵ اکتوبر ۱۸۹۵ء) سے ہوا تھا۔ اولاد میں ایک صاحبزادی معظم زمانی بیگم صاحبہ اور دو صاحبزادے شہاب الدین احمد خاں ثاقبؔ اور احمد سعید خاں طالبؔ تھے۔ ثاقبؔ زندگی ہی میں انھیں جوانا مرگی کا داغ دے گئے۔ طالبؔ ۱۹۲۵ء تک زندہ رہے۔ دونوں کے حالات لکھے جا چکے ہیں۔ معظم زمانی بیگم عرف بگا بیگم کا نکاح زین العابدین خاں عارفؔ کے بڑے صاحبزادے باقر علی خاں کاملؔ سے ہوا تھا۔ اُن کا بھی ۱۰۔ مئی ۱۹۴۵ء کو انتقال ہو گیا ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔

تخلص کے لحاظ سے پہلے چند شعر فارسی کے لکھتا ہوں ؎

مکن ہلاک کہ شادم بہ نارواییِ خویش ۔۔۔ برائے من بکشا، چشمِ اعتبارِ مرا
دلش بسوخت چو برکارہائے بے مزدم ۔۔۔ دفا نتیجہ بہ از مزد داد کارِ مرا
نمودہ سعی بہ بے برگیِ من و خجلم ۔۔۔ بکیسہ نیست چو پا مزد روزگارِ مرا
ز تیرہ روزی و آشفتگی و رنجوری ۔۔۔ بیخ خالِ رُخ و زلف و چشمِ یارِ مرا
جامِ شراب برکفِ مئے نوشیں بے جبر ۔۔۔ دیگر ز حق بگو کہ ترا التماس چیست
نیرؔ! انقاب گر نفگند از رخش نسیم ۔۔۔ وجہ بباد دادنِ ہوش و حواس چیست
شکستہ طرفِ کلاہ و کشودہ بندِ قبا ۔۔۔ چہ بے خودانہ بتِ مے گسار می آید

روشِ دہر بیک گونہ نباشد، نیّرا
نہ چنیں بود کہ ہست و نہ چناں است کہ بود

ہر نفس تازہ سپاہے بزباں می آید
کہ غمے تازہ نوازندۂ جاں می آید

بدروں خنگیم بیشترست از بیروں
کہ فزوں تر دلم از لب بفغاں می آید

اے اجل! مہلت نظارہ کہ اندہ خواراں
می سرایند کہ می آید و ہاں می آید

باشد آزاد ز ہفتاد و دو ملت نیّر
ہر کہ در سلسلۂ پیرِ مغاں می آید

گوئی کہ فضلِ حق رسد و ناگہاں رسد
خوش طالعی کہ جذبۂ شوقے بجاں رسد

برغمِ محتسب سرِ بازار درکشیم
گر ساغرے ز پیرِ مغاں ارمغاں رسد

نیّر! بر آسماں نہ نہم بازپائے ناز
گر ایں سرِ نیاز، بر آں آستاں رسد

اشکے کہ نہ دریادِ توئ از چشمِ تر افتاد
دیدۂ صاحب نظراں از نظر افتاد

عطار دوم و شنہ و حلاج و سرِ دار
در موقفِ تسلیم، چہ خونہا ہدر افتاد

گردم سرِ پا لغزِ تو اے ساقیِ بدمست!
مے در قدمم از دگراں بیشتر افتاد

بیشِ درِ میکدہ سرِ نخمیدن دہیم
نشۂ اقبال را اوجِ رسیدن دہیم

وعدۂ بفرداست گر، مرحلۂ بیش نیست
شوقِ سبک تاز را گامِ دویدن دہیم

از نالہائے زار بتابم کہ دوست را
بے خواب کردہ دوش بآوا گریستن

نیّر بہ پردہ داریِ دردِ تو داشت سعی
افشائے راز می کند اما گریستن

باشم بدہر تا کجا شاد
بنشیم بخواب، خواب تاکے

حرماں بامیدِ نسیۂ شہد
از نقدِ شرابِ ناب تاکے

نشناختہ بوالہوس ز جانباز
بے مصرفیِ عتاب تاکے

اُردو کے بھی چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

شاید بہار آئی کہ جو پنجۂ جنوں
پھر کر رہا ہے جامۂ دستار تار تار

سر پیٹے، سینہ کوٹے، کہ افسوس میں ملے
عاشق کو ہاتھ چاہییں ناچار، چار چار

رخشاں پہ غصے قیس کے ملنے کیوں ہوئے
ملتے ہی ہیں بہم بتِ عیار، یار یار

فلک گر نہ تھا، بار اٹھانے کے قابل
تو کیا تھے ہمیں، آزمانے کے قابل

حیرت میں ہوں، کہ نوکِ مژہ نیشتر مثال
کھبتی ہے گر جگر میں، تو کیوں خوں چکاں نہیں

گر انتہا نہیں، ستم و جورِ یار کو
شوقِ زیادہ جُو کو مرے بھی کراں نہیں

مے کے گرنے کا ہے خیال ہمیں
ساقیا! لیجیو سنبھال ہمیں

دل میں مضمر ہیں معنیِ باقی
کسی صورت نہیں زوال ہمیں

شب نہ آئے جو اپنے وعدے پر
گزرے کیا کیا نہ احتمال ہمیں

نقص سے رنج کچھ نہیں، رخشاں!
حق نے بخشا ہے یہ کمال ہمیں

پیری و مفلسی میں نہ لو نامِ مے، کہ اب
لطف ارتکاب میں ہے، نہ اجر اجتناب میں

کیا پہنچے تو، فرشتے کا جس جا گذر نہ ہو
بیت الصنم ہے، شیخ! خدا کا یہ گھر نہ ہو

رخشاں! جو آتے آتے ابھی رک گئے ہیں اشک
آنکھوں میں آگیا کوئی لختِ جگر نہ ہو

بوالہوس اور بھی مرنے کی کریں گے خواہش
لے کے گل قبر پہ رخشاں کی نہ آیا کیجیے

مندرجہ ذیل غزل انڈیا آفس لائبریری کی ایک قلمی بیاض (نمبر B ۶۶) سے لی گئی ہے۔ (ص ۵۶)۔ یہ بیاض فہرست میں 'بیاضِ سخن' مرتبہ سیّد اصغر علی کے عنوان سے درج ہے۔ یہ آج تک کہیں شائع نہیں ہوئی۔

لے خبر میری، کہ اب غم کی مجھے تاب نہیں
آدمی ہوں نہ فلک، گرچہ خور و خواب نہیں

آنکھ سے نکلے، وہیں جذب ہوئے دامن میں
بجز اشکوں کے کوئی گوہرِ نایاب نہیں

یاس ہے رجعتِ ایامِ گذشتہ سے ہمیں
گردشِ دہر ہے، یہ گردشِ دولاب نہیں

خون کرنے میں عدو نے کہیں وہاں دھویا ہاتھ
یاں ٹپکتا مری آنکھوں سے جو خوناب نہیں

آبِ شمشیر کے اک قطرے سے کیا تر ہو حلق
سات دریا سے جو ہوتا کبھی سیراب نہیں

ایک قطرہ نہ ملے گا تمہیں، منہ دھو رکھو!
زاہدو! بادہ ہے، زمزم کا یہ شوراب نہیں

ہم ہی جب تھک چکے، پھر کیا ہمیں پرولے جہاں
نکل اے نالہ! کہ اس ضبط کی اب تاب نہیں

اے دلِ شاد! الگ ہو، مرے سینہ میں نہ رہ
تجھ کو معلوم غم اٹھانے کے آداب نہیں

چلے آؤ شبِ تاب میں کیسی شبِ ماہ
کیا ہوا ایک اگر کرمکِ شب تاب نہیں

نیلوفر ہے ترے خورشیدِ رُخِ روشن سے
گریہ میں چشم جو بیٹھے یہ ترِ آب نہیں

کن کو احباب سمجھتے ہیں یہ غم ہے رخشاں
یہ نہیں ہے کہ انھیں خاطرِ احباب نہیں

[دیباچہ جلوۂ صحیفۂ زریں نیر رخشاں : دیباچہ دیوانِ معروف، مرقع ادب: ذکرِ غالب ۔]

نیّر ——— حکیم محبّ علی کاکوروی

حضرت محمد بن الحنفیہ کی ۳۲ ویں پشت میں تھے۔ ان کے آباو اجداد میں صوفیاءِ کرام اور علمائے باعمل ہوئے ہیں۔ پردادا شیخ محبوب عالم اٹاوہ کے چکلہ دار تھے۔ دادا شیخ عاشق علی ملازمت کے دوران میں گلاؤٹھی (ضلع میرٹھ) میں بھی تھانہ دار رہے۔ ان کے والد حکیم مشتاق علی اپنے زمانے کے مشہور اور حاذق حکیم تھے۔

حکیم مشتاق علی ۱۶ - فروری ۱۸۲۲ء (۲۴ - جمادی الاولیٰ ۱۲۳۷ھ) کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی عربی و فارسی کی تعلیم کے بعد طب درجہ بدرجہ مولوی حسین احمد محدث ملیح آبادی اور حکیم محبوب علی گلاؤٹھوی اور حاذق الزمان حکیم عبدالقادر خاں دہلوی سے حاصل کی۔ تکمیل کے بعد ریاست آوا (ضلع ایٹہ) میں طبیب کی حیثیت سے ملازم ہوگئے۔ پھر چندے بھوپال میں بھی رہے۔ یہاں سے نکلے تو مین پوری میں مطب شروع کیا اور بقیہ عمر یہیں گذار دی۔

علم طب میں دو کتابیں 'تفریح الاطبا' اور 'مفرح المشتاقین' لکھی تھیں جو غیر مطبوعہ رہ گئیں۔
۱۲ جنوری ۱۸۸۵ء (۲۶ - ربیع الاول ۱۳۰۲ھ) کو انتقال کیا۔ محسن کاکوروی نے تاریخ کہی "مہتاب قرینِ آفتاب" (۱۳۰۲ھ)۔ عید گاہ مین پوری میں دفن ہوئے۔

ان کے تین بیٹے تھے۔ بڑے حکیم محب علی۔ منجھلے حکیم طالب علی اور چھوٹے حکیم حبیب علی۔
حکیم محب علی ۲۹ - ربیع الاول ۱۲۵۴ھ (۲۳ - جون ۱۸۳۸ء) کو پیدا ہوئے۔ فارسی اور عربی اور طب کی تعلیم اپنے والدِ بزرگوار سے پائی۔ میرٹھ میں نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ

کے ہمسایے میں رہتے تھے اور اُن ہی سے تلمذ بھی تھا۔ مرزا غالب دو تین مرتبہ میرٹھ گئے اور نواب شیفتہ ہی کے ہاں ٹھہرے۔ نیّر کی یہیں اُن سے ملاقات ہوئی اور انھیں بھی اپنے مسودے دکھائے۔ لیکن شعر بہت کم کہتے تھے۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے زمانے میں نیّر میرٹھ کی عدالت میں اپنے والد کی جگہ ناظرِ سررشتہ تھے۔ ہنگامے کے فرد ہونے کے بعد مین پوری میں وکالت اور مطب دونوں کرنے لگے۔

۱۸ جمادی الآخر ۱۳۲۲ھ (۳۱۔ اگست ۱۹۰۴ء) کو انتقال کیا اور مین پوری کی عیدگاہ کے صحن میں اپنے والد کے پائیں دفن ہوئے۔ کلام کہیں سے نہیں مل سکا۔

ان کے چھوٹے بھائی حکیم حبیب علی بھی شعر کہتے تھے۔ حبیب تخلص تھا۔ مدۃ العمر اٹاوہ میں مطب اور وکالت کرتے رہے۔ ۴۶ سال کی عمر میں بعارضۂ فالج ۵۔ نومبر 1912ء (۲۵۔ ذی قعدہ ۱۳۳۰ھ) کو وہیں انتقال کیا اور بادشاہ قلی کے باغ میں دفن ہوئے۔

[تذکرۂ مشاہیر کاکوری، ص ۴۰۳-۴۰۴؛
ایضاً، ص ۱۲۲-۱۲۵؛ ہندستانی (الہ آباد)
(۴)، ص ۹۰، ۱۳۲]

وحید ــــــــ وحید الدین احمد خاں بہادر دہلوی ثم حیدر آبادی

بڑے عالی نسب شخص تھے۔ ان کا خاندان شاہی میں صاحب جاگیر و منصب تھا اور مختلف عہدوں پر ممتاز رہا۔ وحید کے والد عمدۃ الامرا ضیاء الدولہ حافظ الملک سعد الدین احمد خاں بہادر اور جدِ امجد رکن الدولہ مشیر الملک رکن الدین خاں تھے۔

وحید ۱۸۵۲ء (۱۲۶۸ھ) میں دہلی میں پیدا ہوتے اور ۱۸۷۶ء (۱۲۹۲ھ) میں

اپنے خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ حیدرآباد دکن منتقل ہو گئے۔ جہاں ان کے بڑے بھائی جناب مولوی بشیر الدین احمد خاں بہادر ناظم جمعیتِ سرکار نظام تھے۔ وحید بھی مدتوں اضلاع کی تعلقداری کے عہدے پر فائز رہے۔ ۱۳۲۱ھ میں زندہ تھے۔

شاعری بہت چھوٹی عمر میں شروع کی۔ شروع میں غالب سے مشورہ کیا اور اُن کے بعد کسی کو کلام نہیں دکھایا۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

نہ چاہی ضبط نے، رسوائیٔ عشق ۔۔۔ نہ آیا رازِ دل ہرگز زباں تک
جفا کی بھی نہ ہو جب تجھ کو امید ۔۔۔ وفا کوئی کرے آخر کہاں تک
ملامت کر نہ واعظ اِمے کشوں کو ۔۔۔ یہاں بدمست ہے پیرِ مغاں تک
چمن میں حشر برپا ہو رہا ہے ۔۔۔ بچے گا کون، پایانِ خزاں تک

تھا یوں تو غمِ عشق سے دل ریش، جگر چاک ۔۔۔ وحشت میں ہے اب باعثِ آرائشِ سر چاک
اے دشنۂ غم! کیوں شبِ فرقت میں کمی کی ۔۔۔ سینہ نہ ہوا مثلِ گریبانِ سحر چاک
ہر چند اثرِ داغ سے محرم نہیں دل ۔۔۔ منجملۂ اسبابِ تسلی ہے مگر چاک
کس طرح چلا آتا ہے دیکھو تو وحید آج ۔۔۔ دامن ہے اِدھر چاک گریباں ہے اُدھر چاک

سراپا زخم ہوں، صد آفریں اس ناوک افگن کو ۔۔۔ سیے کیا خاک، حیرت ہو گئی ہر چشمِ سوزن کو
نہ ترکش ہو کہیں خالی، نہ رحم آ جائے، یہ ڈر ہے ۔۔۔ کبھی ناوک فگن کو دیکھتا ہوں میں کبھی تن کو
نمودِ خاک سے بھی ہے، ہماری خستگی پیدا ۔۔۔ غبارِ راہِ مجنوں جانتے ہیں لوگ مدفن کو
غضب ہے بے ارادہ حسرتِ دشمن نکلتی ہے ۔۔۔ وحید! اس کی گلی میں کیوں بنایا میرے مدفن کو

منہ سے ہنوز اُس نے اُٹھایا نہ تھا نقاب ۔۔۔ پامالِ ناز ہو گئے ہم اک ادا کے ساتھ
ہے آرزو سے خاطرِ جاناں عزیز تر ۔۔۔ یارب نہ ہو حصولِ تمنا دعا کے ساتھ

[تزکِ محبوبیہ (۲) دفترِ ہفتم، ص ۱۷۲-۱۷۳:
یادگارِ ضیغم (قلمی)]

وفاؔ و طالبؔ ——— میر ابراہیم علی خاں سہسوانی

نقوی حسینی سید تھے۔ سلسلۂ نسب حضرت خواجہ قطب الدین مودودی کے ذریعہ سے حضرت امام حسین علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ یہ خاندان سہسوان (ضلع بدایوں) کا رہنے والا تھا۔ اٹھارویں صدی کے اواخر میں ان کے جدِ اعلیٰ میر سرفراز علی خاں یہاں سے نقلِ مکان کرکے بڑودہ چلے آئے۔ یہ مہاراجہ گووند راؤ گائیکواڑ کا زمانہ تھا۔ میر صاحب موصوف آدمی قابل اور باہوش تھے۔ بہت جلد ترقی کی۔ اور انگریزوں اور ریاست دونوں کے ہاں بہت رسوخ پیدا کرلیا۔ مہاراجہ نے ان کی کارکردگی سے خوش ہوکر انھیں کاٹھیاواڑ میں کھانڈیا اور دراوڑی جاگیر دوامی میں عطا کیے۔

میر سرفراز علی خاں کے دو بیٹے تھے، بڑے میر اکبر علی خاں اور چھوٹے میر جعفر علی خاں۔ میر اکبر علی خاں ریاست میں سلح دار تھے۔ صاحب ترجمہ انھیں کے خلف اکبر تھے۔ یہ غالباً ۱۸۳۵ء اور ۱۸۴۰ء کے درمیان پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ اور تکمیل سورت میں جناب منشی لطف اللہ فریدی سے کی۔ جب ۱۸۶۰ء میں ان کے والد میر اکبر علی خاں کا انتقال ہوگیا تو یہ اُن کے جانشین ہوئے اور سلح داری کا عہدہ ان کے سپرد ہوگیا۔

اُنھوں نے بڑودہ کے منشی غلام قادر کی صاحبزادی سے عقدِ نکاح کیا۔ جس سے چار بیٹے ہوئے۔ میر احتشام علی خاں، میر ناصر علی خاں، میر یوسف علی خاں اور میر محمود علی خاں۔ میر احتشام علی خاں بہادر بھی شاعر تھے۔ جادوؔ تخلص تھا اور پہلوانِ سخن مولانا نجم الدین احمد ثاقبؔ بدایونی کے شاگرد تھے۔ ظہیرؔ دہلوی سے بھی کچھ مشورہ کیا تھا۔

میر ابراہیم علی خاں نے ۱۸۸۵ء میں بڑودہ ہی میں انتقال کیا۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

بہت دم بھی دیے، کیں التجائیں، پر نہ آئے وہ
وفاؔ! ہم کو نہایت ناز تھا، جادو بیانی پر

وہاں نہ جانے کا لیتے ہو وعدہ مجھ سے، ولے
زباں سے لاکھ کہوں، دل پر اختیار نہیں

نہ دو دل اُس گلِ رعنا کو، اے وفاؔ! دیکھو
گلوں کے حسنِ دو روزہ کا اعتبار نہیں

کب لبوں پر مرے نالے نہیں، فریاد نہیں
کب تری وعدہ فراموشی مجھے یاد نہیں

شاد ہوں اپنے میں جب سے دلِ ناشاد نہیں
اب وہ شیون نہیں، نالہ نہیں، فریاد نہیں

چھیڑنے کو یہ جفا اس کی، وفاؔ ہے، ورنہ
طبع اس شوخ کی کچھ مائلِ بیداد نہیں

———

ہوئی آخر تمہارے ہجر میں یہ جوششِ وحشت
اجاڑا ہم نے بستی کو، بسایا جا کے ویرانہ

بیانِ دردِ فرقت کرکے، تم احسان جتاتے ہو
کہانی آپ کی سن لی، مرا اب [illegible] افسانہ

[خم خانۂ جاوید (۲) ص ۱۹۴ ؛ معاصر (۴)
ص ۱۴۰-۱۴۳]

وفاؔ و اخترؔ ——— خواجہ عبد الغفار جہانگیر نگری

ڈھاکہ کا خاندانِ خواجگاں بہت مشہور ہے۔ اس میں دین و دنیا دونوں کے مشاہیر پیدا ہوئے۔ اصل میں یہ خاندان کشمیر کا تھا۔ جہاں سے یہ لوگ تجارت کے سلسلے میں نقلِ مکان کرکے ڈھاکہ میں بس گئے۔ سب سے پہلے جو شخص آئے وہ خواجہ مولوی حفیظ اللہ تھے۔ اسی سلسلۂ طلائے ناب کی ایک کڑی خواجہ عبد الغفار تھے۔ ان کے والد کا نام خواجہ عبد الغفور تھا۔ خواجہ عبد الغفار فارسی اور اردو دونوں میں شعر کہتے تھے۔ فارسی میں تخلص وفاؔ تھا اور اس میں غالبؔ سے اصلاح لیتے تھے۔ اردو میں اخترؔ تخلص تھا اور اس میں مشورہ حافظ اکرام الدین احمد ضیغمؔ سے تھا۔ ریختی بھی کہتے تھے۔

۱؎ حافظ اکرام الدین احمد ضیغمؔ۔ حافظ میاں قطب الدین کے بیٹے اور حضرت مجدد الف ثانی کے خاندان سے تھے۔ ۱۷۸۸ء (۱۲۰۳ھ) میں پیدا ہوئے۔ شروع میں حشمتؔ تخلص کرتے تھے۔ بعد میں ضیغمؔ کرلیا۔ ہزل اور ریختی اور مرثیہ میں تخلص مہاتی رکھا۔ کلام پر اصلاح میاں احمد حسین راحتؔ اور جناب رؤف احمد رافتؔ سے لی۔ جناب رافتؔ کے خویش بھی تھے۔ بڑے قادر الکلام شخص تھے۔ اور جمیع اصنافِ سخن پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ تاریخ میں بھی یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ نساخؔ نے ان کی ایک غزل لکھی ہے جو متعدد بحروں میں ہے۔ اور اُن میں سے ۱۹ بحروں کے مطابق تو خود تقطیع بھی کی ہے۔ اس سے ضیغمؔ کی عروض میں مہارت کا ثبوت ملتا ہے۔ شاعری کے علاوہ طب ڈاکٹری اور دوسرے علوم و فنون میں بھی خاصی دستگاہ تھی۔ کیمیاگر مشہور (باقی)

اور اس میں نزاکت تخلص کرتے تھے۔ جوانی کا بہت سا کلام دریا برد اور چوری ہو گیا۔ آخر عمر میں نعت کا شوق پیدا ہوا اور اس میں بھی اپنی طبیعت اور عقیدت کے جوہر خوب خوب دکھائے اور مقبول ہوئے۔

۱۸۸۱ء (۱۲۹۷ھ) میں انتقال ہوا۔ ناسخ نے تاریخ کہی ؎

اختر، آں مہرِ آسمانِ سخن — رفت چوں از سرائے رنج و ملال
قلمِ دل فگار، اے ناسخ! — "اخترِ نیکوئی" رقم زد سال
۱۲۹۷ھ

کلام کا انتخاب یہ ہے:۔

چشم بکشا، کہ ابرِ گوہر بار — قطرہ زن شد، بہ ساحتِ گلزار
تیغِ کوہ، از دمیدنِ سبزہ — ہمچو فولاد، گشت جوہر دار
سبزہ صد پیرہن بجوِ بالا — سرد آید بوجد در رفتار

آب بخشد بحسر را ایں چشمِ طوفاں خیزِ ما — تاب آتش را دہد، آہِ شرر انگیزِ ما
جیب و دامان شد گلستان زاشک خونی ہائے مں — بوالعجب، نیرنگ ہائے دیدۂ گلریزِ ما

اے روحِ رواں! داروئے دل، چارہ گرِ جاں! — اے ختمِ رسل، قبلۂ دیں، کعبۂ ایماں!
اے نورِ زتو عکس فگن آئینۂ توحید — در وصفِ تو اندیشہ خجل ناطقہ حیراں
گردِ رہِ رہوارِ تو کحل البصرِ دل — خاکِ ترِ نعلینِ تو نورِ نظرِ جاں

شکوہ بزمِ غیر میں جانے کا کیجیے، تو وہ شوخ — ہنس کے کہتا ہے کہ "واں میری بلا تھی، میں نہ تھا"
جی میں ہے، کہیے بوقتِ مے کشی، منہ چوم کر — اے صنم! یہ نشۂ مے کی خطا تھی، میں نہ تھا
آتی نہ قیامت، ترے اصرار سے اب تک — جی اٹھے نہ مردے، تری گفتار سے اب تک

آج اس کا روئے تاباں دیکھیے — دیکھیے مہرِ درخشاں دیکھیے
پرتوِ انجم پہ کیوں کیجے نظر — کیوں نہ اپنے گھر چراغاں دیکھیے

(بقیہ) تھے مختلف ملکوں کی سیر بھی خوب کی تھی۔ ۱۸۷۰ء (۱۲۸۶ھ) میں ڈھاکہ میں انتقال کیا۔
(سخن شعرا، ص ۲۹۲؛ شمیم سخن، ص ۱۵۷۔ ۱۵۸؛ انتخاب یادگار، ص ۲۰۷؛ تذکرہ کاملانِ رامپور، ص ۲۹)

حیرت ہے اس کے آنے پہ کیا پیش کش کروں
سینے میں دل رہا ہے، نہ جاں اپنے تن میں ہے
پھولا ہوا خوشی سے ہر گل ہے، اے نسیم!
کس نوبہارِ حسن کی آمد چمن میں ہے

رباعیات

اک عمر یہ میں نے خوشش معاشی کی ہے
اشکوں سے چمن میں آب پاشی کی ہے
دشوار ہے اب سانس بھی لینا ہمدم
آہوں نے میرے یہ دل خراشی کی ہے

گر خضر نے عمرِ جاودانی پائی
یا آبِ حیات کی نشانی پائی
کیا ناز کرے اس پہ کہ جب آخر کار
مرنے کے لیے یہ زندگانی پائی

دنیا ہے طلسمِ رنج و حسرت، اختر!
اور زندگی آئینۂ حیرت، اختر!
سب سانگ کا عالم ہے جو یاں دیکھیے تو
شادی و غم و کلفت و الفت، اختر!

شکرانہ ادا حق کا کرتی ہوں دوگانہ میں
سایہ ہے مرے سر پہ آج اس کی عنایت کا
رنگیں کے بُرا ڈھب پر یہ ریختی لکھی ہے
بنگالہ میں ہوئے گا اب نام نزاکت کا

[شمع انجمن، ص ۵۲۷؛ سخن شعرا، ص ۱۶؛
مشرقی بنگال میں اردو، ص ۵۰ - ۵۳؛
تواریخِ ڈھاکہ، ص ۳۴۱ - ۳۴۲؛
مشرقی پاکستان کے ادیب، ص ۲۹-۳۲]

وکیل ــــــ منشی شکور احمدؒ پانی پتی

ان کی صرف ایک غزل رسالہ کمال (دہلی) سے ملی۔

ملے یوں لطف مے کشوں کو پیرِ مے خانہ
گرے جو بوند ساغر سے بنے تصویرِ مے خانہ
بجائے خانۂ کعبہ ہوئی تعمیرِ مے خانہ
زہے توقیرِ مے خانہ، زہے تقدیرِ مے خانہ
نظر آجائے اُس خورشیدِ وحدت کا مجھے جلوہ
کوئی ایسا بھی ساغر دے کبھی اے پیرِ مے خانہ

ملا ہے دیدۂ حق بیں جسے، وہ دیکھ لیتا ہے
نظر آتی ہے اُس کو دُور سے تنویرِ مے خانہ

سمجھتے ہیں اِسی کو کعبۂ مقصود سب اپنا
کہاں تک عاشقوں کے دل میں ہے توقیرِ مے خانہ

پسِ مردن بھی اُلفت دخترِ رز سے نہ جائے گی
مری گِل سے بنے گی ایک دن تعمیرِ مے خانہ

الٰہی! کیا ہوا پلٹی، یہ کیسا انقلاب آیا؟!
جہاں مسجد تھی کل تک، آج ہے تعمیرِ مے خانہ

مےِ گل رنگ سے دل کی دورنگی دور ہو جائے
کوئی ساغر خدا کی راہ کا دے، پیرِ مے خانہ

[رسالہ کمال (دہلی) اکتوبر۔ دسمبر ۱۹۱۲ء]

ولی ـــــــ مولوی امو جان دہلوی

مدرسی پیشہ تھے۔ پہلے مدت تک دہلی میں ملازم رہے۔ اس کے بعد فیروز پور جھرکہ کے اُردو اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہو کر چلے گئے۔ ۱۹۰۲ء میں پنشن پر ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ مولانا سید محمد غوث علی شاہؒ سے بیعت تھے۔ اُردو فارسی دونوں میں شوق فرماتے تھے۔ ۱۸۷۷ء کے دربارِ قیصری کے حالات میں مسٹر اسٹوک نے ایک انگریزی نظم (LAY OF THE EMPRESS) لکھی تھی۔ ولی نے اُس کا ترجمہ فارسی نظم میں "زمزمۂ قیصری" کے نام سے کیا۔ ۱۳۱۸ھ میں "رباعیات عجائبات امو جان ولی" کے تاریخی نام سے مجموعہ رباعیات شائع کیا۔

پردہ جبھی تک ہے کہ پردے میں ہے وہ شوخ
چہرہ کھلا، تو راز چھپایا نہ جائے گا

محشر میں رُو بُرو مرے آ کے کھڑا ہوا
جانا کہ اس سے شور مچایا نہ جائے گا

غم بے ستوں نہیں ہے، کہ آگے سے ٹال دوں
سینے کا سنگ ہے یہ ہٹایا نہ جائے گا

رباعی

برسوں میں جو کل رہ میں ملا وہ طنّاز
منھ پھیر چلا تیز، بصد شوخی و ناز
افسوس نہ ہم دوڑ کے، قدموں پہ گرے
سوچا کیے دنیا کے نشیب و فراز

حالِ دلِ سیدا تو چھپائے نہ بنے — سن کر اسے بن میرے ستائے نہ بنے
کہنا بھی، نہ کہنا بھی ہیں دونوں آفت — اب بات کوئی موت بن آئے نہ بنے

[سخن شعرا، ص ۵۵۷؛ دیباچہ رباعیاتِ دلّی]

ہوشیار ـــــ کیول رام دہلوی

قوم کے سکسینہ کائستھ تھے۔ ان کے والد کا نام بخشی سلطان سنگھ تھا۔ وہ بیگم سمرو کی افواج میں بخشی کے عہدے پر فائز تھے۔ ہوشیار بھی پہلے بیگم سمرو ہی کے ہاں ملازم ہوئے۔ لیکن بعد میں وہاں سے مستعفی ہو کر مدرسی کا پیشہ اختیار کر لیا۔ ابتدا میں اپنے طور پر کام کرتے رہے، بعد میں جیل خانوں میں قیدیوں کی تعلیم پر مقرر ہو گئے۔ آخر کار یو۔پی میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدۂ جلیلہ تک پہنچے۔ اور جب بڑھاپے کے باعث ملازمت اور نقل و حرکت کی کھکھیڑ برداشت کرنے کے قابل نہ رہے، تو چاندپور میں مستقل سکونت اختیار کر لی اور یہیں صدر مدرس ہو گئے۔ عربی، فارسی، اردو، ہندی سب کی واقفیت عالمانہ تھی۔ مختلف علوم و فنون میں چھوٹی بڑی کوئی ۸۰ کتابوں کے مصنف ہیں۔ دیوان مطبع نولکشور لکھنؤ سے ۱۸۷۷ء میں شائع ہوا۔

ملایا خاک میں دکھلا کے تو نے قدِ بالا کو — سہی کو، سرو کو، شمشاد کو، عرعر کو، طوبا کو
خرابِ چشم مے گوں ہو گیا، اب ہو سلام اپنا — صراحی کو، پیالے کو، سبو کو، خم کو، مینا کو
خط و زلف و قد و عارض نے تیرے کر دیا عاشق — سمن کو، سرو کو، سنبل کو ریحانِ مطرا کو

[تذکرہ آثار الشعرا ہنود، ص ۱۴۶؛ گلستانِ سخن،
ص ۴۸۵؛ سخن شعرا، ص ۵۶۵؛
بہارِ سخن، ص ۲۹۸۔]

یکتاؔ ـــــــ خواجہ معین الدین خاں دہلوی

لال کنواں دہلی میں سکونت تھی اور اِن کا یہاں کے رئیسوں میں شمار تھا۔ شاہی میں خانی کے خطاب سے مفتخر تھے۔ پہلے حافظ عبدالرحمٰن احسانؔ سے اصلاح لیتے رہے۔ پھر میرزا سے مشورہ کیا۔

دل گیا، صبر گیا، چین گیا، جی بھی گیا
کب ہوا اور کا اُلفت میں ضرر اپنا سا

ہے کس کو تابِ شکوۂ دشمن کہ ضعف سے
لب پر ہمارے تذکرۂ یار بھی نہیں

جینا فراقِ یار میں وعدے کی لاگ پر
آسان گر نہیں ہے تو دشوار بھی نہیں

برسات میں کہے ہے کہ "یکتاؔ! نہ پی شراب"
واعظ تجھے کچھ ابر و ہوا پر نظر نہیں

کیا محوِ بے خودی ہوں، کہ جنت میں بار بار
رضواں سے پوچھتا ہوں کہ اُس کا تو گھر نہیں

غافل ہیں اہلِ دہر، وگرنہ ہزار بار
واں مقبرہ بنا ہے، جہاں خوابگاہ تھی

[طبقات الشعرائے ہند، ص ۴۱۲ - ۴۱۳ ؛
گلستانِ سخن، ص ۴۸۸ ؛ گلستانِ بے خزاں،
ص ۲۸۸ ؛]

ضمیمہ

زکیؔ ــــــ حکیم محمد اشفاق حسین مارہرویؒ

مارہرہ (ضلع ایٹہ) کے خاندانِ کنبوہ کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد مولوی الطاف حسین کا اپنے عہد کے ذی علم حضرات میں شمار تھا۔ زکیؔ ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر اپنے والد سے پائی۔ بعد ازاں فارسی اور طب کی تعلیم اور تکمیل مارہرہ کے دوسرے اساتذہ سے کی۔ عربی بھی بقدرِ ضرورت جانتے تھے۔

شاعری کا شوق بہت کم عمری میں پیدا ہوا۔ اس کے آغاز کا قصہ بیان کرتے تھے، کہ میرا ابھی مشکل سے چودہ برس کا سن ہوگا، کہ میں وطن میں ایک مشاعرے میں گیا۔ وہاں جو کلام سنا اور سامعین نے جس طرح اس کی داد دی، اس سے طبیعت بہت متاثر ہوئی۔ گھر پہنچ کر مشاعرے کی طرح پر پانچ سات شعر لکھے اور انھیں لے جا کے والد صاحب قبلہ کو دکھایا۔ توقع تھی، کہ میری طرح، وہ بھی خوش ہوں گے اور داد دیں گے۔ الٹا انھوں نے ناراضی کا اظہار کیا اور فرمایا کہ یہ شغل ترک کر دو، اور پہلے اپنی تعلیم مکمل کرو۔ اس پر میں بہت مغموم ہوا۔ لیکن مجھے ایک ترکیب سوجھی۔ میں نے چند شعر نعتِ رسولؐ میں لکھے اور انھیں لے کر اُن کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بھلا اب وہ کیسے اعتراض کر سکتے تھے۔ میری چالاکی کو بھانپ گئے اور فرمایا۔ اچھا، اگر تم شعر گوئی سے باز نہیں رہ سکتے، تو میں منع نہیں کرتا، لیکن اپنی تعلیم کی طرف سے غافل نہ ہونا اور اُسے بہر حال مقدم سمجھنا۔ اس کے بعد میں کبھی کبھی شعر کہنے اور مارہرہ اور قرب و جوار کے مشاعروں میں بھی شریک ہونے لگا۔

سرکاری ملازمت ذریعۂ معاش تھی۔ ملازمت کا پورا زمانہ محکمۂ بندوبست میں بسر ہوا۔

؎ حکیم محمد اشفاق حسین مارہروی کا نام ذکیؔ تخلص کے تحت ص ۱۰۰ پر لکھ چکا ہوں۔ یہ حالات اور کلام ان کے نواسے جناب محمد طیّب زبیری (کراچی) سے دورانِ طباعت میں موصول ہوا۔ اس لیے انھیں ضمیمہ کے طور پر شاملِ کتاب کر رہا ہوں۔ وہ لکھتے ہیں کہ مرحوم اپنا نام ہمیشہ زاے معجمہ سے لکھا کرتے تھے۔ تصویر بھی انھی نے مہیا کی۔ میں اس عنایت کے لیے اُن کا شکر گزار ہوں۔
مالک رام

ابتدائی ایام ایٹہ میں گذرے۔ پھر اترپردیش کے دوسرے اضلاع مثلاً مظفر نگر، بنارس، جلیسر، بدایوں وغیرہ میں قیام رہا۔ انگریزی ملازمت کے اختتام کے بعد چندے گوالیار میں بھی رہے۔ ۱۹۰۷ء میں بھوپال پہنچے اور یہاں بھی پہلے محکمۂ بندوبست اور پھر جمعبندی (LAND RECORDS) کے دفتر سے وابستہ رہے۔ ۱۹۱۵ء میں محکمہ کے افسرِ اعلیٰ کے رویّے سے ناراض ہو کر ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور خانہ نشین ہو گئے۔

طب کی تعلیم مکمل تھی اور اس فن میں پوری دستگاہ تھی، لیکن اُسے کبھی ذریعۂ معاش نہیں بنایا۔ البتہ جہاں کہیں رہے، ادویہ کا ذخیرہ ساتھ رہا، جسے ضرورت مندوں میں مفت تقسیم کرتے۔ جب بھی اپنے وطن مارہرہ جانے کا اتفاق ہوتا، یہاں کے دورانِ قیام میں صبح و شام اپنے ہم درس دوست حکیم سید آلِ حسن کے مطب میں چلے جاتے۔ وہاں مریضوں کو دیکھتے اور اُنھیں مشورہ دیتے۔

مذہب سے بہت شغف تھا۔ پابندِ صوم و صلوٰۃ اور صاحبِ دل بزرگ تھے۔ مارہرہ کے سلسلۂ قادریہ برکاتیہ میں منسلک اور حضرت سیّد ابوالحسن شاہ احمدؒ نوریؒ سے بیعت تھے۔ اپنے سلسلے کے تمام اوراد و وظائف پوری پابندی سے ادا کرتے تھے۔

زکی کی شادی اپنے خاندان ہی میں ۲۵ برس کی عمر میں ہوئی تھی۔ اُن کی بیوی زینب فاطمہ رشتے میں اُن کے چچا کی بیٹی ہوتی تھیں۔ یکے بعد دیگرے چھ لڑکے پیدا ہوئے، لیکن اُن میں سے کوئی زندہ نہ رہا اور سب اُنھیں صغر سنی ہی میں داغِ مفارقت دے گئے۔ بفضلہٖ آخری تین بچّے زندہ رہے۔ اُن میں سب سے بڑی صاحبزادی میمونہ خاتون تھیں۔ جناب محمدؐ ملیح زبیری اُنھیں کے صاحبزادے ہیں۔ اُن کا انتقال زکی کی زندگی ہی میں ہو گیا تھا۔ اُن سے چھوٹے محمد اخلاق حسین صاحب تھے۔ یہ بھوپال کے کسٹم ڈپارٹمنٹ میں ملازم تھے اور پنشن پانے کے بعد بھی وہیں رہے۔ اُن کا ۱۹۵۵ء میں بعارضۂ فالج کراچی میں انتقال ہوا۔ سب سے چھوٹی صاحبزادی عرفان فاطمہ حیات ہیں اور آج کل اپنے اہل و عیال کے ساتھ کراچی میں مقیم ہیں۔

زکی کی بیوی کا ۱۹۲۸ء میں انتقال ہو گیا۔ چونکہ اُن کی زندگی بہت خوش گوار گذری تھی، اس لیے بڑھاپے میں رفیقۂ حیات کی وفات کے بعد بالعموم مغموم اور اُداس رہنے لگے۔ ۱۹۲۹ء میں ملیریا کا سخت حملہ ہوا، اور بہت دن صاحبِ فراش رہے۔ اگرچہ اس سے نجات مل گئی، لیکن

پھر نہ طبیعت پورے طور پر بحال ہوئی، نہ کمزوری کا ازالہ ہوا۔ یہ حالت تھی جب ۱۹۳۰ء میں دوبارہ ملیریا کا حملہ ہوا۔ چونکہ بخار بہت تیز تھا، اُسے روکنے اور کم کرنے کے لیے دوائیں دی گئیں۔ اُن سے حرارت تو کم ہو گئی لیکن پسینہ اتنا آیا کہ اس سے نقاہت المضاعف ہو گئی۔ اسی حالت میں ۹۲ برس کی عمر میں ۱۴/۱۵۔اکتوبر ۱۹۳۰ء کی درمیانی شب کو انتقال کیا۔ صبح کو تجہیز و تکفین ہوئی اور بھوپال کے تکیہ بھولا شاہ میں سپردِ خاک کیے گئے۔ تکیے کی مسجد کے احاطے کی مغربی دیوار سے ملحق قبر ہے، جو مرحوم کی وصیت اور خاندانی روایات کے مطابق کچی رکھی گئی۔ ان کے نواسے جناب یحییٰ زبیری نے تاریخِ وفات کہی ہے

چو شد سازِ انفاسِ پاکش خموش | زکی را نہادند اندر مغاک
چو ایں حادثہ سخت آمد، یحییٰ | ز فرطِ الم می تپیدم بخاک
مکن غم، ندائے شنودم زغیب | کہ ایں بندۂ ماست: "مغفورِ پاک"

۱۳۴۹ھ

اب چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

دم اُلجھنے لگا ہے، بے اُلجھے | زلف اُلجھی اگر تو کیا ہوگا
رہگذارِ بلا پہ بیٹھے ہیں | نہ ملا راہبر تو کیا ہوگا

زہے قسمت! پسند خاطرِ مشکل پسند آیا | ازل سے چھانٹ کر لائے تھے ہم جو دل، پسند آیا
نکل کر آنکھ سے، آنسو رُکے ہیں نوکِ مژگاں پر | کہ لڑکوں کو تماشائے لبِ ساحل، پسند آیا
ہوئی ہے تیغ کند اس کی، بقولِ حضرتِ غالب | "تماشائے بجوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا"

صیاد دور، موسمِ گل، سامنے چمن | کنجِ قفس میں روؤں نہ کیوں بال و پر کو میں
زار انتظارِ خط نے کیا اس قدر مجھے | انجان سوچتا ہوں مگر نامہ بر کو میں
قدرِ سخن زمانہ میں باقی نہیں زکی | کس کو دکھاؤں آج متاعِ نظر کو میں

سِفلوں سے پوچھتا ہوں غربت میں | کہیے کیسا مزاجِ عالی ہے؟

وابستہ رہ چکے ہیں جو دل زلفِ یار کے | پابند ہیں وہ آج غمِ روزگار کے
جو اپنے عزتِ نفس کو پہچانتے نہیں | رہتے ہیں فکر میں وہی جھوٹے وقار کے

بلبل کو آشنائے جنوں کر دیا زکی — صدقے گلوں کے پیرہن تار تار کے

جو اُس سے دوری میں عمر گزرے اُسے نہ کر زندگی میں شامل
قریب رہ کر جو وقت گزرے وہ زندگی میں شمار کرے

نعتؐ و مستزاد :-

اک برقِ تجلی مری ہستی پہ گرا کر - مدہوش بنا کر
سینے کو بنا دو مرے تم وادیٔ سینا - یا شاہِ مدینہؐ

میخانہ بدوش آج مرے سامنے آجا - متوالا بنا جا
حصے میں مرے آئے تری آنکھوں سے پینا - یا شاہِ مدینہؐ

بگڑی ہوئی قسمت مری للّٰہ بنا دو - ہر غم سے چھڑا دو
جب دل کو نہ ہو چین تو کس کام کا جینا - یا شاہِ مدینہؐ

کتابیات

۱۔ کتب

آبِ بقا	خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت	نامی پریس، لکھنؤ	۱۹۱۸ء
آبِ حیات	مولانا محمد حسین آزاد	سرفراز پریس، لکھنؤ	۱۹۵۴ء
انتخاب الشعراء	سیّد محمد ممتاز علی حافظ	مطبع شاہجہانی، بھوپال	۱۳۰۴ھ
احوالِ غالب	ڈاکٹر مختار الدین احمد	دہلی پرنٹنگ ورکس، دہلی	۱۹۵۲ء
اخبار الصنادید	حکیم محمد نجم الغنی	مطبع نولکشور، لکھنؤ	۱۹۱۸ء
اخترِ تاباں	ابوالقاسم محتشم	مطبع شاہجہانی بھوپال	۱۲۹۹ھ
اُردو کی نثری داستانیں	ڈاکٹر گیان چند جین	انجمن پریس، کراچی	۱۹۵۴ء
اُردوئے معلّیٰ	میرزا غالب	کریمی پریس، لاہور	۱۹۲۲ء
المشاہیر	فیض احمد	نامی پریس، میرٹھ	۱۹۰۰ء
انتخابِ زرّیں	سر سیّد راس مسعود	نظامی پریس، بدایوں	۱۹۳۷ء
انتخابِ یادگار	منشی امیر احمد امیر مینائی	تاج المطابع، رامپور	۱۲۹۰ھ
انشلے بیخبر	مرتبہ: انتظام اللہ شہابی	مرتضائی پریس، آگرہ	۱۹۴۰ء
بزمِ سخن	سیّد علی حسن خاں	مطبع مفید عام، آگرہ	۱۸۸۱ء
بساطِ فرنگ	میرزا شمشاد علی بیگ رضوان	اکمل المطابع، دہلی	۱۸۶۷ء

بہادر شاہ ظفر — امیر احمد علوی — سرفراز قومی پریس، لکھنؤ — ۱۹۵۵ء

بہادر شاہ ظفر کا مقدمہ — مولفہ خواجہ حسن نظامی — محبوب المطابع، دہلی — ۱۹۴۷ء

بہارِ سخن — بابو شیام سندر لال برق سیتاپوری — مطبع یل بی، سیتاپور — ۱۹۳۲ء

بہارِ گلشن کشمیر — برج کشن کول بیخبر و جگموہن ناتھ شوق — انڈین پریس، الہ آباد۔ ۱۹۳۱-۱۹۳۲ء

بیاضِ بجل (قلمی) — مرتبہ سید اصغر علی — (انڈیا آفس لائبریری، لنڈن مخطوطہ ۶۶-B)

بیاضِ علائی (قلمی) — نواب علاء الدین احمد خان علائی (مملوکہ نواب صاحب لوہارو بالقابہم۔ بجے پور)

بیان الحقائق — محمد عامر عباس عمائی عباسی — انصار پریس، کانپور — ۱۹۴۸ء

تاج التواریخ — مولوی نصرت علی قیصر — نصرت المطابع، دہلی

تاریخ دلچسپ (قلمی) — ابو الفضل محمد عباس شیروانی — (مملوکہ کتب خانہ سالار جنگ ۵۴۱)

تاریخ شعرائے بہار — سید عزیز الدین احمد بلخی راز — قومی پریس، بانکی پور پٹنہ — ۱۹۳۱ء

تاریخ عروجِ عہدِ انگلشیہ — منشی ذکاء اللہ — شمس المطابع، دہلی — ۱۹۰۴ء

تجلیاتِ سخن — (دیوان نظامی بدایونی) — نظامی پریس، بدایوں — ۱۹۳۰ء

تذکرہ آثار الشعرائے ہنود — منشی دیبی پرشاد بشاش — مطبع رضوی، دہلی — ۱۸۸۵ء

تذکرہ اہلِ دہلی: سر سید احمد خاں (مرتبہ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی) — انجمن پریس، کراچی — ۱۹۵۵ء

تذکرہ حالی — شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی — گیلانی پریس، لاہور — ۱۹۴۵ء

تذکرہ ریختی — سید تمکین کاظمی — شمس الاسلام پریس، حیدرآباد دکن — ۱۹۳۰ء

تذکرہ شعرائے جے پور — مولوی احترام الدین احمد شاغل — یونین پرنٹنگ پریس، دہلی — ۱۹۵۷ء

تذکرہ شعرائے دکن (محبوب الزمن) — محمد عبد الجبار خاں ملکاپوری — مطبع رحمانی، حیدرآباد — ۱۳۲۹ھ

تذکرہ علمائے ہند — مولوی رحمان علی — مطبع نولکشور، لکھنؤ — ۱۹۱۴ء

تذکرہ کاملانِ رامپور — حافظ احمد علی خاں شوق — ہمدرد پریس، دہلی — ۱۹۲۹ء

تذکرہ مشاہیر کاکوری — حافظ محمد علی حیدر — اصح المطابع لکھنؤ — ۱۹۲۷ء

تزک محبوبیہ (۲) — غلام صمدانی خاں گوہر — نظام المطابع، حیدرآباد — ۱۹۰۲ء

تواریخ بلند شہر	دوارکا پرشاد	مطبع جلوۂ طور، بلند شہر	۱۸۶۲ء
تواریخ ڈھاکہ	رحمان علی طیش	اسٹار پریس آف انڈیا، آرہ	
جلوۂ صحیفۂ زریں نیر رخشاں	(دیوان)	حقانی پریس، دہلی	۱۹۱۶ء
جلوۂ خضر	سید صفیر احمد صفیر بلگرامی	مطبع نور الانوار، آرہ	۱۸۸۵ء
جوہر	مرزا عصمت اللہ بیگ عصمت	نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، حیدرآباد	۱۹۵۷ء
چمن انداز	منشی درگا پرشاد نادر، دہلوی	اکمل المطابع، دہلی	۱۸۸۲ء
چند ہم عصر	ڈاکٹر مولوی عبد الحق	ناظر پریس، کراچی	۱۹۵۰ء
حیات اسمٰعیل	خان بہادر محمد اسلم سیفی	دیال پرنٹنگ پریس، دہلی	۱۹۲۹ء
حیات جاوید	مولانا الطاف حسین حالی	لطیفی پریس، دہلی	۱۹۳۹ء
حیات فریاد	سید علی محمد شاد عظیم آبادی	مطبع معارف دار المصنفین اعظم گڑھ	۱۹۲۸ء
حیواۃ العلماء	سید محمد عبد الباقی سہوانی	مطبع نولکشور، لکھنؤ	۱۹۲۲ء

خاندانی حالات نواب حسام الدین احمد خاں (قلمی) مولفہ اکبر مرزا (مملوکہ خاندان مقیم کراچی)

خطبات گارساں دتاسی		انجمن ترقی اردو پریس، اورنگ آباد	۱۹۳۵ء
خطوط غالب (۲)	مرتبہ مولانا غلام رسول مہر	پاکستان ٹائمز پریس، لاہور	۱۹۵۱ء
خم خانۂ جاوید	لالہ سری رام و پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی		۱۹۰۸-۱۹۴۰ء
دار العلوم کے سپوت	مولوی حافظ محمد مظہر	طارق برقی پریس، حیدرآباد	۱۹۵۳ء
داغ	نور اللہ محمد نوری	اعظم اسٹیم پریس، حیدرآباد دکن	۱۳۵۵ھ
دو نایاب زمانہ بیاضیں	عبد الباری آسی الدنی	ہندستانی اکیڈمی گورنمنٹ پریس، الٰہ آباد	۱۹۴۲ء

دیوانِ باقر	شاہ باقر علی بہاری	شمس الاسلام پریس، حیدرآباد	۱۳۵۵ھ
دیوانِ جان صاحب	مرتبہ سید محمد مبین نقوی	مطبع انوار احمدی الٰہ آباد	
دیوانِ سخن	سید فخرالدین حسین سخن	مطبع نولکشور، لکھنؤ	۱۸۸۶ء
دیوانِ معروف	نواب الٰہی بخش خان	نظامی پریس، بدایوں	۱۹۳۵ء
ذکرِ غالب	مالک رام	یونین پرنٹنگ پریس، دہلی	۱۹۵۵ء
راحِ روح (قلمی)	ابوالفضل محمد عباس شروانی - (مملوکہ کتب خانہ سالار جنگ۔ فارسی دیوان ۱۴۱		
رباعیاتِ عجائبات اموجان ولی		تحفۂ ہند پریس، دہلی	۱۳۱۸ھ
روزِ روشن	مولوی محمد مظفر حسین صبا	مطبع شاہجہانی، بھوپال	۱۲۹۷ھ
رونقِ سخن	دیوان صاحبزادہ محمد احمد علی خاں رونق	مطبع فاروقی، دہلی	۱۸۹۰ء
سبد باغِ دو در - غالب (قلمی)			
سخن شعرا	مولوی عبدالغفور خاں نساخ	مطبع نولکشور، لکھنؤ	۱۸۷۴ء
سراپا سخن	سید محسن علی محسن	مطبع نولکشور، لکھنؤ	۱۸۶۰ء
سروشِ سخن	سید فخرالدین حسین سخن	مطبع نولکشور، کانپور	۱۸۷۷ء
سیرِ سیاح	میاں داد خان سیاح	مطبع نولکشور، لکھنؤ	۱۸۷۲ء
شعر و سخن	محمد نیاز علی پریشاں	مطبع نور العلم، آگرہ	۱۲۸۶ھ
شمعِ انجمن	نواب سید محمد صدیق حسن خاں	مطبع شاہجہانی، بھوپال	۱۲۹۳ھ
شمیمِ سخن	محمد عبدالحی صفا بدایونی	مطبع امداد الہند، مراد آباد	۱۸۸۴ء
صبحِ گلشن	سید علی حسن خاں	مطبع شاہجہانی، بھوپال	۱۲۹۵ھ

صبح وطن	نواب محمد غوث خاں اعظم	چھاپا خانہ کشن راج، مدراس	۱۸۴۲ء
صحیفۂ زریں	مرتبہ پراگ نرائن بھارگو	نولکشور پریس، لکھنؤ	۱۹۰۲ء
طبقات الشعرائے ہند	مولوی کریم الدین	مطبع العلوم، دہلی	۱۸۴۸ء
طور کلیم	سید نور الحسن خاں	مطبع مفید عام، آگرہ	۱۲۹۸ھ
عرفان عزیز	(دیوان محمد ولایت علی خاں عزیز صفی پوری)	نظامی پریس، بدایوں	۱۹۴۶ء
عقد ثریا	غلام ہمدانی مصحفی	جامع برقی پریس، دہلی	۱۹۳۴ء
عود ہندی	میرزا غالب	مطبع نولکشور، لکھنؤ	۱۹۲۵ء
غالب	غلام رسول مہر	عالمگیر الیکٹرک پریس، لاہور	۱۹۴۶ء
غدر کا نتیجہ	غلام حسن خاں محو (مرتبہ خواجہ حسن نظامی)	محبوب المطابع برقی پریس، دہلی	۱۹۳۰ء
فرح بخش	میاں یار محمد خاں شوکت	مطبع نظامی، کانپور	۱۲۸۸ھ
فغان دہلی	مرتبہ تفضل حسین خاں کوکب	اکادمی پنجاب، لاہور	۱۹۵۴ء
قاطع برہان	میرزا غالب	مطبع نولکشور، لکھنؤ	۱۸۶۲ء
قاموس المشاہیر	مرتبہ نظامی بدایونی	نظامی پریس، بدایوں	۱۹۲۶ء
قصاید مدحیہ نظام	مرتبہ منشی غلام محمد خاں تپش	مطبع نولکشور، لکھنؤ	۱۸۷۱ء
کارنامۂ سروری	سرور الملک آغا میرزا بیگ خاں	مطبع مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ	۱۹۳۳ء
کلیات خلیل و فوق	محمد ابراہیم	مطبع نور الانوار، آرہ	۱۲۹۰ھ
کلیات شیفتہ	نواب محمد مصطفیٰ خاں	نظامی پریس، بدایوں	۱۹۱۶ء

کلیاتِ نظام	نواب محمد مردان علی خان	مطبع نولکشور، لکھنؤ	۱۸۷۵ء
گلدستۂ سخن	مرتبہ منشی نولکشور	مطبع نولکشور، لکھنؤ	۱۸۷۵ء
گلدستۂ نازنیناں	مولوی کریم الدین پانی پتی	مطبع رفاہ عام، دہلی	۱۸۴۵ء
گلِ رعنا	مولانا سید عبدالحیٔ	مطبع معارف اعظم گڑھ	۱۳۶۴ھ
گلزارِ اعظم	نواب محمد غوث خاں اعظم	مطبع سرکاری، مدراس	۱۲۷۲ھ
گلستانِ بیخزاں	حکیم قطب الدین باطن	مطبع نولکشور، لکھنؤ	۱۲۹۱ھ
گلستانِ سخن	مرزا قادر بخش صابر دہلوی	مطبع نولکشور، لکھنؤ	۱۸۸۲ء
گلشنِ بیخار	نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ	مطبع نولکشور، لکھنؤ	۱۹۱۰ء
گلشنِ ناز	منشی درگا پرشاد نادر دہلوی		
مآثرِ صدیقی	سید محمد علی حسن خان	مطبع نولکشور، لکھنؤ	۱۹۲۴ء
مجموعۂ نغز	میر قدرت اللہ قاسم	کریمی پریس، لاہور	۱۹۳۳ء
محبوب الزمن تذکرہ شعرائے دکن	محمد عبدالجبار خاں صوفی ملکاپوری	مطبع رحمانی، حیدر آباد	۱۳۲۹ھ
مخزنِ فصاحت	(دیوان فصیح الدین رنج طبیب)	مطبع ہاشمی، میرٹھ	۱۳۰۷ھ
مراۃ الحقایق	منشی برکت علی	مطبع عزیزی، رام پور	۱۹۰۲ء
مرقعِ ادب (۲)	مرتبہ صفدر مرزا پوری	مجتبائی پریس، لکھنؤ	۱۹۲۵ء
مرقعِ سخن	مرتبہ ادارہ ادبیات اردو	مکتبہ ابراہیمیہ مشین پریس، حیدر آباد دکن	۱۹۳۵-۱۹۳۹ء
مشاطۂ سخن (۱)	صفدر مرزا پوری	تھوڈسٹ پبلشنگ ہوس، لکھنؤ	۱۹۱۸ء
مشاطۂ سخن (۲)	صفدر مرزا پوری	گیلانی الیکٹرک پریس، لاہور	۱۹۲۸ء
مشرقی بنگال میں اردو	سید اقبال عظیم	کوہ نور الیکٹرک پریس، چاٹگام	۱۹۵۴ء
مشرقی پاکستان کے ادیب	مرتبہ حفیظ ہوشیارپوری	ناظر پرنٹنگ پریس، کراچی	۱۹۵۱ء
مضامینِ فرحت (۵)	میرزا فرحت اللہ بیگ	انتظامی پریس، حیدر آباد	

مقالاتِ حالی (۱)   مولانا الطاف حسین حالی   جامعہ پریس، دہلی   ۱۹۱۴ء
مقدمہ رو کد ملازمت الور   نواب نجف مردان علی خان رعنا   مطبع نولکشور، لکھنؤ   ۱۸۶۵ء
مکاتیبِ غالب   مرتبہ امتیاز علی خان عرشی   ناظم پریس، رامپور   ۱۹۴۹ء
میاں داد خاں سیاح اور اُن کا کلام۔ مرتبہ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی   اعجاز پرنٹنگ پریس، حیدر آباد   ۱۹۵۷ء

نادراتِ غالب   مرتبہ آفاق حسین آفاق   مشہور پریس، کراچی   ۱۹۴۹ء
نظمِ دلفروز   (دیوانِ امراؤ میرزا انور)   مطبع رفاہِ عام، لاہور   ۱۸۹۹ء
نگارستانِ سخن   سید نور الحسن خان   مطبع شاہجہانی، بھوپال   ۱۲۹۳
نقدِ غالب   ڈاکٹر مختار الدین احمد   دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی   ۱۹۵۶ء
نور ایمان   مولوی عبد السمیع بیدل رامپوری
نہالستانِ نثار   مولفہ محمد جمال الدین نور اکبر آبادی   آگرہ اخبار پریس، آگرہ   ۱۹۲۵ء

واقعاتِ دار الحکومت دہلی   مولوی بشیر الدین احمد   شمسی مشین پریس، آگرہ   ۱۹۱۹ء

ہنگامۂ دل آشوب   مطبع منشی سنت پرشاد، آرہ   ۱۸۶۷ء

یادگارِ ضیغم (قلمی)   محمد عبد اللہ خاں ضیغم   مملوکہ ادارۂ ادبیاتِ اردو۔ حیدر آباد (مخطوطہ ۵۶۴)
یادگارِ ضیغم   محمد عبد اللہ خاں ضیغم   مطبع قادری، حیدر آباد، دکن   ۱۳۰۳ھ
یادگارِ غالب   الطاف حسین حالی   مطبع مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۲۔ رسایل و جراید

آج کل   (ماہانہ، دہلی)۔ نومبر ۱۹۵۲ء؛ فروری ۱۹۵۵ء
ادیب   (ماہانہ، الہ آباد)۔ فروری و مارچ ۱۹۱۳ء

اُردو (سہ ماہی - دہلی)، جولائی ۱۹۴۴ء

اُردو (سہ ماہی - کراچی)، جولائی ۱۹۵۰ء؛ ۱۹۵۲ء؛ ۱۹۵۳ء

اُردو ادب (سہ ماہی - علی گڑھ) اکتوبر/دسمبر ۱۹۵۴ء

اُردوئے معلیٰ (ماہانہ، علی گڑھ) دسمبر ۱۹۱۲ء

اکمل الاخبار (ہفتہ وار - دہلی) - ۴: ۱۶ (۲۲ - اپریل ۱۸۶۹ء)؛ ۴: ۳۴ (۲۵ - اگست ۱۸۶۹ء) -

اودھ اخبار (روزانہ - لکھنؤ) - ۱۳/۱۷ جون ۱۸۷۹ء

پیامِ یار (ماہانہ گلدستہ - لکھنؤ) - دسمبر ۱۸۸۹ء

حیاتِ نو (ماہانہ - پانی پت) - ۱۹۳۴ء؛ ۱۹۳۵ء

زمانہ (ماہانہ - کانپور) - اکتوبر ۱۹۲۷ء؛ جولائی ۱۹۳۴ء؛ جنوری ۱۹۴۹ء

ساقی (ماہانہ - دہلی) - جنوری ۱۹۴۶ء

شاعر (ماہانہ - آگرہ) - آگرہ نمبر (جون/جولائی ۱۹۳۶ء) -

صلائے عام (ماہانہ - دہلی) - دسمبر ۱۹۲۹ء

کمال (ماہانہ - دہلی) - جنوری، اکتوبر، دسمبر ۱۹۱۲ء

ماتھر پترکا (ماہانہ انگریزی - آگرہ) - دسمبر ۱۹۲۵ء؛ جنوری، فروری، اپریل ۱۹۲۶ء

مذاقِ سخن (ماہانہ گلدستہ - دہلی) - مئی ۱۹۰۳ء

معارف (ماہانہ - اعظم گڑھ) - جون ۱۹۳۲ء؛ اپریل ۱۹۴۸ء؛ اپریل، ستمبر ۱۹۵۴ء -

معاصر (پٹنہ) (۲) و (۴)

نقوش (ماہانہ - لاہور) جون ۱۹۵۶ء -

نگار (ماہانہ لکھنؤ) جنوری/فروری ۱۹۴۱ء؛ اپریل ۱۹۵۳ء

نوائے ادب (سہ ماہی - بمبئی) - جولائی ۱۹۵۰ء

ہندستانی (سہ ماہی - الہ آباد) - ۱۹۳۵ء؛ ۱۹۳۷ء -